اردو مکتوب نگاری

(سرسید اور ان کے رفقاء کے خصوصی حوالے سے)

کلیم الٰہی امجد

شاداب تبسم

تحفہ اردو زبان وادب
کلیم الٰہی امجد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اردو مکتوب نگاری

(سرسید اوران کے رفقاء کے خصوصی حوالے سے)

ڈاکٹر شاداب تبسم

رابطہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

Urdu Maktoob Nigari
(Sir Syed Aur Unke Rofaqa Ke Khusoosi Hawale Se)
By
Shadab Tabassum
Rs. 400/-



تقسیم کار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com
maktabajamiadelhi@gmail.com

شاخیں

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔110006 011-23260668
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 022-23774857
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 0571-2706142
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 011-2698729525

ISBN No. : 978-93-82997-01-6

دسمبر 2012 تعداد 400 قیمت: -/400 روپے

نور پرنٹ ایجنسی، سوئیوالان، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

انتساب

استادِ محترم

پروفیسر خالد محمود صاحب

کے نام

جن کی شفقتوں نے مجھ نا چیز کو

علم و ادب کی دنیا میں کھڑا ہونے کا حوصلہ دیا

ترتیب

تعارف

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت مشرقی علوم کے عہد قدیم سے منسلک ہے۔ اس روایت کی ترقی یافتہ شکل ورقعات، فرامین، تمسک اور محضر ناموں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ انبیا، اولیا، صلحا اور شاہان عجم کے لکھے ہوئے نوشتے اور ان کے نام لکھے گئے خطوط، اس فن کی یادگار مثالیں ہیں۔ اس عہد کے بعد فاضل علما نے اس فن کو درجۂ کمال تک پہنچایا جس کے نمونے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے 'مکاتیب بنام شہنشاہ جہانگیر' وغیرہ۔ شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے 'مکتوبات دوصدی' اور خود اورنگ زیب عالم گیر کے 'رقعات عالمگیری' حد درجہ مشہور و معروف ہیں۔

شاہی درباروں اور امرا کی محفلوں نے اس صنف کو حیرت انگیز طور پر فروغ دیا۔ لکھنے کے لیے باقاعدہ ماہرین، منشی کے عہدہ پر مامور ہوا کرتے تھے۔ ایک زمانہ میں خطوط نویسی کی تعلیم دی جاتی تھی اور یہ علم باقاعدہ نصاب کا حصہ بھی تھا۔ بعد کے زمانے میں انحطاط کے سبب یہی لوگ کاتب کہے جانے لگے۔ اردو میں 'خطوط غالب'، 'انشائے مومن' اور 'کلیات مکاتیب اقبال' ایسے بے مثال مجموعے ہیں جن میں تاریخ، ادب، انشا، فلسفہ، سیاست، عمرانیات اور تصوف وغیرہ بے بہا علوم کے خزانے پنہاں ہیں۔ ان خطوط کے تحقیقی و تنقیدی مطالعے سے بڑی پیچیدہ اور گنجلک گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔

اقبال کے خطوط کے کئی مجموعے اقبال نامہ، مکتوبات اقبال، خطوط اقبال اور Letters to Jinah کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ خطوط مجموعی طور پر "کلیات مکاتیب اقبال" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اقبال کے خطوط پر الگ سے تحقیقی و تنقیدی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے ڈاکٹر شاداب تبسم کے اس مطالعہ میں یہ مکاتیب شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں تحقیقی کام کے لیے علمی عنوانات تفویض کیے گئے ہیں۔ یعنی سفرناموں، خود نوشتوں اور نثری نکات پر تحقیقی کام ہو چکے ہیں۔

مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر شاداب تبسم صاحب نے مکتوب نگاری کے موضوع کو اپنی تحقیق کا

موضوع بنایا۔ ان کا تعلق ہندوستان کے قدیم علمی شہر سنبھل اور جدید یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہے۔ گویا قدیم علوم کا یہ مطالعہ جدید نقطۂ نظر کے تقاضوں سے کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں شب تاریک میں قندیل رہبانی بن کر نمودار ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے عہد بلکہ بعد کے زمانے کو بھی متاثر کیا۔ ڈاکٹر شاداب تبسم کا ارادہ تھا کہ سرسید احمد خاں اور ان کے عہد کی مکتوب نگاری کا بالاستیعاب مطالعہ کریں جس سے اس کلاسکی دور کے تاریخی اور تحقیقی نتائج برآمد کیے جاسکیں لیکن مطالعہ کی وسعت اور موضوع کی ہمہ گیری نے اس کو اتنا وسیع و عریض بنا دیا کہ یہ تحقیقی مقالہ بڑی حد تک اردو میں نامہ نگاری کی تاریخ بن گیا ہے۔

ان کا اسلوب بیان شگفتہ اور طریق مطالعہ معروضی ہے۔ انھیں اپنے موضوع سے بے حد دلچسپی ہے اور تاریخ خطوط نویسی کی گہرآلود فضاؤں میں جا کر اس علم کے آغاز و ارتقا کا پتہ لگایا ہے۔ یہی نہیں انھوں نے اردو کے پہلے مکتوب نگار کا پتہ لگانے کی بھی سعی کی ہے۔ اس طرح یہ مطالعہ اردو مکتوب نگاری کے ابتدائی نقوش اور اس کے باقاعدہ ارتقا پر محیط ہے، جس میں مصنفہ کو خاصی دقت نظر سے کام لینا پڑا ہے۔ خطوط نگاری کے اس فن کے ابتدائی زمانے کے بعد انھوں نے کئی ابواب میں اس فن کے معراج کمال کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اس دور کے معروف اور نامور مکتوب نگاروں کا سرمایہ تحقیقی اور تنقیدی انداز نظر سے سامنے لایا جاسکے۔ ان میں سرسید اور ان کے نامور رفقا کے کارنامے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت امیر مینائی سے لے کر ابوالکلام آزاد تک کے مکتوب نگاروں کا تحقیقی تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

الغرض ڈاکٹر شاداب تبسم نے اردو مکتوب نگاری کے مطالعہ کا حق ادا کرنے کی بھرپور سعی کی ہے اور مکتوب نگاری کی تاریخ اور ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ہمارے خیال میں اردو مکتوب نگاری کا اس نوع کا جائزہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ لگتا ہے یہ وقیع مطالعہ اردو مکتوب نگاری کی ایک مبسوط تاریخ کا پیش خیمہ بنے گا، جس کے لیے ڈاکٹر شاداب تبسم اور ان کے نگراں پروفیسر خالد محمود صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

۱۴ دسمبر ۲۰۱۲ء

پروفیسر توقیر احمد خاں

صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۷

مقدمہ

اردو میں مکتوباتی ادب کی عمر تقریباً دو سو برس ہے۔ اردو مکتوب نگاری کے فن اور ارتقا کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس صنف میں ہر قسم کے مضامین سموئے جاسکتے ہیں اور موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ ادبی کارنامے ہیں جن میں زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ ان میں حال و مستقبل کے منصوبے، ماضی کی کسک، عہد و پیماں اور فکر و نظر کو اسیر کر لینے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ جذبوں کی وارفتگی اور رشتوں کی وابستگی سے لے کر تاریخی حقائق کی سنگینی اور معروضیت کی جھلکیاں اگر کسی صنف ادب میں تلاش کی جاسکتی ہیں تو وہ صرف "خطا نگاری" ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب، تاریخ، معاشرت، ثقافت، سیاست اور ادب زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی توجہ سے محروم رہا ہو۔ سرسید احمد خاں کی جماعت کے لوگوں میں شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد، وقار الملک، محسن الملک، محمد حسین آزاد، حالی، ذکاء اللہ، چراغ دہلوی، وحید الدین سلیم، شرر لکھنوی، شاد عظیم آبادی، سید احمد دہلوی اور سجاد حسین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض قلم کار ہر جگہ سرسید احمد خاں کی ہم نوائی کر رہے تھے اور بعض ادبی سطح پر ان سے اتفاق کرتے تھے۔ ان ادیبوں کے ذریعے اردو کو خاص طور سے اردو نثر کو نئی راہیں ملیں۔ نثر کی ہمہ جہت ترقی ہوئی۔ کئی تخلیقی اور غیر تخلیقی اصناف اردو ادب روشناس ہوگئیں جیسے تاریخ، سوانح، تنقید، صحافت، مضمون نگاری، لغات نویسی، مکتوبات اور علم لسانیات وغیرہ۔ ان اصناف میں صد ابہار تحریریں ظہور پذیر ہوئیں۔ نثر کے اس عہد زریں کی پشت پر سرسید احمد خاں کی ہمہ جہت شخصیت اور علی گڑھ سے شروع ہونے والی تعلیمی جدوجہد کا ہاتھ تھا جس کی گونج سارے ملک میں سنائی دینے لگی تھی۔ اس عہد کو سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور

سرسید احمد خاں کو جدید نثر کا امام کہا جاتا ہے۔ سرسید کے یہاں جو عقلیت، ارضیت اور حقیقت پسندی تھی اس نے اپنے عہد کے بیشتر لکھنے والوں کو متاثر کیا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے دوسری ادبی کاوشوں کی طرح اردو میں مکتوباتی ادب کو بھی فروغ دیا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کے خطوط میں عبارت آرائی کے بجائے سادگی، مقصدیت اور واقعیت ملتی ہے۔ خط کی اسی خوبی کی وجہ سے مجھے خطوط کے مطالعے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

مکتوب نگاری کے فن اور ارتقا سے متعلق کتابوں اور متفرق یا مضامین کے مطالعے کے بعد مجھے تشنگی کا احساس ہوا۔ اہل قلم نے خطوں پر سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کے خطوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ بلکہ سرسری نظر ڈالی ہے۔ مکتوب نگاری کے فن اور ارتقاء سے متعلق جو کتابیں میرے مطالعے میں آئیں ان میں شمس الرحمٰن کی مختصری تنقیدی کتاب "اردو خطوط"، رشیدہ خاتون کی کتاب "اردو خطوط نگاری کا ارتقاء" اور ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر کی کتاب "اردو خطوط نگاری: ایک مطالعہ" قابل ذکر ہیں۔ بیگم نیلوفر احمد نے "اردو میں خط نگاری کی روایت اور غالب" پر غالب کی مکتوب نگاری تک ہی محدود ہے۔ ڈاکٹر شمس بدایونی کی کتاب "مکتوباتی ادب" اور خط نگاری پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اردو مکتوباتی ادب کے وافر ذخیرے اور اس سے تصنیف و تالیفی موضوعات میں استفادہ کیے جانے کے باوجود ان کے ادبی و تاریخی ارتقا پر یا کچھ مکتوب نگاروں کی مکتوب نگاری پر چند مختصر مضامین اور خطوط کے مجموعوں پر لکھے گئے دیباچے یا مقدمات سامنے آتے ہیں جنھیں پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس احساس نے مجھے اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے آمادہ کیا۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول میں "اردو مکتوب نگاری" کے تحت لغات اور دیگر کتب کے حوالے سے خط کے معنی و مفہوم اور فن پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں متعدد اقوال اور علمائے ادب کے خیالات زیر بحث آئے ہیں۔ اس بات کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا ہے کہ خط ادب کی صنف ہے یا محض اسلوب۔ ساتھ میں خطوط کی خصوصیات، جمالیاتی محاسن و تخلیقی عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے۔

"مکتوب نگاری کی اہمیت اور افادیت" کے تحت خطوط کی ادبی، سوانحی اور تاریخی اہمیت اور مکتوب نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد اردو ادب میں مکتوب نگاری کے آغاز و ارتقا پر گفتگو کی گئی ہے۔ اردو کے قدیم ادبا و شعرا فارسی میں ہی خط لکھا کرتے تھے۔ انیسویں صدی میں جب فارسی کی کاروباری حیثیت کو زوال آیا تو اس کی جگہ اردو نے لے لی اور اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز فارسی کے زیر اثر ہوا۔ اردو کا پہلا مکتوب نگار کون ہے اس بات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

باب دوم "اردو میں مکتوب نگاری کے ابتدائی نقوش" سے متعلق ہے۔ اس میں مرزا احمد قتیل، غلام امام شہید، غلام غوث بے خبر، رجب علی بیگ سرور، واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات اور مرزا غالب کے خطوط پر تنقید و تبصرے کی کوشش کی گئی ہے۔ خطوط کے نمونے اور ان سے اخذ کردہ نتائج کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اردو میں مکتوب نگاری کے ابتدائی نقوش کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ زبان میں عہد بہ عہد جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا اندازہ ہو سکے۔ غالب کا تعلق اولین دور کے مکتوب نگاروں سے ہے لیکن مکتوب نگاری کی قدیم روش کو سرسید احمد خاں سے پہلے غالب نے ترک کر دیا اور خط کو نئے انداز اور نئی جہات سے آشنا کیا۔ لہٰذا غالب کے خطوط پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

باب سوم سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی مکتوب نگاری پر مشتمل ہے جو میرے مطالعے کا خاص موضوع ہے۔ دور سرسید کے مکتوبات میں اس عہد کی عہد ساز شخصیت کے اثرات کی وجہ سے مکتوبات میں مادیت، مقصدیت، حقیقت نگاری اور سادگی کے رجحان سامنے آرہے تھے جس میں بات انداز بیان کے لیے نہیں بلکہ ضرورت اور مقصد کے لیے کی جارہی تھی۔ اس میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا مولانا حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، وقار الملک، محسن الملک کے خطوط کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں میں دیگر مشاہیر ادب کے خطوط میں شامل زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مشاہیر ادب کے خطوط کی ضرورت اہمیت اور افادیت کو ایک زمانے سے آج تک تسلیم کیا جاتا رہا ہے جس کا ثبوت نہ صرف کثیر تعداد میں شائع ہونے والے مجموعہ ہائے مکاتیب ہیں بلکہ رسائل کے مکتوبات اور نمبر بھی ہیں مثلاً رسالہ نقوش کا خطوط نمبر اور مکاتیب نمبر، رسالہ آج کل کا خطوط نمبر، رسالہ ایشیا کا خطوط نمبر وغیرہ۔ اس میں اکبر الہ آبادی، داغ دہلوی، امیر مینائی، مہدی افادی، پریم چند، نیاز فتح پوری اور ابوالکلام آزاد کے خطوط کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے خطوط میں اس دور کے قابل ذکر رجحانات میں سیاسی، سماجی، حقیقت پسندانہ

اور رومانی رجحان بھی شامل ہیں۔

عبدالحق و اقبال کے مکاتیب کی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے خطوط اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ عبدالحق اور اقبال کے مکاتیب پر ایک طویل مقالہ لکھا جا سکتا ہے اور میں نے اپنے مقالہ کے حدود کو مدنظر رکھتے ہوئے عبدالحق و اقبال کو بحیثیت مکتوب نگار باب چہارم میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ باب پنجم میں دیگر مکتوب نگاروں کے مکاتیب کے علاوہ عبدالحق اور اقبال کے مکاتیب زیر بحث لائے گئے ہیں۔

باب پنجم اردو مکتوب نگاری کی تاریخی اور ادبی معنویت سے متعلق ہے۔ یہ حصہ سیاسی، سماجی، معاشرتی صورت حال اور علمی و ادبی استفسارات پر تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں متعلقہ موضوع پر چنی مکتوباتی شواہد کو گفتگو کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ کتابیات کے تحت ان کتب و رسائل کی مکمل فہرست درج ہے جن سے براہ راست یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا ہے۔

اردو میں مکاتیب کی کمی نہیں ہے۔ مکتوب نگاری ایک طویل موضوع ہے۔ کچھ مکتوب نگار ایسے ہیں جن کے مکاتیب کا وافر سرمایہ مختلف رسائل و جرائد میں موجود ہے لیکن ان کا تعارف بحیثیت مکتوب نگار نہیں ہوا تھا جب کہ ان کے مکاتیب ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ مجھے اس موضوع پر کام کرنے کے سلسلے میں سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ خطوط میں شامل بہت سے ایسے موضوعات، محرکات اور افراد ہوتے ہیں جن سے صرف اور صرف مکتوب الیہ ہی واقف ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مجموعہ ہائے مکاتیب مرتبین کے حوالے خاصے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں لیکن بیشتر مرتبین نے اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔ شخصیتوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی کے لیے مجھے بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ خطوط میں شامل جزئیات پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے لیے مختلف شخصیتوں سے متعلق معلومات حاصل کرنا ضروری تھا جو آسان نہیں ہوتا۔ کتاب میں صرف انھیں مکتوب نگاروں کو شامل کیا گیا ہے جن کے خطوط کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس لیے کہیں کہیں ایک ہی خط کو مختلف سیاق میں پیش کرنے سے یکسانیت و تکرار کا احساس بھی ہو سکتا ہے۔

شروع میں مجھے اس موضوع پر لکھنا آسان لگتا تھا۔ لیکن چوں کہ سرسید احمد خاں کے رفقا کی خط نگاری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر مواد کی فراہمی ایک وقت طلب مسئلہ بن کر

ابھری بلکہ شروع میں تو مایوسی ہی ہاتھ لگی کیوں کہ مکاتیب کے مجموعوں تک رسائی بہت مشکل ثابت ہوئی۔ بہر حال جہاں چاہ وہاں راہ کے مصداق آہستہ آہستہ مشکلات دور ہوتی گئیں کرم فرماؤں کا تعاون حاصل ہوتا گیا جنھوں نے نہ صرف مواد کی فراہمی میں مدد کی بلکہ ان ذرائع کی نشاندہی بھی کی جہاں سے مواد حاصل ہو سکتا تھا۔ میرے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا موضوع 'عہد سرسید میں اردو مکتوب نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' تھا، میں نے اس کی اشاعت کے وقت موضوع تبدیل کر کے 'اردو مکتوب نگاری' (سرسید اور ان کے رفقا کے خصوصی حوالے سے) کر دیا ہے۔

یہ مقالہ مشہور شاعر و مزاح نگار اور ناقد استاد مکرمی و محترمی پروفیسر خالد محمود صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ موصوف کی ذات گرامی کے لیے میں سراپا سپاس ہوں کیونکہ مقالہ کی تکمیل کے جملہ مراحل میں آپ نے میری رہنمائی فرمائی، قدم قدم پر آپ کی ہمت افزائی سے میرے حوصلے بلند رہے۔ کبھی سرزنش کرتے تو اکثر شفقت فرماتے۔ آپ کی محبت اور شفقت کا یہ عالم رہا ہے کہ اپنے اعزا اور رفقا کے درمیان راقمہ کا تعارف اپنی بہن، بیٹی اور گھر کے فرد کی حیثیت سے کرایا۔ اپنی گوں نا گوں مصروفیات کے باوجود مقالہ کی حرف بہ حرف اصلاح، مفید مشوروں اور رہنمائیوں میں اپنے بیش قیمتی لمحات صرف کیے۔ یہ امر بھی باعث فخر ہے کہ موصوف کی نگرانی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے والے افراد میں راقمہ کا نام سرفہرست ہے۔ میں اللہ تعالی سے دعا کرتی ہوں کہ ان کی سرپرستی مجھے ہمیشہ حاصل رہے۔

محترمہ پروفیسر تسنیم فاطمہ کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے ہمیشہ جلد از جلد کام مکمل کرنے کی تلقین کی اور میری رہنمائی فرمائی۔ ڈاکٹر نعمان خاں (پروفیسر این سی ای آر ٹی، ڈیپارٹمنٹ آف فلیگو یجز) نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی، اس کے لیے وہ بھی شکریے کے مستحق ہیں۔ استاد محترم وقار رومانی (سنبھل) کی تربیت اور حوصلہ افزائی میرے لیے مشعل راہ رہی جس کے لیے میں ان کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔

اپنے شوہر محمد نبی کے تعاون کا ذکر کرنا میرا فرض ہے کہ اگر ان کی ذہنی اور قلبی رفاقت، حوصلہ افزائی، اخلاقی تعاون اور رضامندی شامل نہ ہوتی تو یہاں تک پہنچنے کا تصور ہی محال تھا۔ ان کا نہ صرف اخلاقی تعاون رہا بلکہ مواد کی فراہمی میں میری بہت مدد فرمائی۔ میں اپنے بیٹوں فراز، ضمیر اور شیب کا شکریہ ادا کرنا اس لیے ضروری سمجھتی ہوں کہ ان کی فراہم کردہ نفسیاتی طمانیت کے بغیر بھی

میری اس کاوش کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا مشکل تھا۔ مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ میں نے ان کے حصے کا بہت سارا وقت مقالے کی تکمیل میں صرف کیا۔ میں اپنی خالہ محترمہ نشاط انجم صاحبہ اور ان کی بیٹی ڈاکٹر ارم کی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے مواد کی فراہمی میں میری ہر طرح اعانت فرمائی۔ میں ڈاکٹر امتیاز عالم صاحب اور محمد فاضل صاحب (سنبھل) کی بھی شکرگزار ہوں کہ جنھوں نے بروقت نادر مواد فراہم کیا۔

میں محترم جناب ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب صاحب (ریڈر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی بھی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا اور مواد کی فراہمی میں بھرپور تعاون بھی دیا۔ ڈاکٹر مطیع اللہ صاحب، رحمت النساء صاحبہ، ڈاکٹر عبد الحمید صاحب، ڈاکٹر محمد عزیز صاحب، ڈاکٹر خالد محشر صاحب، ڈاکٹر صفوان صفوی صاحب، محمد جلال صاحب، ابو ہریرہ صاحب، نوشیر بی بی صاحبہ اور صبا خانم صاحبہ ان سب کرم فرماؤں اور رفقا کا میں شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مقالہ کی تکمیل میں ان سب کا تعاون حاصل رہا۔

جن بزرگوں کی حوصلہ افزائی اور دعائیں شامل رہیں ان میں محترم ڈاکٹر شفیق الرحمن برق صاحب (ایم پی) اور محترم اعجاز حسین صاحب کے اسمائے گرامی ناقابل فراموش ہیں۔

میں پروفیسر توقیر احمد خاں صاحب صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی سپاس گزار ہوں کہ جنھوں نے گوں ناگوں مصروفیت کے باوجود مقالہ پر نظرِ ثانی میں وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے نوازا اور مجھے اس کی اشاعت کے لیے آمادہ کیا۔

اس مقالہ کی تیاری میں تمام کتب خانوں کے عملے کے تعاون کے لیے شکرگزار ہوں اور جن جن مصنفوں اور مقالہ نگاروں کے مقالوں سے استفادہ کیا ہے، ان سب کی صمیم قلب سے مشکور ہوں۔ اس مقالہ کی کمپوزنگ جناب محمد اسلام خان صاحب نے بہت خوش اسلوبی سے کی ہے، میں تہہ دل سے ان کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔

مقالہ کی تکمیل میں دراصل سب سے پہلے میری والدہ محترمہ شاہدہ بیگم کی دعائیں شامل رہیں جن کے بغیر میں کسی بھی علمی اور ادبی کاوش کا تصور نہیں کر سکتی۔

شاداب تبسم

باب اول

اُردو مکتوب نگاری

- مکتوب نگاری کا فن
- مکتوب نگاری کی اہمیت اور افادیت
- مکتوب نگاری کی تاریخ
- اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز و ارتقاء
- اردو کا پہلا مکتوب

مکتوب نگاری کا فن

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں صرف انسان کو ہی یہ صلاحیت حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اسی لئے اسے حیوان ناطق کہتے ہیں۔ اس کے خیالات کے اظہار کا وسیلہ زبان ہے اور چونکہ ہر علاقے کا وسیلۂ اظہار الگ ہوتا ہے اس لئے دنیا میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ زبانی اظہار کے علاوہ انسان کچھ علامتوں کے ذریعہ بھی اپنے خیالات دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔ اور دوسرے انہیں دیکھ کر یہ جان لیتے ہیں کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ یہ زبان کی تحریری شکل ہے۔ مختلف زبانوں میں حرفوں اور لفظوں کی سیکڑوں آوازوں کی طرح دنیا میں تحریر کی بھی مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں۔ تحریر کی مختلف شکلوں کے علاوہ تحریر کی کئی قسمیں بھی ہیں۔

دو اشخاص کے درمیان باہمی گفتگو ایک سماجی ضرورت ہے۔ اور جب یہ عمل رو برو ممکن نہ ہو تو ہم اپنے خیالات کا اظہار تحریر کے ذریعے یعنی لکھ کر کرتے ہیں۔ یہ تحریر خط کہلاتی ہے۔ خط نگاری تحریری شکل میں باتیں کرنا ہے۔ اس لئے خط کو عرف عام میں "آدھی ملاقات" بھی کہا جاتا ہے۔

"خط عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سطر یا تحریر کے ہیں۔"[1]

لیکن عربی میں یہ لفظ اصطلاحی طور پر "تحریر" کے معنی میں بھی اور مکتوب یا مراسلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔"[2]

'فیروز اللغات' میں لفظ 'خط' کے حسب ذیل معانی و مترادفات ملتے ہیں:

۱۔ تحریر ۲۔ لکیر، لائن ۳۔ نامہ، چٹھی ۴۔ انداز تحریر[3]

'فرہنگ آصفیہ' میں لفظ 'خط' کے معنی اس طرح ملتے ہیں:

۱۔ ع میں اسم مذکر، رسالہ اور مکتوب۔

۲۔ ف: میں نوشتہ، رقعہ اور نامہ وغیرہ۔

۳۔ دیگر زبانوں میں مثلاً ہندی، مراٹھی، گجراتی میں چٹھی، چٹری، Patram اور پنجابی میں چٹھ کہتے ہیں۔

۴۔ انگریزی میں (Letter) بمعنی خط ہوتا ہے۔

۵۔ علم ہندسہ میں خط بمعنی لکیر یا سطر کے ہوتا ہے۔

۶۔ جغرافیہ میں تقسیمی لکیر بمعنی خط استوا، خط سرطان وغیرہ بھی مستعمل ہیں۔

۷۔ عربی میں خط کی نسبت ایک ضرب المثل مشہور ہے۔ "القلم المکتوب بنصف الملاقات" یعنی خط آدھی ملاقات ہے۔

۸۔ اسے ادب لطیف کا فن بھی کہتے ہیں۔[4]

خط میں مکتوب نگار (خط لکھنے والا) اپنے خیالات و جذبات کو قلم بند کر کے مکتوب الیہ (جسے خط لکھا گیا ہو) کو بھیجتا ہے۔ ادب میں خط نگاری باقاعدہ ایک صنف ہے۔ جس کے حدود و قواعد مقرر ہیں۔ جس کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ احساسات، جذبات اور خیالات کو قلم کی مدد سے کاغذ پر اتارنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کا عمل خط نگاری کہلایا۔ اس عمل میں پیغام رسانی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ محض ذاتی تسکین کے لئے وقت گذاری کی خاطر کچھ لکھنا اور اسے اپنے پاس ہی رکھ لینا خط نگاری نہیں ہے۔ خط نگاری دراصل ترسیل خیالات و اظہار کا بہترین وسیلہ ہے۔

خط نگاری نثر نگاری کی ایک مستقل صنف ہے۔ اسے ادب لطیف کا ایک حصہ بھی کہتے ہیں۔ خطوط نہ صرف کاتب و مکتوب الیہ کے رازہائے دروں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں بلکہ خطوط کے ذریعہ شخصیت و کردار کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ قول و عمل کی نشاندہی خطوط ہی کرتے ہیں۔ خط نگاری کو باضابطہ ادبی صنف کا درجہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق اختلافات ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ہے کہ:

"خط نگاری تو بذات خود ایک بڑا فن ہے اور اس میں کامیاب وہی شخص ہو سکتا ہے جو قدرت کی طرف سے اس فن کا فیضان لے کر آیا ہو۔ خط نگاری کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اچھی خط نگاری ایک خاص شخصی ماحول

پر بھی موقوف ہے۔ خط نگاری کے فن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ سب سے آسان فن ہے اور اس شخص کے لئے سہل الحصول جو اس کا قصد کرے۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی آسان ترین فن نازک ترین فن بھی ہے۔ کیوں کہ اس میں معیار تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔ خط نگاری ادب کے دوسرے شعبوں کے برعکس اصلاً ادب نہیں بلکہ محض ایک ضرورتی اور افادی عمل ہے۔ خط نگاری خود ادب نہیں مگر جب اس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد اور خاص فضا میسر آ جائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔ مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے۔ یہ شیشہ گری ہے۔ اس سے بھی نازک تر اور پھر آئینہ ساز ہو کر بھی کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو سچ مچ ایسا آئینہ ڈھال سکیں جس کے جلوے خود تماشائے نگاہ بن جائیں۔" [5]

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خط نگاری کو صنف ادب بنانے کا کام فن شیشہ گری سے کم نہیں ہے۔ جو ایک آئینہ ساز کو تمام زندگی محنت کے بعد بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔ ایک فنکار ایک ہی وقت میں نقاد، افسانہ نگار، شاعر، ڈرامہ نگار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک اچھا مکتوب نگار بھی ہو۔ غلام امام شہید اور غلام غوث بے خبر سے لے کر اب تک بہت کم مکتوب نگار ایسے ہیں جن کے خطوط کو ادبی حیثیت حاصل ہے۔ مکتوب نگاری کو ادبی صنف کا درجہ دینے کے لئے اس کے اصول وضوابط کا تعین کرنا ہوگا۔ کیونکہ ادب زندگی کے دلنشین اظہار کا نام ہے۔ اس لئے زندگی کے تمام معاملات و مسائل ادب کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان میں جذبات، احساسات، مشاہدات و تجربات اور خیالات کی رنگینی اس نوعیت کی ہونی چاہئے کہ وہ جمالیاتی تسکین کا سبب بن سکے۔

خط کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے کی ہے۔ عبدالحق کی رائے ہے کہ:

"خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت و خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔" [6]

پروفیسر آل احمد سرور کے خیال میں:

"خط کیا ہے؟ بقول غالب کے جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے۔ اسے دور کے لوگوں تک پہنچانا، گفتگو تحریر کا رنگ لے کر مراسلے کا جامہ پہنتا ہے۔ اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے۔ جس میں بے تکلفی بے ساختگی خلوص فطری رنگ انفرادیت ذاتی تاثرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ وہ خط جن میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشا پردازی کی شان تکلف کا اظہار۔ خطابت کا جوش دکھایا جائے خط نہیں مضمون ہے۔" [7]

مہدی افادی خط کے متعلق لکھتے ہیں:

"خط لٹریچر کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا۔ یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئے گی۔ اس لئے سرسری اظہار خیال بھی اگر اس پایہ کا ہو کہ انشا پردازی اس کی بلائیں لیتی ہو تو یہ بھی کمال کا ایک ایسا رخ ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔" [8]

خلیق انجم لکھتے ہیں:

"مکتوب نگاری" فنون لطیفہ کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک باقاعدہ بلکہ اور فنون کے مقابلے میں زیادہ لطیف اور شائستہ فن ہے اس لئے بعض اہل قلم نے اسے لطیف ترین فن کہا ہے۔" [9]

خورشید السلام کی رائے ہے:

"خط حسن اتفاق کا نام ہے اور حسن اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔ اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں۔ خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنے جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں دنیا کا لطف ہے۔ زندگی میں لمحے قیمتی ہوتے ہیں۔ ان لمحوں کو زندگی کے دامن سے چرا لینا محفوظ رکھنا اور رازداروں میں تقسیم کر دینا یہی حسن عمل ہے یہی تخلیق ہے اور یہی نجات ہے۔ ہاں تو وہ خطوط جن میں استدلال کا زور ہو فلسفہ پر باقاعدہ بحثیں ہوں خطوط نہیں ہوتے۔" [10]

مکتوب نگاری کا فن آسان ترین فن ہے اس کے لئے کسی طرح کی مہارت حاصل کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی استاد سے مشورہ لینے کی خط کی صنف بہت حد تک فنی جکڑ بندیوں سے آزاد ہے۔ اس میں ہر بات کی گنجائش ہے۔ خطوط کے دائرے میں وہ تمام موضوعات سمو ئے جا سکتے ہیں جن کا تعلق انسان کے ذہنی ارتقاء اور زندگی کے مختلف گوشوں سے ہوتا ہے۔ اس میں ہجر کی داستان، وصل کا مژدہ، مصائب و آلام کا ذکر، ناکامیوں پر اظہار غم، کامیابیوں پر اظہار مسرت، نفرت، خلوص غرض یہ کہ ہر بات کی ترجمانی کی جا سکتی ہے بلکہ خطوط کے ذریعہ ادب اور سائنس کے ہر شعبہ پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ خط میں کوئی مرکزیت نہیں ہوتی باتیں بدلتی رہتی ہیں۔ لہجے میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ گفتگو میں نرمی اور گرمی آتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ خط نگاری کے اصول یا شرائط کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> "خط نگاری اصلاً فن لطیف نہ ہو تب بھی بعض اوقات فن کے درجۂ اعلیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے خط نگاری کے فن پر نظر ڈالی جائے تو اچھی اور باذوق خط نگاری کی کچھ خاص شرائط سامنے آتی ہیں۔"[11]

خط نگاری کے اصول و ضوابط نہیں بنائے گئے۔ لہٰذا خط کی صنف فنی جکڑ بندیوں سے بہت حد تک آزاد ہے۔ تجزیہ نفس کی زبان میں Free Association غیر آہنگ تلازم کی صنف ہے۔ اس میں ہر بات کی گنجائش ہے۔ خط کے لئے نہ موضوع کی قید ہے اور نہ اس کی ہیئت کے لئے ضابطے متعین ہیں۔ لیکن ادبی خطوط اپنی داخلی کیفیات اور خصوصیات کے لحاظ سے دیگر اصناف ادب سے ممتاز ہیں۔ اور ان کیفیات کو خطوط میں اجاگر کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس لحاظ سے دیگر اصناف ادب کی طرح خطوط کو بھی ایک صنف کا درجہ حاصل ہے اور اس کے بھی کچھ اصول و ضوابط بن گئے ہیں۔

پروفیسر خورشید الاسلام کا خیال ہے کہ خط لکھنا ایک فن ہے اور اچھی زندگی بسر کرنا بھی ایک فن ہے لیکن اس میں کمال حاصل کرنے کے لئے کسی فن کی ضرورت نہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنے کے لئے کچھ اصول و ضابطے ہیں لیکن محبت کرنے کے لئے اصول و ضوابط کی ضرورت نہیں۔ خط نگاری کے اصول سے متعلق خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

"جس طرح بات چیت کے لئے کسی موضوع کا نہ ہونا اس کے ہونے سے زیادہ

دلچسپ ہے، اسی طرح خط میں نہ اصول کی ضرورت ہے نہ خیال کی اور نہ موضوع کی۔ زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے۔ خط اپنی باتیں خود پیدا کر لیتا ہے۔ زندگی نہ آغاز نہ انجام بس ایک بہاؤ ہے، ایک روانی ہے، ایک اٹھان ہے۔ خط میں نہ ابتدا نہ انتہا، نہ وساطت، تخیل نہ تشبیب نہ دعا ئیں۔ بس گریز ہی گریز ہے اور ہزاروں سال کے تجربے نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ یہ ہے کہ گریز ہی میں زندگی کا حسن ہے کیونکہ زندگی خود ایک گریز ہے۔"[12]

ڈاکٹر خلیق انجم رقمطراز ہیں:

> "مکتوب نگاری کا کوئی اصول اور ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا لیکن کسی مکتوب کے لکھے جانے کا کوئی محرک نہ ہو یا وہ کسی خط کے جواب میں نہ لکھا گیا ہو تو اسے مکتوب کہنا بہت مشکل ہے۔ ہر اس تحریر کو جو خط کی فارم میں لکھی گئی ہو مکتوباتی ادب میں جگہ دینا مناسب نہیں، کیونکہ بعض اوقات اس فارم میں انشاء پردازی کے جوہر بھی دکھائے جاتے ہیں یا ان تحریروں کا محرک کوئی اور مقصد ہوتا ہے۔"[13]

یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا لکھا ہوا خط اہم ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ہر عظیم مکتوب نگار کے خطوط ایک ہی درجے کے ہوں یہی وجہ ہے کہ بہت کم مکتوب نگار ایسے ہیں جن کے خطوط کو مکاتیبی ادب میں جگہ حاصل ہو پائی ہے۔

خط دو قسم کے ہوتے ہیں ایک نجی یا ذاتی دوسرے کاروباری یا دفتری خط۔ خط لکھنا آسان ضرور ہے لیکن جو سرکاری دفتری یا کاروباری خطوط ہوتے ہیں ان کا ڈھانچہ متعین ہوتا ہے۔ اس طرح کے خطوط آزادی کے ساتھ نہیں لکھے جا سکتے یعنی مخصوص القاب و آداب ابتدائیہ اور مطلب و متن کے لئے مخصوص مروجہ الفاظ اور انداز بیان کے بندھن سے بندھے ہوتے ہیں اور مقصد کو جامع اور مختصر جملوں میں ادا کرنا ہوتا ہے۔

نجی یا ذاتی خط لکھنا آسان ہے لیکن اس کے لئے بھی کچھ باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ مثلاً القاب و آداب ابتدائیہ مطلب و متن اور خاتمہ لیکن ذیلی عنوان کے تحت مکتوب نگار جس طرح

جا ہے اپنے خیالات کا اظہار بے تکلف کر سکتا ہے۔

مکتوب نگاری پر جب ایک ادبی صنف کی حیثیت سے گفتگو کی جاتی ہے تو اس کی ہیئت کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کیوں کہ اصناف ادب کی درجہ بندی میں دو چیزیں پیش نظر رہتی ہیں۔ موضوع اور ہیئت یعنی کیا کہا گیا ہے اور کس طرح کہا گیا ہے۔ کہیں موضوع کو اہمیت دی جاتی ہے کہیں ہیئت پر زور دیا جاتا ہے۔ خط لکھتے وقت خط نگار کو موضوع اور ہیئت دونوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً بعض شعراء نے منظوم خطوط بھی لکھے ہیں لیکن مکتوب نگاری کی روایت زیادہ تر نثری مکاتیب سے ہی وابستہ رہی ہے۔

انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی جوں کی توں ممکن نہیں البتہ تشریح یا آزاد ترجمانی ہو سکتی ہے۔ جو کبھی کبھی مبالغہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا اپنے جذبات و احساسات کو بہت سادگی کے ساتھ قلمبند کرنا چاہیے کیونکہ خط مکتوب نگار کی سیرت اور شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ خط میں مکتوب نگار بے نقاب اور بے حجاب نظر آتا ہے۔ خطوط کی سادگی سے متعلق پروفیسر صغرا مہدی لکھتی ہیں:

"خطوں میں ایک انسان دوسرے انسان سے زبان قلم سے باتیں کرتا ہے۔ دنیا بھر کی باتیں، اپنی باتیں اس کی باتیں، ادبی باتیں دل کی باتیں۔ یہ باتیں اگر تصنع اور بناوٹ بھری نہ ہوں تو وہ سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔"[14]

ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر رقمطراز ہیں:

"ادب میں انہیں خطوط کو صنف کی حیثیت سے قبول کیا گیا ہے۔ جن میں فطری گفتگو کا انداز اپنے تمام دلچسپ پہلوؤں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ یعنی خط لکھنے والا اپنے مخاطب کے ساتھ باتیں کرتا ہوا نظر آئے اور یہ تبھی ممکن ہے جب خط میں غیر ضروری تصنع و بناوٹ کو دخل نہ ہو۔"[15]

خط کی بنیادی صفت اس کا اختصار ہے۔ اس کی طوالت کو تنقیدی نقطۂ نظر سے عیب سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ خط نگاری اپنے ادبی حسن کے لحاظ سے ایک نہایت ہی نازک فن ہے جہاں غیر ضروری تکلف اور بناوٹ کی گنجائش نہیں۔ خط میں جو کچھ بھی تحریر کیا جائے وہ بے ساختہ اور

برجستہ ہونا چاہیے۔ اس لئے خط کے لئے کہا جاتا ہے خط لکھا جاتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ خط کچھ محاسن بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں کیونکہ ان میں رازداری ہوتی ہے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ راز جاننے کا اشتیاق رکھتا ہے۔ خط جز میں کل کا نظارہ کرانے کا نام ہے۔ خط اگر شائع کرانے کے خیال سے نہ لکھا جائے تو مکتوب نگار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

اچھے خط کی خوبی اس کی لطافت بھی ہے۔ خط کا موضوع چاہے جو بھی ہو لیکن اچھے مکتوب نگار کے یہاں تمام باتیں کچھ ایسے انداز میں بیان ہوتی ہیں کہ ایک لطیف کیفیت کا احساس پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ خط میں محبت و انس کی فضا کا ہونا بھی ضروری ہے۔

خوش خطی بھی ایک ایسا حسن ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر مکتوب خوش خط لکھا جائے تو پڑھنے میں آسانی ہوگی اور قاری پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔

مکتوب نگاری کے لئے کوئی اسلوب مقرر نہیں ہے۔ عام طور پر ذاتی خط کی زبان سلیس اور اسلوب بالکل سادہ ہوتا ہے۔ اسلوب کے علاوہ املا انشاء تاریخ، سنہ، مقام تحریر، خط نگار کا نام لکھنے کا طریقہ۔ یعنی اپنے نام سے قبل کا لفظ جو ہر شخص کے ذہن کا غماز ہوتا ہے۔ مثلاً خاکسار، حقیر، فقیر، مخلص، دعا کا طالب، خیر خواہ، دعا گو آپ کا تمہارا، خیر طلب وغیرہ۔ ان سب باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط نگار کو بلاغت کے اصولوں سے کس حد تک واقفیت ہے اور زبان پر کتنی قدرت حاصل ہے۔

خط کے مضامین وہی ہیں جو انسان کی زندگی کے موضوعات ہیں۔ خط لکھتے وقت باتیں لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہیں اس لئے لکھتے وقت اسلوب اور موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ لیکن موضوع اور اسلوب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کچھ باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے جس سے خط قاری کی دلچسپی کا باعث بن سکے۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

"مکتوب نگاری کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اسلوب تحریر، الفاظ کا انتخاب جملوں کی ساخت سب کا موضوع کے ساتھ تعلق ہو۔ ایک موضوع ایسا ہے۔ جس کا مقصد قارئین میں انبساط پیدا کرتا ہے۔ دوسرا موضوع ایسا ہو سکتا ہے جس کا مقصد قارئین کے احساسات کو جھنجھوڑنا ہے۔ دونوں موضوع مختلف اسالیب

بیان کے متقاضی ہیں۔ مکتوب کی پچاس فی صد کامیابی کا انحصار اس کے اسلوب بیان پر ہوتا ہے۔"[۱۹]

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خط نگاری کے کوئی مقررہ اصول وضوابط نہیں ہیں۔ نہ کوئی خاص موضوع اور نہ ہی کوئی ہیئت متعین کی جاسکتی ہے۔ بلکہ شخصیتوں کے رجحانات مزاج معیار و میلان کے مطابق ان کی خصوصیات و ہیئت میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جو خط کے اسلوب پر اپنے اثرات مرتب کراتے رہتے ہیں۔ اس طرح مکتوبات اپنی مختلف اشکال اور گوناگوں صورتوں میں ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔



مکتوب نگاری کی اہمیت اور افادیت

قدیم زمانے میں جب لوگ داستانیں سناتے اپنی بہادری کے کارنامے بیان کرتے قصے کہانیاں کہتے تو ان کا بیان جذباتی اور مبالغہ آمیز ہوتا تھا۔ لیکن اس زبان وبیان کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا تھا کیونکہ جو بات زبانی کہی جائے اس میں فکر کا عنصر بہت کم ہوتا ہے یعنی وہ بات زیادہ سوچی سمجھی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جو بات لکھی جاتی ہے تو لکھنے والے کا دماغ فوری طور پر اس خیال کی طرف مرکوز ہو جاتا ہے۔ لکھنے والا اس وقت اچھی طرح سوچ لیتا ہے کہ بات لکھنے کے لائق ہے یا نہیں۔ جو بات لکھی جاتی ہے وہ بالکل صاف جامع اور واضح ہوتی ہے کیونکہ لکھتے وقت انسان کا ذہن زیادہ یکسوئی سے کام کرتا ہے۔ اور وہ اس وقت چند ذہنی تجربوں سے گذرتا ہے۔ اس لئے جو بھی خیال لکھا جاتا ہے اس میں گہرائی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ یہی بات مکتوب نگاری پر بھی صادق آتی ہے۔ کیونکہ موجودہ عہد کی عدیم الفرصتی اور اطلاعات و مواصلاتی انقلاب کے نتیجے میں روابط کی جو آسان اور عمدہ سہولتیں فراہم ہو رہی ہیں اس سے خطوط نویسی کی روایت پر بہت حق اثر پڑا ہے۔ خاص طور سے ذاتی نوعیت کی خطوط نویسی پر۔ حالانکہ ٹیلی فون پر کی گئی گفتگو کے مقابلے میں اگر بات کو لکھ کر کہا جائے تو اس تحریر میں خیال زیادہ گہرا اور رچا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ٹیلی فون اور اب موبائل کے عام ہو جانے کی وجہ سے خط لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

خطوط نویسی کی ابتدا سے اب تک دنیا کی نہ جانے کتنی زبانوں میں خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہوں گے۔ آج بھی مجموعوں کے علاوہ اخبارات اور رسائل میں خطوط شائع ہوتے رہتے ہیں اور عوام میں تعلیمی بیداری کی وجہ سے ان کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ قارئین کے لئے یہی بات خطوط نویسی کی اہمیت اور مقبولیت اور افادیت کا ثبوت ہے۔

مکتوبات زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں مکتوباتی ادب تاریخ نثر کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کا دائرہ کار نثر سے متصل بھی ہے اور الگ بھی۔ انسان کی فطرت میں تجسس ہے وہ رازوں کو جاننے کا اشتیاق رکھتا ہے اس وجہ سے ادب کی وہ اصناف جن کے ذریعہ ہم کسی کی شخصیت کے تمام خط و خال دیکھ سکیں ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہیں گے۔ نجی خطوط اور خود نوشت سوانح عمری کے ذریعہ ہم مصنف کی روز مرہ کی زندگی اس کے جذبات و احساسات، اعمال و اشغال کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ اس لئے اچھے خطوط اور اچھی خود نوشت وہی کہی جائیگی جس میں زندہ شخصیت پورے طور پر جلوہ گر ہو۔

ڈاکٹر شجاعت علی خطوط کی گوناگوں اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"فنکار کی شخصیت جس طرح ان کے خطوط میں بے نقاب ہوجاتی ہے کسی اور صنف ادب میں ممکن نہیں۔ خطوط اس کی شخصیت کا آئینہ بھی ہوتے ہیں اور ایکسرے (Exray) بھی۔ بلکہ جن باتوں کو آئینہ اور ایکسرے پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں خطوط ان کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ آئینہ زیادہ سے زیادہ ظاہری شکل و صورت کو پیش کر دیتا یا ایکسرے اندرونی ساخت کا۔ لیکن جذبات و احساسات و شمائل، خصائل اور اسی قسم کی دوسری خصوصیات کی عکاسی ان کے بس کی بات نہیں۔ خطوط میں انسان کی ظاہری اور باطنی تمام باتوں کا عکس آجاتا ہے۔ اس لئے خطوط کو ادب العالیہ میں سب سے بہتر تسلیم کیا جاتا ہے۔"

اسی طرح عندلیب شادانی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی کی شخصیت کا عکس دیکھنا ہو تو ان کے خطوط کے آئینے میں دیکھنا چاہیے بلکہ آئینے کے بجائے انہیں "ایکس رے" سے تشبیہ دیا گیا ہے اور سچ پوچھئے تو یہ تشبیہ بھی ناقص ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "ایکس رے" کی مدد سے ان چیزوں کا بھی فوٹو لیا جاسکتا ہے۔ جو جسم کے صندوق میں بند ہوتی ہیں اور جنہیں ہم اس صندوق کو کھولے بغیر نہیں دیکھ سکتے مگر یہ پرائیویٹ خطوں کے "ایکس رے" تو لکھنے والے کے ان خیالات جذبات اور احساسات کی بھی تصویر کھینچ

دیتے ہیں جو اس کی تصنیفوں میں بھی کہیں نہیں ملتے۔ یہاں تکلف کے سارے حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ اور حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے"۔

کسی شخص کی تصنیفات اور تقریروں سے زیادہ اس کے خطوط اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ خطوط جو بے تکلف ہوتے ہیں وہاں مصلحت کی دراندازی اور عاقلانہ حسن و احتیاط نہ ہو تو اس میں حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ خطوط اصلی اخلاق کا آئینہ ہونے کے ساتھ ایک قابل غور خود نوشت سوانح عمری کا کام بھی دیتے ہیں۔ جو ارباب بصیرت کے تحقیق سبق اور اس عہد کی تاریخی معلومات اور نتائج کے لئے مستند ذخیرہ ہوتے ہیں۔ بقول نیر مسعود:

"وہ خطوط جن کی تحریر کو زمانہ دراز گذر چکا ہو تاریخی لحاظ سے بھی بہت اہم ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کی مدد سے ہم زمانہ کے مختلف حالات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ تاریخی تصنیفات اور ایک حد تک ادبی تخلیقات سے بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن ان سے فراہم ہونے والی معلومات میں وہ بے ساختگی نہیں ہوتی جو خطوط کا حصہ ہیں"۔

ادب کی وہ اصناف جن کے ذریعے انکشاف ذات یا جن کے ذریعے ہم کسی شخص کے پورے خط و خال دیکھ سکیں ہمیشہ دلچسپی کے باعث رہے ہیں۔ خود نوشت سوانح عمری، ڈائری یا خطوط کے ذریعے ہم مصنف کی روز مرہ کی زندگی اس کے جذبات و احساسات اس کے اعمال و اشغال کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ خطوط سوانح نگاری کے ساتھ فن تاریخ نویسی کے بھی بہترین ماخذ ہوتے ہیں۔ خلیق انجم خطوط کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مکتوب نگاری شخصی چیز ہے جس میں مکتوب نگار کی آواز ابھرتی ہے۔ سوانح نگاری کے بہترین ماخذ خطوط ہیں۔ فنکار کے خاندانی حالات اور اس کے عقائد و نظریات کا پورا علم اس کے خطوط سے ہوتا ہے۔ فن تاریخ نویسی کے لیے بھی مکتوب نگاری سود مند ہے۔"

کسی بھی انسان کی گفتگو اس کی شائستگی کی علامت ہوتی ہے۔ لیکن شائستگی اور تہذیب کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کو خط نگاری کا سلیقہ کہاں تک آتا ہے۔ اسلامی تہذیب نے اپنے دور

میں مکاتبت و مراسلت کو اس درجہ اہمیت دی کہ جو شخص خط نگاری کے آداب و رسوم سے زیادہ واقف ہوتا وہ سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں کا مستحق قرار پاتا تھا کیونکہ اس کو شائستہ ترین آدمی سمجھا جاتا تھا۔ خطوط کی سیاسی یا دفتری اہمیت کے ساتھ ساتھ عام خط نگاری کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید عبداللہ نے لکھا ہے:

> ''یہ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا جسے کبھی خط لکھنے یا لکھوانے کی ضرورت پیش نہ آئی ہو۔ خط سے بڑھ کر کوئی ادارہ جمہوری یا بنیادی طور پر اجتماعی نہیں ہو سکتا۔ اس ادارے کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ یہ ایک عام کاروباری بیوپاری تحریر سے لے کر ادب عالیہ کے رتبے تک پہنچ سکتا ہے۔''[۲۱]

آگے لکھتے ہیں:

> ''عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی انسان کی گفتگو اس کی شائستگی کی علامت ہوتی ہے اور یہ سچ بھی ہے، مگر اس سے بھی بڑی علامت کسی کی شائستگی اور تہذیب کی یہ ہے کہ اس کو خط نگاری کا سلیقہ کہاں تک ہے''۔[۲۲]

خط میں لکھی گئی چھوٹی چھوٹی باتیں، جذبات کا اظہار احساسات کی گہرائی اور خلوص کا مظہر ہوتی ہیں۔ اور مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے آپسی تعلقات کی غمازی کرتی ہیں۔ اس کو پڑھ کر انسان کے دل میں جھانک سکتے ہیں اور ان کی زندگی میں حصہ لینے کی مسرت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کے دکھ میں دکھی ہو سکتے ہیں اور ان کی فکریں اور پریشانیاں ہمارے دل میں کسک پیدا کر سکتی ہیں۔

جہاں تک نجی یا ذاتی خطوط کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ذاتی خطوط عموماً لکھنے والے کی شخصیت اور اس کے ذاتی عقائد و خیالات کو سمجھنے میں ہر چیز سے زیادہ مددگار ہوتے ہیں۔ نجی خطوط کی حیثیت ''آپ بیتی'' کی سی ہوتی ہے۔ اس لئے ہر شخص انہیں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ خطوط کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ پڑھنے والا لکھنے والے کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ ایک بلند پایہ مصنف اپنی دوسری تصانیف میں عام لوگوں

کی سطح سے بہت بلندی پر پہنچ جاتا ہے مگر خطوط میں وہ اتنا نیچے اتر آتا ہے کہ قاری اسے اپنی سطح پر محسوس کرتے ہیں۔ پرائیویٹ یا ذاتی خطوط سے متعلق عندلیب شادانی لکھتے ہیں:

> ''پرائیویٹ خطوط میں مصلحتوں کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ اور قلم کی زبان صحیح معنوں میں دل کی ترجمان بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر علامہ شبلی نعمانی کے وہ خطوط پیش کئے جا سکتے ہیں جو انھوں نے زہرہ بیگم صاحبہ اور عطیہ فیضی کے نام تحریر فرمائے۔ ان خطوط میں موصوف نے تعلیم نسواں، پردہ، موسیقی اور بعض دوسرے معاشرتی مسائل کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ان کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتے اور اس کی وجہ پبلک لائف کی مجبوریاں اور مصلحتیں ہیں۔''[۲۳]

پبلک لائف یعنی عوامی زندگی کی مصلحتیں اور مجبوریاں مصنف کے خیالات و عقائد کو عام طور پر دل سے زبان پر آنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اور ان کی خانگی زندگی کے معمولات اپنے گھر کی چہار دیواری یا خاص دوستوں کی صحبتوں تک محدود رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذاتی خطوط میں وہ مجبوریاں اور مصلحتیں عیاں ہو جاتی ہیں۔ جو قدرتی طور پر پڑھنے والے کی دلچسپی کا سبب بن جاتی ہیں۔ اس لئے خطوط کی افادی حیثیت سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔

ایک مورخ کے لئے خطوط بہت سودمند ہیں کیونکہ ان سے تاریخ کی ترتیب و تدوین میں بہت مدد ملتی ہے۔ خطوط کبھی رپورتاژ کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیتے ہیں کبھی روزنامچے کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ خطوط کے ذریعہ حادثات و واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی اور خطوط کہانی کا لطف بھی پیدا کرتے ہیں۔ فن کار اپنے پیش رو فن کاروں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟ اپنے ہمعصروں کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ اپنے فن اور خود اپنی ذات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے؟ یہ سب وضاحت کے ساتھ خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔

خطوط کتنے ہی ذاتی کیوں نہ ہوں، اور موضوع کے اعتبار سے کتنے ہی محدود کیوں نہ ہوں ایک اچھا مکتوب نگار کا قلم مکاتیب میں ایسی رنگینی پیدا کر دیتا ہے کہ مکتوب نگار داستان پڑھنے والے کی داستان بن جاتی ہے۔ کامیاب خطوط میں ہر عہد اور کرۂ ارض کے حصے کے لوگوں کے

ذوق کی تشنگی کا سامان مل جاتا ہے۔ اچھا خط زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ہر عہد کے انسان کا تعلق اپنے عہد کے تخلیقی دور سے قائم کرتا ہے۔ تاریخی واقعات جاننے کے لئے کئی ماخذ ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی جو تصویر غالبؔ نے پیش کی تھی اس کو سمجھنے کے لئے ان لوگوں کا رد عمل کیا تھا جو اس انقلاب کے ذمہ دار تھے وہ لوگ کیا سوچتے تھے جن پر ان واقعات کا اثر ہوا تھا ایک شاعر کے ذہن وقلب کو دلی کی تباہی و بربادی نے کس طرح متاثر کیا تھا۔ اگر یہ معلوم کرنا ہے تو کسی تاریخی کتاب کا نہیں بلکہ غالبؔ کے خطوط کا ہی مطالعہ کرنا ہوگا۔

۱۸۵۷ء کے واقعۂ انقلاب سے ملک کی اجتماعی زندگی بری طرح متاثر ہوئی۔ انقلاب کے واقعات اسباب اور اثرات تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ غالبؔ ایک مجلس پسند انسان تھے اور واقعۂ انقلاب نے ان کی مجلسی زندگی کو درہم برہم کر دیا تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو خاص طور سے نشانۂ انتقام بنایا اور انہیں شہر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ غالبؔ کے بعض خطوط میں ان واقعات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ان خطوط سے چند سطور پیش خدمت ہیں۔

"میں جس شہر میں ہوں اس کا نام دلی ہے۔ اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔" ۲۲

"مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا، ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا۔"

۲۳

غالب کے خطوط میں بیان کردہ حالات و واقعات کی تصدیق دوسرے ذریعے سے کر کے ان کی تاریخی حیثیت متعین کی جا سکتی ہے۔ غالب نے واقعات کے بیان کے ضمن میں بعض جگہ اہم سیاسی و معاشی مسائل کے بارے میں اپنے تاثرات بھی پیش کر دیے ہیں۔ مثلاً انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جو سیاسی تبدیلی ہوئی۔ ان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ اور برعظیم کا براہ راست تاج برطانیہ کے زیر سایہ آنا تھا۔ غالب اس تبدیلی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت یہاں دو چیزیں مشہور ہیں ان کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور زمنڈ و رابعث کیا ہے کہ کمپنی کا اعلیٰ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر گورنمنٹ کلکتہ کے چیف سکرٹری اکبرآباد کے لفٹیننٹ گورنر ہو گئے۔ خبریں دونوں اچھی ہیں۔ خدا کرے سچ ہوں۔" ۲۴

بیگمات اودھ کے خطوط ادبی نہیں ہیں بلکہ اکثر خطوط دوسروں سے لکھوائے گئے ہیں لیکن ان بیگمات کا نام صرف ان کے خطوط کی وجہ سے ہی زندہ ہے۔ اسی طرح غلام غوث بے خبر مکتوب نگار کی حیثیت سے زندہ ہیں اگر وہ غالب کو خطوط نہ لکھتے تو تاریخ ادب اردو میں ان کا نام غالب کے مکتوب الیہ کی حیثیت سے آتا۔

خطوط کی اہمیت تخلیقی کارناموں سے کم نہیں ہے۔ جس طرح ادب کی دوسری اصناف سخن کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جاتا ہے۔ اسی لئے خطوط بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ خطوط کے اسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے غلام رسول مہر لکھتے ہیں

"بعض اکابر کی گراں قدر تصانیف کے مطالعے سے کم تر اصحاب مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن مکاتیب کو اس لئے زیادہ شوق سے پڑھا جاتا ہے کہ ان کے مطالب میں تصانیف کی متانت و یک رنگی کے بجائے تنوع اور بوقلمونی کی گل افشانیاں ہوتی ہیں۔ نیز مکاتیب علم و ادب کے چھوٹے چھوٹے جواہر پارے ہوتے ہیں جنہیں پڑھتے وقت دماغ پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا۔ استفادہ بیشتر ہوتا ہے اور زحمت کمتر۔" ۲۵

ہماری روزمرہ کی زندگی میں خط نگاری کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر ہم مجبوراً یا شوقیہ خطوط بھی لکھیں تو بھی خطوط نگاری کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خطوط نگاری مہذب سماج کا ایک اہم فن ہے۔ اس فن سے نہ صرف انس و محبت کا رشتہ برقرار رہتا ہے بلکہ دونوں دور رہ کر بھی قریب رہتے ہیں۔ بقول سید عبداللہ:

"خط اپنی بنیادی غرض و غایت کے اعتبار سے ایک کاروباری چیز ہے یہ ایک مادی ذریعہ ہے نظام تمدن کا جیسے مثلاً تار یا ٹیلی فون وغیرہ وغیرہ۔ مگر ذہن انسانی نے اس کو تہذیب و تکمیل کے اس درجے پر پہنچا دیا ہے کہ یہ ایک مستقل فن بھی بن گیا ہے۔" [illegible]

اس کے برعکس قرۃ العین حیدر کا خیال ہے:

"دور حاضر کی ٹیکنالوجی نے خطوط نویسی کلچر کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے آئندہ صدیوں میں ہمارے مراسلے بھی قدیم اشوری الواح کی مانند عجائبات میں شمار کیے جائیں گے۔ برٹش میوزیم میں پتھروں پر کندہ مراسلے موجود ہیں وہ بھی آپ اور ہم جیسے انسانوں نے ہی لکھے ہوں گے۔ جب سے اب تک اس کا وقفہ ایک آن کا ہے۔ آن واحد۔" [illegible]



مکتوب نگاری کی تاریخ

انسان کی تخلیقی صلاحیتوں میں سب سے زیادہ اہم صلاحیت خط کی ایجاد ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ حروف و خطوط کی ایجاد کا اولین مقصد ایک انسان کے خیالات کو دوسرے انسان تک پہنچانا تھا۔ انسان نے جب معیشت کا آغاز کیا ہوگا تو اسے محسوس ہوا ہوگا کہ بالمشافہ ابلاغ ایک قدرتی عمل ہے۔ انسان نے اظہار مافی الضمیر کے لیے قدرتی آوازوں کی نقل کرتے، اشاروں سے کام لیتا اور پھر بولنا سیکھا ہوگا مگر جو لوگ یا شخص نظر کے سامنے نہیں یا حد سماعت کے اندر موجود نہیں۔ ان تک بھی ابلاغ مقاصد کی خاطر پہنچنے کی کوئی صورت یا تشکیل ہونی چاہیے۔ انسان کی یہی ضرورت خط یا تحریر کی ایجاد کا سبب ہوئی۔ آغاز میں تصویروں سے کام چلایا گیا مگر یہ طریقہ طوالت اور دشواری سے خالی نہ تھا اس کے علاوہ مکمل اظہار مقصود میں بھی کارگر نہ ہو سکتا تھا۔ مدت کے بعد مختلف تجربوں سے گزر کر انسان موجودہ خط ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ہر قوم نے اپنی ضرورت کے لحاظ سے حروف کی شکلیں قرار دے دیں۔ اس طرح خط کی ابتدا سے اہم تحریر کی ایجاد ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا جب باقاعدہ لکھنے پڑھنے، تصنیف و تالیف، علم و ادب کی گرم بازاری ہوئی۔ ادب کی ہی ایک شاخ خطوط نویسی، کتابت، دبیری، مراسلت یا ترسیل کے ناموں سے موسوم ہے۔

مکتوب نگاری کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ کاغذ ایجاد ہونے سے پہلے جب انسان درخت کے پتوں، دھات کی پلیٹوں، چمڑوں اور مٹی کی لوحوں پر لکھتا تھا تب بھی خط لکھے جاتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔ تہذیب و تمدن کے ارتقائی دور کے ساتھ جب تحریروں کے سلسلے آگے بڑھے تو مکتوب نگاری بھی اس کے ذیل میں آگئی۔ مکتوب نگاری کے آغاز پر سید

مظفر حسین برنی 'کلیات مکاتیب اقبال' کے مقدمے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"خطوط نویسی یا نامہ نگاری کا آغاز اسی زمانے میں ہو گیا ہوگا جب انسان نے رسم الخط ایجاد کیا اور لکھنا سیکھا چنانچہ تقریباً تین ہزار سال قبل کی تین سو مٹی کی لوحیں ایسی ملی ہیں جن پر مصر کے فراعنہ کے نام سے خطوط کندہ ہیں۔ یہ ۱۸۸۷ء میں مصر (عراق) کے مقام پر کھدائی کے دوران دریافت ہوئیں۔"[۲۹]

۱۸۸۷ء کی کھدائی کے دوران تل العمرنہ کے مقام پر مٹی کی جو الواح دستیاب ہوئی ہیں ان پر خط سریانی میں عبارت درج ہیں جس سے مصر اور اس کے باج گزار ممالک کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ پہلا خط کب اور کس زبان میں تحریر ہوا۔ تحقیقات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے شاید قدیم ترین خط وہ ہے جو قرآن پاک کی بعض تفسیروں کے مطابق حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو اس وقت لکھا تھا جب وہ عزیز مصر بنائے گئے تھے۔ چونکہ مذکورہ خط کا متن ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے اس لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ جس کو آج 'خط' کا نام دیا جا رہا ہے اس وقت اس کی کیا شکل رہی ہوگی۔ دراصل خط کا اولین نمونہ اس خط کو کہا جا سکتا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کو ارسال کیا تھا۔ یہ خط اپنے پورے متن کے ساتھ لفظ بلفظ قرآن پاک میں موجود ہے۔ اس کے مستند اور معتبر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مولانا فتح محمد خاں جالندھری نے اردو ترجمہ قرآن میں اس حقیقت کی طرف روشنی ڈالی ہے:

"پتوں، چھالوں اور مٹی کی لوحوں پر جو خط تحریر کیے جاتے تھے، وہ مختصر اور کاروباری قسم کے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک ایسا ہی خط سلیمان علیہ السلام کی طرف سے دسویں صدی قبل مسیح میں فلسطین سے بجانب حبش ارسال کیا گیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت (۹۵۲ ق م تا ۹۹۲ ق م) موجودہ مشرق اردن تا یمن وسیع و عریض مملکت تھی۔ غالباً سب سے پہلا خط عبرانی زبان میں تحریر کیا گیا تھا۔ جو ملکۂ سبا کے نام ارسال کیا گیا تھا، وہ مختصر، با معنی اور تبلیغی تھا اور جس کی بدولت ملکۂ سبا (بلقیس) مشرف با اسلام ہوئی تھیں۔ ملکۂ سبا کا ذکر مورخین اپنی اپنی تصنیفات میں کرتے آئے ہیں۔ یہ خط ہدہد کے ذریعے

ارسال کیا گیا تھا۔ کلام پاک میں خط مذکورہ کا ذکر موجود ہے۔ سورۂ نمل ملاحظہ فرمائیں۔"[۳۰]

یونان کے شاعر ہومر (Homer) اور مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم یونان میں خط و کتابت کا رواج تھا۔ دورِ عیسیٰ میں تو خط نگاری کا رواج عام تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے یونان میں تحریر کردہ خطوط کی بابت معلومات درج کی ہے۔ ان کے مطابق سینٹ پیٹر (Saint Petter) اور سینٹ پال (Saint Paul) نے عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبی کے بعد ۶۱ء میں خطوط تحریر کیے تھے۔"[۳۱]

مولوی سید سلیمان ندوی عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے خطوط کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عیسائیوں میں مقدس حواریوں کے خطوط کی خاص اہمیت ہے اور وہ مجموعۂ انجیل کے ضروری جز خیال کیے جاتے ہیں اور قبول کے ہاتھوں سے لیے اور ادب کی آنکھوں سے پڑھے جاتے ہیں۔"[۳۲]

غرض یہ کہ قدیم یونانی نہ صرف خط نگاری سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے بلکہ اس سے دلچسپی اور شوق بھی رکھتے تھے۔ یونان کی ہی طرح روم کی خط نگاری کی بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ خلیق انجم روم کی خط نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسانی تاریخ میں یہ اعزاز اہلِ روم کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن بنائیں۔ ادبی مورخ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں روم کے قابل اور پڑھے لکھے لوگ بہت دور واقع صوبوں کی گورنری کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اپنے صوبوں کے حالات بتانے اور روم کے حالات جاننے کے لیے خط و کتابت کی اشد ضرورت تھی۔ سسرو اسی عہد کا مکتوب نگار ہے۔"[۳۳]

اس طرح یونان و روم کی مکتوب نگاری کی تاریخی اہمیت ہے۔ بہت سے مکاتیب افلاطون (Plats) ارسطو (Aristtle) اور اپیکیورس (Aepicurus) سے بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔ پلوٹارک (Plutarch) کے خطوط مشہور ہیں لیکن اہلِ روم نے ہی مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن بنا

دیا۔ ان میں سِسرو (Cicero) کے علاوہ سینیکا بزرگ (Cineca Elder) کے مکتوبات قابلِ ذکر ہیں۔ لاطینی میں ہوریس (Horace) نے منظوم خطوط لکھنے کی روایت قائم کی۔ مغربی مکتوب نگاری میں سِسرو کو پہلا مکتوب نگار مانا جاتا ہے۔

انگریزی ادب میں ڈاکٹر سموئیل جانسن (Dr. Samuel Johnoen) لارڈ چیسٹر فیلڈ (Lardchestir field)، ولیم کوپر (William Couper) چارلس لیمب (Charls Lamb)، کیٹس (Keats)، شیلی (Shelly) بائرن (Byron) براؤننگ (Browning) اور جارج برنارڈ شا (Jeorge Barnard Shaue) کے خطوط قابلِ ذکر ہیں۔ فرانسیسی ادب میں نپولین (Napolen) والٹیئر (Valtaire) وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) اور گائی دی موپاساں (Gue De Maupassant) کے خطوط خاص مقام رکھتے ہیں۔

عربی زبان و ادب میں خطوط کا وافر سرمایہ موجود ہے۔ عرب میں خط لکھنا ایک پیشہ تھا اور اس پیشہ کو اختیار کرنے والے کو کاتب کہا جاتا تھا۔ اسلام کے ظہور کے بعد اس فن نے کافی ترقی کی۔ آنحضرتؐ کی جانب سے ارسال کیے گئے خطوط ایک مرتب شکل میں دستیاب ہیں۔

خلفائے راشدینؓ کے خطوط میں اس وقت کے عرب انشاپردازی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ یہ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خطوط ندوۃ المصنفین نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیے۔ اس سے پہلے ندوۃ المصنفین نے ہی پہلی بار حضرت عمر فاروقؓ کے خطوط شائع کیے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے خطوط جناب خورشید فاروقی پروفیسر ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطوط و تقاریر کا مجموعہ "نہج البلاغۃ" کے نام سے شریف علی بغدادی نے شائع کرائے "نہج البلاغۃ" میں شامل حضرت علی کے مکتوبات کا انگریزی ترجمہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ خطوط اسلامی تاریخ میں دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مکتوبات نہایت فصیح شستہ زبان میں ہیں اور مؤثر اور بامعنی ہیں۔ قرآن کے حوالے سے بہت کارآمد گفتگو کی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے خطوط کے ذخائر کو محفوظ کرنے اور ان ترتیب و تدوین کی غرض سے باقاعدہ "دارالانشاء" قائم کیا۔ ایک مرکزی محکمہ مدینہ میں تھا۔ باقی تمام صوبوں میں سرکاری سطح پر ایسے ہی محکمے قائم کیے گئے۔ خط نگاری کے فن پر باقاعدہ کتابیں لکھی

گئیں۔ خطوط کی ہیئت، اسلوب، اقسام، مفاہیم متعین ہوئے اور خط نویسی باقاعدہ ایک فن کا درجہ اختیار کر گئی۔

بنوامیہ اور بنی عباس کے عہد میں اس فن نے اور بھی ترقی کی۔ "دیوان الانشا" کے نام سے باقاعدہ ایک شعبہ کا قیام عمل میں آیا۔

عربی خط نویسی کی تاریخ میں عبدالحمید بن یحییٰ کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے صرف خط نگاری کی ابتدا کی بلکہ مضمون نیز القاب و آداب میں جدت و ندرت پیدا کی۔ عربی زبان و ادب میں عبدالحمید بن یحییٰ پہلے ایسے مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط نجی اور ذاتی نوعیت کے ہیں اور ادبی حیثیت سے ترقی یافتہ شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد سامانی اور غزنوی دور میں خط و کتابت کا ایک باقاعدہ محکمہ کھل گیا جس کا ذکر نظامی عروضی سمرقندی نے "چہار مقالہ" میں کیا ہے۔ ایرانیوں نے جہاں بھی حکومت قائم کی وہاں سے عربی کو نکال دیا جس کا اثر فطری طور پر خط و کتابت پر پڑا۔ ایرانی حاکموں نے اسلامی ایشیا میں فارسی کو دفتری زبان بنا دیا اور ترقی کرتے کرتے اس درجہ پر پہنچ گئی کہ اس نے عربی حکومت اور زبان دونوں کو دفتر و دربار سے نکال کر باہر کر دیا۔ اس کا اثر انشاء و مراسلت پر بھی پڑا۔

عربی کی طرح فارسی میں بھی مکتوبات کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے۔ یہ مکتوبات اپنی انفرادیت و افادیت کے ساتھ متنوع اسالیب کے ترجمان ہیں۔ خط لکھنے والوں کو پہلے کاتب کہا جاتا تھا لیکن اب فارسی زبان کے زیر اثر انھیں دوست دار، دبیر، منشی کہا جانے لگا۔ فارسی مکتوبات کہیں فرامین کی شکل میں ملتے ہیں، کہیں حکم ناموں کی شکل میں کہیں کہ درباری سطح پر مکتوبات کا اپنا الگ انداز ہوتا ہے۔ فارسی مکتوبات کا بڑا ذخیرہ درباروں اور خانقاہوں کے تعلق سے دستیاب ہوتا ہے۔

مکتوب نگاری کی تاریخ کے سلسلے میں ایک خط کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ امیر تیمور لنگ نے ۱۴۰۲ میں فرانس کے چارلس ششم کو ایک خط لکھا تھا۔ جواب نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ اس خط کا ذکر عبدالوہاب ترویلی نے "بست مقالہ" میں کیا ہے۔"[۳۳]

ہندوستان میں سب سے پہلے خط کا رواج چندر گپت موریہ کے زمانے میں ہوا۔ یہ حضرت

عیسیٰ سے کوئی تین سو سال پہلے ہوا تھا۔ کوٹلیہ کی کتاب "ارتھ شاستر" سے معلوم ہوتا ہے کہ چندر گپت موریہ کے دربار میں خطوں کی آمد و رفت عام بات سمجھی جاتی تھی۔ عام طور پر ہندوستانی فارسی ادب میں "اعجاز نامہ خسروی" کو خطوط نگاری کا نقش اولین قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس فن پر مباحث کا آغاز "اعجاز نامہ خسروی" سے بہت پہلے فارسی شعراء اور نثر نگار کر چکے تھے۔ نظامی عروضی سمرقندی کے "چہار مقالہ" کے "مقالہ" میں بھی اس فن پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ "راحت الصدور" میں بھی فن انشا کے اصول و قواعد درج ہیں۔ دستور دبیری پر لکھی جانے والی پہلی کتاب "معین الدین محمد بن عبدالخالق المیہنی" نے تحریر کی۔ فن انشا پر لکھی جانے والی تو بہت سی کتابیں ہیں جن میں دستور الکاتب فی تعیین المراتب، مناظر الانشا، مخزن الانشا، صحائف، بدیع الانشا، ریاض الانشا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۳۵

فارسی زبان و ادب میں بزرگان دین اور صوفیائے کرام کے خطوط کا ذخیرہ سرمایہ ملتا ہے۔ قدامت کے لحاظ سے مجد الدین ابوالفتوح احمد طوسی اور عبداللہ بن علی میانجی ہمدانی کے خطوط عرفانی نیز حکیمانہ مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ حضرت مولانا جلال الدین محمد بن بلخی رومی کے مکاتیب میں رموز تصوف اور مسائل وحدانیت پر مختلف حیثیتوں سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں امام غزالی کے "فضائل الانام من رسائل حجۃ الاسلام" کے ساتھ مکتوبات عالیہ شاہ عبدالرزاق علوی قادری، مکتوبات قدوسی شاہ عبدالقدوس گنگوہی، بحر المعانی شیخ ابوجعفر مکی حسینی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی سلسلہ نقشبندیہ کے ذکر و کشف و مراقبات اور ریاضت کے مضامین سے معمور ہیں۔ مزید برآں مفاوضات حضرت شاہ محمد کاظم قلندری علوی کاکوروی، مکاتیب حضرت حافظ شاہ علی انور قلندری کاکوروی نیز فیوض العارفین و تعلیمات قلندریہ مرتبہ مولانا شاہ تقی حیدر قلندر، سلسلہ قلندریہ کے اذکار و اشغال، حقائق و معارف اور تعلیمات وغیرہ سے مزین ہیں۔

خواجہ عماد الدین محمود کے مکاتیب کا مجموعہ "ریاض الانشاء" کے نام سے موسوم ہے اس کے مکتوب الیہم اپنے عہد کی مشہور و معروف ہستیاں رہی ہیں۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مکتوبات بھی مرتب ہو چکے ہیں۔ یہ مکاتیب اس وقت کے اکابر علماء و بزرگان دین کے نام ہیں۔ جن میں

ادبیت، تصوف و معرفت، تنقیدی نکات اور معاصرین پر تبصرہ کے عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۳۶

مکاتیب ابوالفضل اسلوبیات کے اعتبار سے ایک منفرد مقام کے حامل ہیں جو صنائع و بدائع سے بھرپور ہیں ان کے مکاتیب کے دو مجموعے مکاتیب علامی اور رقعات شیخ ابوالفضل قابل توجہ ہیں۔

شہنشاہ عالم گیر کے فارسی خطوط "رقعات عالمگیری" اور "کلمات طیبات" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہ خطوط اورنگ زیب نے اپنے بیٹوں اور ایسے امراء کے نام لکھے ہیں جن کو وہ اپنے قریب تصور کرتے تھے۔

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شاہ محب اللہ الہ آبادی کے مکاتیب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہے۔ چار سو تینتیس (۴۳۳) صفحات پر محیط یہ مجموعہ اپنے عہد کی تاریخی پرچھائیوں اور مذہبی روایتوں کے علاوہ وحدت الوجود کے مباحث سے بھی آراستہ ہے۔" ۳۷

مرزا مظہر جانجاناں کے فارسی خطوط خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ان کے خطوط میں باہمی گفتگو کا پورا لطف موجود ہے۔ مرزا مظہر جانجاناں کی طرح متعدد افراد ایسے گزرے ہیں جو فارسی ادیب و شاعر بھی تھے اور جن کا رشتہ اردو ادب سے بھی تاریخی طور پر بہت گہرا تھا۔ اس فہرست میں مرزا محمد قتیل، مرزا غالب، امام بخش صہبائی، اور مومن خاں مومن کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس طرح فارسی مکتوب نگاری کا سلسلہ اردو خطوط نگاری کے ساتھ بھی جاری رہا۔ یہ سلسلہ عہد غالب میں بھی ملتا ہے اور اس کے بعد بھی۔



اُردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا

اردو نثر کے ابتدائی نمونے پندرھویں صدی سے ملنے شروع ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں جو مخطوطات ملفوظات کتابیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں کچھ داستانیں ہیں اور باقی تصوف مذہب اور اخلاقیات کے موضوع پر ہیں۔ اردو کا یہ نثری سرمایہ دوسری زبانوں اور خاص طور پر فارسی سے ترجمہ کیا ہوا یا ماخوذ ہے۔

ہندوستان میں صدیوں تک فارسی زبان کا راج رہا۔ یہ ایک طاقتور مرکزی حکومت کی زبان تھی اس مرکزی خصوصیت کے تحت تمام علاقوں میں سرکاری زبان بھی فارسی ہی رہی۔ اس لئے اعلیٰ طبقے کے لکھنے پڑھنے کی زبان فارسی ہی تھی۔ سرکاری اور ادبی مقاصد کے لئے فارسی کے استعمال نے مقامی زبانوں اور بولیوں کو زیادہ پنپنے نہیں دیا۔ صوفیوں اور سنتوں نے اپنے مسلک کی تبلیغ کے لے مقامی زبانوں کا استعمال ضرور کیا۔ لیکن اس کا اثر ایک مخصوص طبقے تک ہی محدود رہا۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہونے سے مختلف علاقوں کی تہذیبی و ثقافتی قدروں اور مقامی زبانوں کو ترقی کا موقع ملا۔ علاقائی وحدتیں وجود میں آ گئیں۔ مغلوں کا زوال شروع ہوتے ہی ہندوستان کی ان مقامی زبانوں کا وہ ارتقاء شروع ہو گیا جو کافی عرصے سے جامد تھا۔ اردو بھی ان زبانوں میں سے ایک تھی۔ اردو کو فارسی سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا۔

نثر کی ابتدا سے ہی خطوط اپنی مختلف ہیئتوں اور اسالیب کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ جو اپنے الگ انداز بیان اور اصل مقصد کی غمازی و ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ موجودہ دور تک مختلف رجحانات اور مسالک خطوط کے ذریعہ ہی سامنے آتے ہیں۔ ان میں خطا نگاری کے آداب اور علمی، ادبی سیاسی، سماجی اور نجی مسائل بھی شامل ہیں۔ خطوط ابتدا سے ہی فارسی زبان اور اس کے اسالیب

گفتگو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو کے قدیم ادباء و شعرا فارسی ہی میں خط لکھا کرتے تھے۔ ان کے پیش نظر فارسی مکتوب نگاری کی ایک عظیم روایت رہی ہے۔ اردو مکتوب نگاری فارسی مکتوب کے زیر اثر پروان چڑھی ہے۔ فارسی انشاء روایت کے زیر اثر اردو مکتوبات کے اپنے خدوخال متشکل ہوئے۔ اور اردو خطوط میں زیادہ تر انہیں روایات و تکلفات کا اظہار ہوتا رہا جو فارسی مراسلت کے امتیازی نشانات سامنے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ ایک طویل عرصے تک فارسی زبان کو دفتری زبان کی حیثیت حاصل رہی۔

اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں انگریزی زبان نے ہندوستان کے لسانی منظرنامے میں اپنے وجود کا احساس دلانا شروع کیا اس کا پس منظر یہ ہے کہ سولہویں صدی میں یورپ کے مختلف ممالک سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ جب تجارتی کمپنیاں ہندوستان آگئیں تو ہندوستانی عوام سے رابطے کے لئے کمپنی سے متعلق بعض افراد کو اردو سیکھنی پڑی۔ اس کے لئے اردو لغت اور قواعد تیار کئے گئے تاکہ انہیں یہ زبان سیکھنے میں آسانی ہو۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب فارسی کی کاروباری حیثیت کو زوال آیا اور اردو نے اس کی جگہ لے لی تو عام خط و کتابت انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی کی جانے لگی۔ دیگر اصناف کی مانند اس تغیراتی دور میں مکتوباتی ادب بھی تبدیل ہوا۔ ادب کی یہ تبدیلی اگر ایک طرف سماجی سیاسی اور معاشرتی حالات کا نتیجہ تھی تو دوسری طرف ہمارے ادبی شعور اور اس کے اظہار کے سلسلے میں نئے انداز نظر کی ترجمانی بھی کر رہی تھی۔

اردو میں مکتوب نگاری دو روشوں پر آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک روش وہ جس میں فارسی کے رنگ کی تقلید کی جاتی تھی۔ وہی زبان کے حسن و آراستگی کا معیار تھا۔ دوسری روش تھی جدید طرز کی جن کی مثالیں بھی انھیں کے یہاں موجود ہیں جنھوں نے فارسی کی تقلید کی۔ ابتدا میں یہ طرز مقبول تھا۔ لیکن غالب جیسا مکتوب نگار ہمیں یہ سوچتا ہوا نظر آتا ہے کہ "اس نے بہت سے خطوط ہاتھ سنبھال کر نہیں لکھے ہیں۔"

اگر ہم جدید مکتوب نگاری کے آغاز کے پس منظر پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اردو نثر نے ترقی کے مراحل طے کیے۔ نصف انیسویں صدی کا ہندوستان بعض اعتبار سے

افراتفری کا عہد سمجھا جاتا ہے۔ جس میں ٹھہراؤ اور سکون ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ہر شعبۂ زندگی میں انقلاب کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اس ذہنی انقلاب کے اثرات زبان و ادب پر بھی پڑے اور نئے اسالیب تحریر ہوئے جو اس معاشرے کے افراد کی ذہنی نہج کہلاتی ہیں۔ لوگوں کے ذہن فارسی کے علاوہ سوچنے پر آمادہ ہو گئے اور اردو نثر نئے ذہن جدید رنگ و زندگی بدلتے نظام اور ضرورتوں کے تقاضوں میں ڈھلنے لگی۔

فورٹ ولیم کالج ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء میں قائم کیا گیا۔ انگریز صاحبان کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کی ضرورت کے تحت فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا اور اس کالج کے اثرات جدید نثر پر خوش آئند و تابناک انداز سے مرتب ہوئے۔ اردو نثر کے لئے نئے راستے بھی استوار ہوئے۔ ''فورٹ ولیم کالج کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو فارسی کے اثر سے آزاد کیا۔'' ۴۸؎

کالج کے زیر اثر اردو نثر آزاد فضاؤں میں سانس لینے لگی۔ اس کالج میں لکھی جانے والی نثر نے یہ احساس عام کر دیا کہ نثر کو اپنی انفرادیت حاصل کرنے کے لئے عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور محمد شاہی روش سے گریز کرنا ہوگا۔ فورٹ ولیم کالج کی خدمات کے باعث اردو نثر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے حامد حسن قادری نے لکھا ہے:

''سب سے بڑی خدمت اس کالج کی یہ ہے کہ سلیس نثر کی شاہراہ قائم کر دی۔ اگر یہ چلن جاری نہ ہوتا تو ارباب علم و ادب اس راستے پر آتے لیکن دیر لگتی۔'' ۴۹؎

جدید اردو نثر کے ارتقاء میں دلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا کردار بھی اہم ہے۔ یہ سوسائٹی ۱۸۳۳ء میں دلی میں قائم ہوئی۔ سوسائٹی نے جو بھی کام کیا اس کے اثرات بھی اس عہد کی اردو نثر پر پڑے۔ دلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی سے نہ صرف موتی لعل دہلوی کا ترجمہ ''تذکرۂ شعراء'' شائع ہوا بلکہ موتی لعل نے دوسرے رسالے بھی تصنیف کئے۔ اس سوسائٹی نے ہندوستانی طالب علموں کے لئے نصاب کی کتابیں تیار کیں۔ بقول خلیق انجم:

''فورٹ ولیم کالج نے اگرچہ جدید اردو نثر کی ابتدا کی تھی لیکن اس کی مطبوعات اخلاقیات، تاریخ، داستان، لغت اور صرف و نحو تک ہی محدود تھی۔ دلی کالج ورنیکلر

ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اپنے ترجموں کے ذریعہ پہلی بار ہندوستانی ذہن کو مغربی فکر اور مغربی ادب سے آشنا کیا۔'' ۵۰؎

فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی خدمات اپنی جگہ مسلم ہیں۔ انہوں نے اردو نثر کے جدید آہنگ کے لئے فضا ہموار کر دی اور اس نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ سادگی کا جو انداز مقبول ہوا اس کا ایک سبب اخباروں اور رسائل کی اشاعت بھی رہا۔ جس کے نتیجے میں عوام کو ایک قربت حاصل ہوئی۔ ۱۸۲۲ء میں ''جام جہاں نما'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ اور اس کا ضمیمہ اردو میں شائع ہوتا رہا۔ دلی کا پہلا اردو اخبار مولوی باقر کی ادارت میں ''دہلی اردو اخبار'' کے نام سے نکلا۔ لیتھوگرافک پریس سے سید محمد صاحب نے ۱۸۳۸ء میں ''سید الاخبار'' نکالا۔ ان اخباروں کی زبان صاف سادہ اور سلیس ہوتی تھی۔ اگر اس دور پر نظر ڈالی جائے تو اخباروں کی اچھی تعداد ملتی ہے۔ لیتھوگرافک پریس کے زیر اہتمام اردو نثر کی کتابوں کی اشاعت کی رفتار تیز ہوتی گئی۔

خطوط نگاری کی ترویج میں محکمۂ ڈاک کے قیام نے مزید ترقی کے مواقع فراہم کئے۔ اردو میں ادبی نثر کی تاریخ گواہ ہے کہ مختلف اعتبار سے ترقی کرنے کے بعد ہی اردو نثر مکتوب نگاری کے دائرے میں قدم رکھ سکی۔ اور مکتوب نگاری کے فن کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو نثر میں جو طاقت ارتقا پذیری کی جو صلاحیت اور نئی توانائی رونما ہوئی اس کا اندازہ اس دور کے اردو خطوط سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

نصف انیسویں صدی کے ہندوستان میں تمدنی بیداری اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی تحریکیں عمل پذیر ہوئیں۔ انہوں نے بھی نثر کو نئی وسعتیں عطا کیں۔ مذہبی تحریکوں کے زیر اثر بھی نثر میں جدت کے عناصر اور انقلابی عمل رونما ہوئے۔ بقول ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر:

''گویا سماجی شکست و ریخت اور سیاسی اتار چڑھاؤ نے معاشرے پر جو جمود و انحطاط کی فضا قائم کر دی تھی ان کے تدارک کا کام بزرگان دین کے ذریعہ عملی صورت اختیار کر سکا۔ اردو نثر کے وسیلے سے ان اصحاب نے دینی تعلیمات عام لوگوں تک پہنچانے کی سعی کی جس کے باعث زبان میں سادگی، لطافت

فصاحت و روانی اور مختلف علوم کی اصطلاحات بھی رائج ہو گئیں۔ ان میں تصوف
کا ذکر خاص طور پر کیا جا سکتا ہے۔"۲۱

انیسویں صدی کے خطوط میں "جدت" کے اسالیب کو پیش کیا جانے لگا۔ جدید مکتوب نگاری انشاء پردازی سے الگ ہو کر بے تکلف اور مکالمے سے قریب تر ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت مراسلہ کو مکالمہ بنانے کا دعویٰ غالب کے علاوہ دیگر افراد بھی کر رہے تھے۔ آغاز سے ارتقائی دور میں قدم رکھنے کے بعد مکتوب نگاری میں عجیب عجیب تبدیلیاں ہوتی نظر آئی ہیں۔ سادگی و سلاست اور جدت کی جانب آئے نثر کے اثرات بجا طور پر خطوط میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ قافیہ کی پابندی، تشبیہات و استعارات کے سلسلے میں اور انداز بیان میں آرائش کا التزام بھی ہے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ قمطراز ہیں:

"مرزا غالب نے اردو میں خط لکھنے شروع کیے تو ان کے سامنے نثر نگاری کے دو انداز موجود تھے۔ ایک وہ پر تکلف انداز جو فارسی انشاء پردازی کے تتبع میں اردو میں رواج پا چکا تھا۔ دوسرا سادہ طریقہ جس کو فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں نے رائج کیا۔"۲۲

اردو مکتوب نگاری کے ارتقاء میں مرزا قتیل کے خطوط ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ مرزا قتیل کے مجموعے "معدن الفوائد" میں اردو کے صرف پانچ خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں بعض خطوط بغیر القاب و آداب کے شروع ہوئے ہیں۔ مرزا قتیل کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک عام فہم زبان میں خط لکھنے پر قادر تھے۔

غلام غوث بے خبر کے مکاتیب کے مجموعے "انشائے بے خبر" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت سادگی کا کچھ میلان پیدا ہوا۔ غلام غوث بے خبر کے خطوط میں سادگی ضرور ہے مگر وہ فارسی انشاء سے نہیں بچ سکے۔ بے خبر نے اپنے خطوط میں قدیم القاب و آداب سے گریز کیا ہے۔ "انشائے بے خبر" کے تیس (۳۰) خطوط میں ایک بھی خط ایسا نہیں ہے جس میں قدیم طرز کے القاب و آداب پائے جاتے ہوں۔ مراسلے کو مکالمہ بنانے کا وصف بے خبر اور سرور سے شروع ہوا اور غالب نے اسے درجۂ کمال تک پہنچایا۔

بے خبر مکتوب نگاری کے ارتقاء میں فورٹ ولیم کالج اور غالب کے درمیان کی ایک کڑی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو کو قدیم روایتوں اور فارسی کے اثرات سے آزاد کرایا۔ انگریز دیسی زبانوں کی نشوونما اور ترقی میں کوشاں رہے۔ بے خبر نے بھی ان سب باتوں سے اثر قبول کیا اور انہوں نے شاہی ماحول کی رسمی فضا سے الگ ہٹ کر اپنے لیے اردو مکتوب نگاری میں راہ پیدا کی۔

رجب علی بیگ سرور کے خطوط ایک طرف اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی تحریروں کا اسلوب خود لکھنوی تہذیب کے مزاج کا مظہر ہے۔ سرور کے خطوط کے مجموعہ "انشائے سرور" میں دو اسالیب ملتے ہیں ایک سادہ اور دوسرا رنگین۔

رجب علی بیگ سرور کے خطوط میں القاب و آداب اور تمہید میں روایتی طرز کی خطوط نویسی کا انداز ملتا ہے۔ رنگین بیانی کا اہتمام بھی ملتا ہے اور الفاظ پر شکوہ ہیں۔ سرور کی کوشش رہی ہے کہ عبارت گنجلک نہ ہونے پائے بلکہ زبان سلیس اور اسلوب سادہ ہے۔ اسلوب میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ ان کے خطوط میں اکثر مکالمے کا انداز بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

"قبلہ بندہ تسلیم بجا لاتا ہوں اور جو کام کرتا ہوں اس کی داد پاتا ہوں آپ کی پوسٹ ماسٹر تک رسائی ہے تمکین نے ہرکارہ ان سے رسم بڑھائی ہے۔ گو ہم پلہ نہیں کم ہوں مگر قدم بقدم ہوں۔"۲۳

سرور کے زمانے میں معنی سے زیادہ الفاظ کی پذیرائی ہوئی۔ انہوں نے جدید لفظوں کا انتخاب کیا۔ ان کے استعمال کردہ لفظوں میں بہت کم اب تک متروک ہوئے ہیں۔ سرور کو الفاظ کی تازہ شکلوں اور ان کے نادر استعمال پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی زبان لکھنؤ کی ادبی اور مجلسی اردو کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط بھی اردو خطوط نگاری کے ارتقاء میں ایک خاص کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے خطوط ایک ایسے اسلوب کو پروان چڑھاتے ہیں جو اپنے پیش روؤں سے بہت حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ ان کے بعض خطوط کے نثری آہنگ میں خطوط غالب کی آہٹیں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ خطوط کو نصف ملاقات بنانے کا سہرا تنہا غالب کے سر نہیں بلکہ وہ دور ہی ایسا تھا۔ واجد علی شاہ نے کئی جگہ لکھا ہے کہ اور مدام ارسال خطوط اور خیر خیریت مزاج

محبت امتزاج سے دل فگنیں اختر شاہ کیا کرو کہ ''المکتوب نصف الملاقات'' کہتے ہیں۔''

منظوم خطوط کے علاوہ ان کے القاب کی تانیث یائی طرز اسلوب سے ان کے قصہ و حقیقت سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اکثر محاورات وضرب الامثال کا استعمال کرتے ہیں۔ واجد علی شاہ کے ایک خط کو اردو نثر کا پہلا خط قرار دیتے ہوئے کوکب قدر سجاد علی لکھتے ہیں۔ ''دوم ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ'' (مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۶ء) کا خط اردو نثر کا پہلا خط ہے۔ منظوم خط اس سے پہلے بھی لکھے گئے لیکن نثر میں اس خط سے قبل کا اور کوئی خط نہیں ملتا۔ القاب سے دستخط تک ایک ایک لفظ غور سے دیکھا جائے سرور یا غالب کی پرچھائیں بھی اس خط میں نظر نہ آئے گی۔ لیکن اس کے باوجود اور بجا پائیت اختصار اور خلوص ایسی کوئی خوبی نہیں جو اس خط میں نظر نہ آئے۔''۲۲

بیگمات کے خطوط میں القاب و آداب کی ندرت کے علاوہ دعائیہ کلمات ان کے اسلوب کے جدت کی گواہی دیتے ہیں۔ ایسی بیگمات جو پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ ان کے لئے لائق و فائق منشی مقرر تھے تاکہ مراسلہ نگاری برقرار رہے اور ان کے تاثرات واجد علی شاہ تک پہنچ سکیں۔ مختلف اہل قلم کے نام اس طرح ہیں۔ سرور، عشیر، مشیر، توقیر، بہتر، ہلال، شفق، نزار، تجلی اور عماد علی وغیرہ۔۲۳

اردو نثر کو غالب کی سب سے بڑی دین مکتوب نگاری ہے:

''اب تک غالب کے جتنے اردو خطوط کی بازیافت ہوئی ہے ان میں قدیم ترین خط وہ ہے جو تفتہ کے نام ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا۔''۲۴

مرزا غالب کے خطوط کے دو مجموعے ''عود ہندی'' اور ''اردوئے معلیٰ'' ہیں۔ غالب نے جب اردو مکتوب نگاری کی طرف توجہ کی اس وقت تک اردو نثر کے لئے نہایت حوصلہ افزا حالات پیدا ہو چکے تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام نے اردو نثر کی ترویج و ترقی کو پہلی بار اجتماعی اور شعوری جدوجہد سے ہمکنار کر کے اسے ایک نئی سمت اور رفتار عطا کی۔ اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ہی غالب کی اردو مکتوب نگاری کا سبب قرار پائی۔ فارسی سے غیر معمولی شغف کے باوجود مکتوب نگاری کے سلسلے میں غالب فارسی سے اردو کی طرف جھکتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے سادے اور صاف ستھری نثر کے انداز کو خطوط میں جگہ دی اس سے صحیح معنوں میں جدید مکتوب نگاری کے رہنما کہلانے کے حقدار ہیں۔ انہوں نے خطوط نگاری میں نئے قاعدے اور

اصول وضع کئے موضوعات و اسلوب کے اعتبار سے نئی جہتیں پیدا کیں۔ طرز بیان میں بھی نیا حسن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ غالب نے اپنے خطوط میں القاب و آداب ایجاد کئے ہیں تو کہیں کہیں بغیر القاب و آداب کے بھی خط کی ابتدا کر دیتے ہیں۔ لیکن حالات اور موضوعات کی مناسبت سے اور شخصیت کے اعتبار سے اکثر القاب بدل جاتے ہیں۔

غالب کے خطوط کی مقبولیت سے اردو خطوط نگاری کو ایک خاص ادبی رتبہ حاصل ہوا۔ ان کے بعد کے زمانے میں خط نگاری عموماً ان کی روش کی تقلید کرتی نظر آتی ہے۔

دورِ سرسید سے اردو مکتوباتی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ سرسید اور ان کے معاصر کے تحریر کردہ خطوط میں نئے زمانے کے رجحان انگریزی زبان وادب کے اثرات اور اردو نثر کے ارتقائی منازل کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس دور کے مکتوب نگاروں کے خطوط ایک خاص طرز کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں محسن الملک، وقار الملک، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد وغیرہ کے مکاتیب اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مکتوب نگار مثلاً، ریاض خیر آبادی، امیر مینائی، اکبر الہ آبادی، داغ دہلوی کے خطوط کے مجموعوں کے مختلف سلسلے قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے مکتوبات میں ایک خاص طرز نمایاں ہے، جہاں تاریخ، سوانح نگاری، تحقیق وتنقید، ناول و افسانہ، طنز و مزاح انشائیہ اور مضامین نے نثر کو نئی جہت اور وسعت عطا کی۔ بڑی حد تک رسائل جرائد اور صحافت کے اثرات بھی مکتوب نگاری نے قبول کئے۔ اس دور کا اہم رجحان عقلیت پسندی ہے۔ ضرورت کے تحت مکاتیب میں نئے موضوعات نئے انداز فکر اور نئے زاویوں کا رجحان پیدا ہوا۔ سرسید کی نثر میں مقصدیت کا غلبہ رہا اور مکتوبات میں بھی سرسید مقصد کے علمبردار ہیں۔ اس دور کے خطوط میں فنی نقطۂ نظر سے عبارت آرائی کم ہے تکلف کی جگہ سادگی نے لی ہے۔ اس دور کے خطوط سیاسی سماجی معاشرتی احوال اور اسلوب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ سرسید اور حالی کا انداز بیان مکتوبات میں امتیازی نشانات کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو انہیں منفرد شان عطا کرتا ہے۔ اس طرح اسلوب اور موضوعات کے مختلف پہلوؤں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خطوط سرسید سے اردو کے مکتوباتی ادب میں نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

سرسید کے زمانے سے لے کر ۱۹۳۷ء تک متعدد مکاتیبی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں ہر رنگ اور مزاج کے مکتوب نگار ملتے ہیں۔ ان میں داغ دہلوی، امیر مینائی اور ریاض خیرآبادی کے علاوہ شوق قدوائی، سید ناصر علی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جنگِ عظیم اول کے بعد ذہن و فکر نے جو نئے انقلابات قبول کیے اس سے خطوط نگاری بھی متاثر ہوئی یہ دور ۱۹۳۶ء تک جاتا ہے۔ اس زمانے میں سرسید کے دور کے خلاف ایک جذباتی و رومانی ردِعمل ہوا۔ اس کے بڑے علمبردار اقبال اور ابوالکلام آزاد ہیں۔ ان کے ساتھ الگ الگ حیثیتوں سے مہدی افادی، نیاز فتحپوری، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریاآبادی اور رشید احمد صدیقی شامل ہیں۔ سرسید کا رنگ بھی کہیں کہیں قائم رہا۔ اس رنگ کے سب سے بڑے نمائندہ ادیب مولوی عبدالحق اور احسن مارہروی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کے مجموعے ”کاروانِ خیال“ ”مکاتیب ابوالکلام آزاد“، ”تبرکاتِ آزاد“، ”میرِ عقیدہ“ اور ”غبارِ خاطر“ ہیں۔ ان کی خطا نگاری کو ”غبارِ خاطر“ کے خطوط سے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد مکتوب نگاری کے آداب و رسوم میں تبدیلی آئی کیونکہ اس وقت تک ملک میں حقیقت نگاری اور نفسیات کے مطالعے کا ذوق بیدار ہو چکا تھا۔ خود کو چھپانے کا جو انداز اس سے پہلے کے خطوط میں چلا تھا وہ ترک ہو گیا تھا۔ اور صاف گوئی کا میلان پیدا ہوا۔

اب تک مشاہیر کے خطوط کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ بیسویں صدی بڑی تبدیلیوں کی صدی رہی ہے۔ اسی زمانے میں مکاتیب کے جو چار مجموعے شائع ہوئے وہ اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے نام اس طرح ہیں ”نقوشِ زنداں“ (سجاد ظہیر) ”زیرِ لب“ و ”حرفِ آشنا“ (صفیہ اختر) ”عزیزہ کے نام“ (ڈاکٹر محمد دین تاثیر) اس کے علاوہ چودھری محمد علی کے خطوط کا مجموعہ ”گویا دبستاں کھل گیا“ کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ یہ چاروں مجموعے جدا جدا ہیں مگر جدید ترین مذاق کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں اسی زمانے میں مجنوں گورکھپوری کے خطوط کا مجموعہ ”پردیسی کے خطوط“ خواتین کے خطوط کا مجموعہ ”مکاتیبِ جمیل“ (مرتبہ۔ رحیمہ سلطان) اور انتظام اللہ شہابی نے واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط کو مرتب کر کے ”بیگماتِ اودھ کے خطوط“ کے نام سے شائع کرایا۔ اس کے علاوہ ”خاموش آواز“ کے نام سے جاں نثار اختر

کے خطوط کا مجموعہ شائع ہوا۔ نیر مسعود کے خطوط کا مجموعہ ”خطوطِ مشاہیر“ کے نام سے منظرِ عام پر آیا اور بیسویں صدی کے آخری حصے میں عابد حسین کے خطوط کا مجموعہ ان کی بیگم صالحہ عابد حسین نے مرتب کر کے ”آوازِ دوست“ کے نام سے شائع کرایا۔

۲۰۰۱ء میں ”دامانِ باغباں“ کے نام سے خطوط کا مجموعہ سامنے آیا جس کو قرۃ العین حیدر نے مرتب کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے خطوط کبیر احمد جائسی نے مرتب کر کے ۲۰۰۳ء میں، خطوطِ مشاہیر - بنام امام احمد رضا، ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے ۲۰۰۷ء میں، مشاہیر کے خطوط بنام تنویر احمد علوی، ڈاکٹر شاہد حسین نے رشید حسن خاں کے خطوط، ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے ۲۰۱۱ء میں اور خواجہ احمد فاروقی کے خطوط گوپی چند نارنگ نے مرتب کر کے ۲۰۰۷ء میں شائع کرائے۔ اس طرح اردو مکتوب نگاری نے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے دورِ حاضر میں قدم رکھا۔



اُردو کا پہلا مکتوب نگار

علمی اور ادبی شخصیات کی تصنیفات و تخلیقات کا تنقیدی یا تجزیاتی مطالعہ اور ان کی تاریخی ترتیب اس وقت تک پورے وثوق کے ساتھ ممکن نہیں جب تک کہ ہماری رسائی ان تحریروں تک نہ ہو جائے جو خطوط کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر و ادیب کے ذہنی محرکات کو سمجھنے کے لیے بھی ان کے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خطوط ہی واحد ذریعہ ہیں جن کے توسط سے کسی انسان کے باطنی خد و خال اور اس کی شخصیت کے بعض ایسے گوشوں کو دیکھا جا سکتا ہے جو بادی النظر میں دوسروں کے سامنے نہیں ہوتے۔ ان عوامل کے علاوہ خطوط کی تاریخی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے اس لحاظ سے اردو کے پہلے مکتوب نگار یا قدیم ترین خط کی تحقیق کا کام بہت اہم ہو جاتا ہے۔ زبان میں عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ خطوط جس عہد میں لکھے جاتے ہیں اس عہد کی معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اقدار اور سیاسی و اقتصادی مسائل کے ساتھ زبان و بیان کی جملہ خوبیاں اور خامیاں اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ ابتدا سے عہد حاضر تک کے خطوط اگر اپنی بدلتی ہوئی صورتوں کے ساتھ دستیاب ہو جائیں تو ان کی روشنی میں ان کے لکھنے والوں کی شخصیت سے روشناس ہونے کے علاوہ ہر عہد میں لسانیاتی نقطہ نظر سے زبان میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اس سے بھی واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اردو کے پہلے مکتوب نگار کے بارے میں احسن مارہروی کا خیال ہے کہ:

> ''بیشتر محققین کی قدیم سے قدیم تر اردو خطوط کی دریافت کی سعی مشکور کے باوصف عام طور پر یہ گمان غالب ہے کہ مرزا غالب اردو کے سب سے پہلے مکتوب نگار ہیں۔'' ۴۷

واضح ہو کہ غالب کا قدیم ترین دستیاب شدہ اردو خط ۱۸۴۷ء کا ہے۔ لیکن حامد حسن قادری نے ''انشائے بے خبر'' مطبوعہ مرتضائی پریس آگرہ ۱۹۳۰ء میں لکھا ہے کہ غالب سے قبل غلام غوث بے خبر نے اردو میں خطوط لکھنے شروع کر دیے تھے اور غلام غوث بے خبر کا ایک خط ۱۸۳۰ء کا تحریر کردہ ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی ایک عرضی ۱۸۲۳ء اور ۱۸۲۷ء کے مابین ملتی ہے۔ انشائے سرور میں شامل عرضی کو غلام غوث بے خبر اور غالب سے پہلے کا خط قرار دیتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''یہ عرضداشت ۱۸۲۳ء اور ۱۸۲۷ء کے درمیان لکھی گئی، جو نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ اس طرح سرور کو جو غالب اور بے خبر دونوں سے بڑے تھے۔ مکتوب نگاری میں تاریخی اعتبار سے اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔'' ۴۸

رجب علی بیگ سرور، غلام غوث بے خبر اور مرزا غالب سے پہلے کا یعنی ۱۸۲۲ء کا تحریر کردہ ایک خط کا ذکر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے تحقیقی مقالہ میں کیا ہے۔ عبداللطیف اعظمی نے اپنے مقالے ۴۹ میں اسی خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اس کے کاتب نواب صمصام الملک بہادر ہیں۔ جو کرناٹک کے نواب والا جاہ بہادر کے چوتھے بیٹے ہیں۔ اور مکتوب الیہا ان کی بڑی بھاوج نواب بیگم صاحبہ ہیں۔'' ۵۰

عبداللطیف اعظمی نے اس خط کا متن بھی پیش کیا ہے۔ اور ۱۹۸۳ء میں شائع ان کے مضمون ''اردو خطوط نگاری کا آغاز'' میں بھی اس خط کو اردو کا اولین خط تسلیم کیا ہے۔ جس کی تصدیق انھوں نے مولانا امتیاز علی عرشی اور عابد رضا بیدار کو خط لکھ کر کی تھی۔ ۵۱

''مکاتیب احسن'' میں بھی یہ خط بحیثیت اردو کا پہلا دستیاب شدہ خط درج ہے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> نقل رقعۂ ہندی نواب صاحب بنام نواب بیگم دریاب استدعا صفیہ رنجش عظیم
> جاوہ مرقوم بیست و یکم ربیع الاول ۱۲۳۸ھ مقدس۔
> اگرچہ میرے تئیں عادت ہے کہ ہر ایک نصیحت کی بات جو اپنے باپ سے

سناہوں، ہر ایک اپنے بھانجے بھتیجے اور بچے جو میرے ساتھ نزدیک کی قرابت رکھتے ہیں۔ ہر ایک موقع پر پرانوں سے ظاہر کرتا۔ چنانچہ تم کو بھی ظاہر ہوگا کہ ایک روز کوئی سال گرہ کی رسم میں نواب عظیم الدولہ بہادر مرحوم و مغفور میرے تئیں اپنے ہمراہ زنانے میں لے آئے۔ بعد ادائے رسم کے نواب اعظم جاہ بہادر تسلیم کرنے کے وقت پیچھے ہٹ کر تسلیم کرنے لگے۔"[۵۱]

خلیق انجم کے مطابق پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اردو کے اولین خط کے تعلق سے جان طپش دہلوی، راسخ عظیم آبادی اور یاس آروی کے خطوط کی نشاندہی بھی کی ہے۔ جن کا زمانہ تحریر ۱۸۲۲ء سے قبل مانا گیا ہے۔ خلیق انجم نے خواجہ احمد فاروقی کے حوالے سے لکھا ہے:

"پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے جان طپش (متوفی ۱۸۱۴) کا ایک خط راسخ عظیم آبادی (متوفی ۱۸۲۲) کے نام اور راسخ کا جواب دونوں نقل کیے ہیں۔ خواجہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ کارسین دتاسی اردو میں خط و کتابت کرتا تھا۔ اس کے خطوط پیرس کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔"[۵۲]

کافی عرصے تک مکاتیب اعظم جاہ کے قلمی نسخے سے ماخوذ اس خط کو تاریخ میں اولیت کا درجہ حاصل رہا جو ۱۸۲۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ لیکن مرزا احمد قتیل کے خطوط کے منظر عام پر آنے کے بعد معلوم ہوا کہ مرزا احمد قتیل نے ۱۸۱۷ء سے قبل اردو میں خط لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ان کے شاگرد خواجہ امام الدین عرف خواجہ امامی نے "معدن الفوائد" کے عنوان سے ۱۸۱۷ء میں شائع کیا۔ خواجہ احمد فاروقی نے بھی مرزا احمد قتیل کے خط کا نمونہ "بحر الفصاحت" اور "جلوہ خضر" کے حوالے سے پیش کیا ہے مرزا احمد قتیل کے خط کا نمونہ پیش خدمت ہے:

"جس کا جی چاہے ہمارے پاس آوے، گھر ہے اس کا اور کوئی آتا آتا یک بارگی رہ جائے تو ہم کو کیا غرض۔ اگر یہ چاہیے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی آیا کرے تو یہ بات بہت مشکل ہے۔ اس واسطے کہ یہ عاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس گوشے کے بیچ اس طرح بیٹھا ہے کہ ہزار بار دورہ کامل فلک معظم کا جس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے سر پر سے گذر جائے تو بھی اس جگہ سے اٹھ کر بہت

جا سکتا اس واسطے کہ تب جا سکے سو بھی دیکھنا چاہیے۔"[۵۳]

پروفیسر ثریا حسین کی کتاب "گارسیں دتاسی اردو خدمات علمی کارنامے" سنہ ۱۹۸۴ء کے مطابق گارسیں دتاسی نے اپنی کتاب "ہندوستانی مبادیات" سنہ ۱۸۳۳ء کے ضمیمے میں وہ خطوط درج کیے ہیں جن پر تاریخ تحریر درج ہے۔ ان میں ۱۸۳۱ء کا تحریر کردہ راجہ رام موہن رائے کا خط اور ۱۸۱۸ء کا تحریر کردہ شیخ غلام محی الدین کا خط بھی شامل ہے۔ اٹھارواں خط جس کے کاتب افتخار الدین علی خاں شہرت ہیں۔ جنوری ۱۸۱۰ کا لکھا ہوا ہے۔ اس خط کے متعلق ثریا حسین لکھتی ہیں:

"مکتوب نگار کا نام افتخار الدین علی خاں ہے۔ اور پتہ "کولوٹولہ حویلی نواب واثق خاں صاحب کلکتہ" ہے یہ خط جنوری ۱۸۱۰ میں لکھا گیا ہے۔ اور اس میں مکتوب الیہ مولوی صاحب سے درخواست کی گئی ہے کہ ان کے جو انگریز شاگرد ادھر آئیں۔ ان سے مراسلہ نگار کی سفارش کریں۔ افتخار الدین علی خاں بھی بحیثیت منشی فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھا۔"[۵۴]

جنوری ۱۸۱۰ کے تحریر کردہ خط کا نمونہ پیش خدمت ہے:

"ذوق مراسلت کا اور شوق مصافحت کا اتنا نہیں ہے کہ تحریر و تقریر میں گنجائش پائے یا زبان و بیان میں آئے۔ اگر شب رنگ قلم کو اس میدان بے پایاں میں بچھڑنے کا قصد کیجیے اور پائے وہم کلک کی اس صحرائے بے انتہا میں چھوڑ دیجیے تو دور نہیں ہے کہ دوڑتے دوڑتے مست گھڑا ہو کا کر ٹھوکر کھانے لگے اور اڑ جائے بلکہ نزدیک ہے کہ شرم سے عرق عرق ہو کر زمین میں گڑ جائے۔"[۵۵]

اس طرح قدامت کے لحاظ سے اردو کے پہلے مکتوب نگار کی حیثیت سے افتخار الدین علی خاں کا نام آتا ہے۔

تحقیق کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ تحریروں کی تقدیم و تاخیر کا تعین سنہ تحریر کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو کے اس قدیم رقعہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو پروفیسر مختار الدین آرزو کی دریافت ہے اور "واقعات اظفری" میں درج ہے۔

مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت اظفری دہلوی، شاہ عالم کے ہم جد اور معاصر تھے۔ ۱۱۷۲ھ میں

قلعہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں نشوونما اور تعلیم و تربیت پائی۔ تیس سال قلعہ کے اندر قید سلاطین میں گذرے آخر ایک رات قلعے سے بھاگ نکلے اور مختلف ریاستوں میں قیام کرتے ہوئے مدراس پہنچے۔ اظفری متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ترکی، فارسی، عربی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کی اہم تصنیف ''واقعات اظفری'' ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی، خاص طور سے قلعۂ دہلی چھوڑنے کے بعد کی مہم، مختلف مقامات کے قیام اور تجربوں کا ذکر کیا ہے۔ ''واقعات اظفری'' ۱۲۳۱ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ اس میں مصنف نے شہزادوں اور دوسرے امراء کے وہ فارسی شقّے اور خطوط بھی نقل کر دیے ہیں جو قلعہ چھوڑنے کے بعد انھیں لکھے گئے۔ سلیمان شکوہ اور مرزا اسکندر شکوہ کے متعدد شقّے ہیں۔ اور ان عرضیوں کی نقلیں ہیں جو بادشاہ سلامت اور ولی عہد بہادر کے حضور میں ۱۲۱۶ھ میں بھیجی تھیں۔ ''واقعات اظفری'' فارسی میں لکھی گئی۔ جو اب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس کا اردو ترجمہ دانش گاہ مدراس سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مترجم نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''واقعات اظفری'' کا ایک نسخہ لندن میں ہے اور دو نسخے مدراس میں ہیں۔[6]

پروفیسر مختارالدین آرزو نے اس کا ایک نسخہ جرمنی کے کتب خانے میں ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس وقت ''واقعات'' کا وہ نسخہ پیش نظر ہے جو کبھی ڈاکٹر اشپرنگر کے کتب خانے میں رہ چکا ہے۔ اور جس کا ذکر ان کی مرتب کردہ فہرست میں موجود ہے۔ (فہرست اشپرنگر: ۲۸) یہ نسخہ پھر برلین کے شاہی کتب خانہ میں پہنچا (فہرست برلین: ۴۹۱) اور اب دانش گاہ ٹوبنگن (جرمنی) میں محفوظ ہے۔ اس کا سال کتابت ۱۲۲۷ھ ہے۔ اس کا نمبر وہاں Sprenger: ہے۔ اس نسخے کے وجود کا واقعات کے مترجمین کو علم نہیں۔''[7]

''واقعات اظفری'' میں درج قابل ذکر رقعہ وہ ہے۔ جو اردو زبان میں شاہی خاندان کی ایک بیگم نے تحریر کیا تھا۔ یہ فقیرہ بیگم تھیں جو مرزا[8] مغل اور مرزا اظفل[9] کی حقیقی بڑی بہن تھیں۔ اظفری نے ان سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''آں ہر دو مغل، اظفل دونوں رشتے میں راقم کے چچا ہوتے ہیں۔''[10]

مرزا مغل اور مرزا اظفل کی بڑی بہن فقیرہ بیگم کے تحریر کردہ خط میں جس کے مکتوب الیہ مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت اظفری دہلوی ہیں۔ تاریخ گیارہ رجب درج ہے۔ سال تحریر درج نہیں ہے۔ واقعات اظفری میں شامل یہ رقعہ مع عنوان پیش خدمت ہے:

''نقل رقعہ فقیرہ بیگم صاحبہ خواہر کلاں حقیقی میرزا مغل اور میرزا اظفل کہ از خط خاص ایشان در ''زبان اردو'' بنام راقم رسید۔''

''از یں جانب بعد سلام و اشتیاق تمام کے معلوم فرماویں کہ آپ ہمشیرہ صاحب سے ملاقات فرما کر جو اس سمت تشریف فرما ہوئے ہیں اسی دن سے اپنی خیریت کی خبر سے یاد و شاد نہیں فرمایا، کہ دل ہمارا تمہاری خیریت کا نگراں ہے۔ امید ہے کہ روحی قدیم کو یاد فرما کر اپنی خیریت کی خبر سے اطلاع بخشو، جو خاطر اپنی جمع ہو۔''

از طرف برخوردار ان من کہ اس معلوم است سلام بہ قبول باد از ہمشیرہ صاحب نیز زیادہ چہ۔ ''محررہ یازدہم رجب المرجب سنہ الیہ۔''[11]

''واقعات اظفری'' میں واقعات تاریخی ترتیب سے درج کیے ہیں۔ اس لیے قریب بہ یقین ہے کہ اس رقعہ کا سال تحریر ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء ہے۔''[12]

اس طرح مختارالدین آرزو کے بیانات کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ خطوط میں اردو کا اب تک دستیاب شدہ سب سے قدیم خط ۱۸۰۳ء کا تحریر کردہ یہی خط ہے جس کی مکتوب نگار فقیرہ بیگم ہیں۔

■❖■

حواشی

۱۔ اطراف غالب۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ صفحہ ۲۳۸، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۳ء

۲۔ فرہنگ آصفیہ۔ مرتب سید احمد دہلوی۔ جلد اول۔ صفحہ ۸۶۱، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۸

۳۔ فیروز اللغات۔ مولف مولوی فیروزالدین۔ صفحہ ۱۳۲۶، انجم بک ڈپو، دریا گنج نئی دہلی ۲۰۰۳ء

۴۔ فرہنگ آصفیہ۔ مرتب۔ سید احمد دہلوی، جلد اول ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۵۔ وجہی سے عبدالحق تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۲۹۵-۲۹۴ مکتبہ خیابان ادب لاہور ۱۹۷۷ء

۶۔ مقدمہ مولوی عبدالحق تالیف مکتوبات حالی۔ مرتب سجاد حسین صفحہ ۱۰۔ ۱۹۲۵

۷۔ تنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ صفحہ ۹۳۔ ۱۹۵۵

۸۔ مہدی افادی۔ مکاتیب مہدی۔ صفحہ ۱۸۵

۹۔ خطوط غالب۔ خلیق انجم۔ صفحہ ۱۳۲

۱۰۔ تنقیدیں۔ خورشید السلام صفحہ ۹۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۱۹۵۷

۱۱۔ وجہی سے عبدالحق تک۔ سید عبداللہ۔ صفحہ ۲۹۵

۱۲۔ تنقیدیں۔ خورشید السلام صفحہ ۸

۱۳۔ خطوط غالب۔ خلیق انجم۔ صفحہ ۱۳۱

۱۴۔ آواز دوست۔ مرتب۔ صغرا مہدی۔ صفحہ ۱

۱۵۔ اردو خطوط نگاری ایک مطالعہ۔ نسرین ممتاز بصیر۔ صفحہ ۱۹

۱۶۔ مکتوب نگاری کا فن۔ مسکین علی حجازی۔ صفحہ ۱۳ مقتدرہ قومی زبان پاکستان ۱۹۸۹ء

۱۷۔ تعارف جگر کے خطوط بحوالہ علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، ص ۲۱۲، مکتبہ فردوس مکارم نگر، لکھنؤ ۱۹۸۵ء

۱۸۔ مقدمہ مکاتیب جمیل۔ ربیعہ سلطانہ۔ صفحہ ۴ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۹ء

۱۹۔ رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے۔ نیر مسعود صفحہ ۳۰۹

۲۰۔ مکتوب نگاری کا فن۔ مقالہ نما۔ خلیق انجم۔ صفحہ ۹۵

۲۱۔ وجہی سے عبدالحق تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ صفحہ ۲۹۳ مکتبہ خیابان ادب ۳۹ چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷

۲۲۔ مقدمہ مکاتیب جمیل۔ صفحہ ۱۲

۲۳۔ خط بنام تفتہ۔ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ خطوط غالب صفحہ ۱۳۵

۲۴۔ ایضاً ۵ مارچ ۱۸۵۷ خطوط غالب۔ صفحہ ۱۵۲

۲۵۔ خط بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر۔ ۲۱ اکتوبر ۱۸۵۸

۲۶۔ علم و ادب میں خطوط کا درجہ غلام رسول مہر نقوش مکاتیب نمبر جلد اول صفحہ ۱۲، ۱۹۵۷

۲۷۔ وجہی سے عبدالحق تک سید عبداللہ۔ صفحہ ۲۹۳

۲۸۔ پیش لفظ۔ دامان باغباں۔ مرتب۔ قرۃ العین حیدر

۲۹۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول، مرتب: سید مظفر حسین، میری، ص ۲۹، اردو اکادمی دہلی، اشاعت چہارم ۱۹۹۳

۳۰۔ روشن چراغ (اردو ترجمہ قرآن) مولانا شیخ محمد خاں جالندھری، ص ۳۰۷

۳۱۔ بحوالہ اردو میں ادبی خطوط نگاری کی روایت اور غالب۔ بیگم نیلوفر، ص ۳۵

۳۲۔ مقدمہ مکاتیب مہدی۔ مرتب مہدی بیگم، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

۳۳۔ مقدمہ غالب کے خطوط، ص ۱۳۲، اشاعت اول ۱۹۸۲، ص ۴

۳۴۔ تجزیہ و تجربہ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۹، ص ۳۳۵

۳۵۔ فارسی نثر کی تاریخ، ڈاکٹر ذبیح اللہ، ص ۱۴۳ مطبع اعلیٰ پریس، ۱۹۸۱ء

۳۶۔ حافظ شیرازی کے دو قدیم ترین ماخذ، ڈاکٹر نظیر احمد، رسالہ فکر و نظر، جنوری ۱۹۷۴

۳۷۔ کوکب، ڈاکٹر مسعود انور علوی، ص ۲۵ لکھنؤ ۱۹۸۶ء

۳۸۔ غالب کے خطوط خلیق انجم، ص ۲۰۵، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی

۳۹۔ داستان تاریخ ادب حامد حسن قادری، ص ۱۳۱، عزیز پریس، آگرہ ۱۹۵۷ء

۴۰۔ غالب کے خطوط، ص ۱۰۷-۱۰۸

۴۱۔ اردو خطوط نگاری: ایک مطالعہ، ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر

۴۲۔ اطراف غالب، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۲۹۷، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۴ء

۴۳۔ انشائے سرور، مرتبہ مرزا احمد علی، ص ۱۹، خط نمبر ۱۵، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ

۴۴۔ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات، کوکب قدر سجاد علی مرزا، ص ۵۲۹، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ غالب کے خطوط، ص ۱۳۳

۴۷۔ (الف) احسن مارہروی، تاریخ نثر اردو (حصۂ اول) ص ۶۹

(ب) مہیش پرشاد (دیباچہ خطوط غالب)

(ج) مالک رام، ماہنامہ جامعہ نئی دہلی۔ ص ۱۷۶، مارچ ۱۹۳۲ء

(د) آفاق حسین آفاق۔ نادرات غالب ص ۴۳

(ہ) حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو حصہ اول ص ۳۱۷

(و) خواجہ الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۱۶۵ تا ۱۶۷

(ز) غلام رسول مہر، مقدمہ خطوط غالب ص ۱۸

(ح) قاضی عبدالودود۔ سہ ماہی العلم، کراچی غالب نمبر، ص ۳۷۵

(ط) خلیق انجم، غالب کے خطوط حصہ اول، ص ۴۳۳

۴۸۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ماہنامہ نگار نومبر ۱۹۳۳ ص ۱۹۔۲۰

۴۹۔ دور جدید کے اردو خطوط کا مجموعی جائزہ، غیر مطبوعہ عبداللطیف اعظمی

۵۰۔ ایضاً ص ۶

۵۱۔ عبداللطیف اعظمی، رسالہ "روشن" بدایوں ص ۷

۵۲۔ مکاتیب احسن، مرتب عنوان چشتی، صفیر احسنی، کوہ نور پریس دہلی، ستمبر ۱۹۷۷

۵۳۔ غالب اور شاہان تیموریہ ص ۱۲۶

۵۴۔ مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء غیر مطبوعہ خواجہ احمد فاروقی

۵۵۔ گارسین دتاسی اردو خدمات علمی کارنامے۔ ثریا حسین ص ۱۲۵۶ تر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۴

۵۶۔ ایضاً ص ۵۷۔۲۵۶

۵۷۔ دیباچہ۔ واقعات اظفری۔ ص ۱

۵۸۔ اردو کا ایک قدیم رقعہ۔ علی گڑھ میگزین۔ ۱۹۶۵ ص ۳۹۔۳۸

۵۹۔ مرزا مغل کا نام محمد اکرام الدین اور مرزا اظفل کا نام محمد عبدالمقتدر تھا۔ یہ دونوں شہزادے محمد

علاء الدولہ بہادر عرف مرزا بابا کے صاحب زادے تھے۔ علاء الدولہ، شہزادہ محمد اعزاز الدین کے فرزند تھے۔ اور اعزاز الدین، عالم گیر ثانی شاہ دہلی کے چھوٹے بھائی تھے۔

۶۱۔ واقعات اظفری۔ مترجم۔ عبدالستار ص ۱۲۶ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی مارچ ۱۹۳۷

۶۲۔ اردو کا ایک قدیم رقعہ۔ علی گڑھ میگزین، ۱۹۶۵، ص ۳۸۔۴۷



باب دوم

اُردو میں اُردو مکتوب نگاری کے ابتدائی نقوش

- مرزا محمد قتیلؔ
- غلام امام شہیدؔ
- نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات
- رجب علی بیگ سرورؔ
- غلام غوث بے خبرؔ
- مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

اردو میں ابتدائی دور کے مکتوب نگاروں کے خطوط کا مطالعہ اس لیے اہم ہے کہ زبان میں جو عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا اندازہ ہو سکے۔ خطوط صرف کسی انسان کی شخصیت کا آئینہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس ملک کی تہذیب و معاشرت، ثقافتی اقدار اور سماجی و اقتصادی مسائل کے ساتھ لسانی نقطۂ نظر سے زبان میں جو عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی ہیں ان سے بھی روشناس کراتے ہیں۔

ابتدائی دور کے مکتوب نگاروں اور مکاتیب کے مجموعوں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن اس مرحلے میں ابتدائی دور کے ان نمائندہ مکتوب نگاروں کے مکاتیب کا مطالعہ مقصود ہے جن کو مکتوب نگاری کے ابتدائی نقوش کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس صنف کے مکتوب نگاروں میں مرزا محمد قتیلؔ، غلام امام شہیدؔ، رجب علی بیگ سرورؔ، نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات، غلام غوث بے خبرؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں:

مرزا محمد قتیل

مرزا محمد قتیل فرید آباد کے رہنے والے تھے۔ قوم کے کھتری تھے ان کا نام دیوالی سنگھ تھا۔ مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئے تو ان کا نام محمد حسن رکھا گیا۔ بعد میں مرزا محمد قتیل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۲۴ء میں ہوا۔ مرزا محمد قتیل غلام امام شہید کے استاد تھے۔ فارسی کے شاعر و ادیب تھے۔ مرزا محمد قتیل نے بھی اردو میں خطوط لکھے ہیں۔ ان کے خطوط ان کے شاگرد خواجہ امداد الدین عرف خواجہ امامی نے جمع کر کے ''معدن الفوائد'' کے نام سے شائع کیے۔ خطوط کی اشاعت کے متعلق حامد حسن قادری نے لکھا ہے:

> ''مرزا کے شاگرد خواجہ امداد الدین نے ان کے خطوط جمع کر کے ۱۸۱۷ء میں ''معدن الفوائد'' کے نام سے شائع کیے۔ اس میں مرزا قتیل نے حمد و نعت عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں لکھی ہیں۔ اردو کا نمونہ یہ ہے:
>
> ''بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدا نے برتر نے اپنا پیغمبر کیا اور تمام فاضلوں اور عالموں اور آدمیوں کو اس کی امت کیا۔ سبحان اللہ اس بزرگ رکھوا کا دیکھنے والا ہوں کہ میری ہدایت کی راہ کا دکھانے والا ہے اور سعادت کی منزل کا ..... ہے۔''

حامد حسن قادری کے مطابق مرزا محمد قتیل کے صرف پانچ خطوط اردو میں دستیاب ہیں جو ''معدن الفوائد'' میں شامل ہیں۔ خطوط کی اندرونی شہادتیں کسی حد تک زمانی صورت حال کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

حامد حسن قادری نے ''معدن الفوائد'' کے مرتب ہونے کی تاریخ ۱۸۱۷ء بتائی ہے جس سے

پتہ چلتا ہے کہ یہ خطوط زمانی اعتبار سے ۱۸۱۷ء سے قبل کے تحریر کردہ ہیں۔ اس کے برخلاف نورالحسن ہاشمی نے ماہنامہ جون ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں مرزا محمد قتیل کے اردو خطوط کو شائع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عربی، ترکی اور اردو خطوط اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اس لیے نورالحسن ہاشمی نے اس مضمون کا عنوان ''مرزا قتیل کے غیر مطبوعہ خطوط'' منتخب کیا۔ تمہید میں نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے:

> ''خواجہ امامی نے قتیل کے تمام خطوط جو عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں لکھے گئے ۱۲۳۲ھ میں جمع کر لیے اور خطوط کے اس مجموعے کا نام ''معدن الفوائد'' رکھا۔ اس ''معدن الفوائد'' کے دو قلمی نسخے کتب خانہ پروفیسر مسعود حسین رضوی میں موجود ہیں۔ ویسے ''معدن الفوائد'' طبع ہو چکی ہے لیکن اس میں صرف عربی، ترکی، فارسی میں لکھے ہوئے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ عربی، ترکی اور اردو کے خطوط شامل نہیں ہیں۔'' ع

مرزا محمد قتیل کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں تحریر کیے گئے تھے جب مرزا محمد قتیل کے شاگرد امداد الدین حصول معاش کی خاطر باہر تھے۔ خطوط کی طوالت اور واقعات کا پھیلاؤ یہ ثابت کرتا ہے کہ اپنے شاگرد کی غیر حاضری میں ان کے گھر کے حالات کو تفصیل سے تحریر کیا کرتے تھے تاکہ ان کے شاگرد خود کو اپنے گھر سے دور محسوس نہ کریں۔

خواجہ احمد فاروقی نے مرزا محمد قتیل کے خط کا نمونہ ''بحر الفصاحت'' اور ''جلوۂ خضر'' کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ان کا پیش کردہ خط کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> ''جس کا جی چاہے ہمارے پاس آوے، گھر ہے اس کا اور کوئی آتا آتا یک بارگی رک جائے تو ہم کو کیا غرض۔ اگر یہ چاہے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی آیا کرے تو یہ بات بہت مشکل ہے۔ اس واسطے کہ یہ عاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس گوشے کے بیچ اس طرح ہمارے کہ ہزار بار دروہ کا مل الملک اشتم کا جس کو خلق خدا کی کری کہتی ہے سر پہ سے گزرتا بھی اس جگہ سے اٹھ کر بہت جاوے تو اس دوسرے گھر سے تک جاوے سو بھی دیکھا چاہیے۔'' ع

مرزا محمد قتیل نے بعض خطوط بغیر القاب وآداب کے ہی شروع کر دیے ہیں۔ خطوط کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مکتوب الیہ خواجہ امامی ہیں۔ فارسی کے اس بلند پایہ انشاء پرداز کے خطوط کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قتیل ایک عام فہم زبان میں خطوط لکھنے پر قادر تھے۔ مرزا محمد قتیل کے خطوط کو محفوظ رکھنے کا کوئی مناسب اہتمام نہیں کیا گیا ہے لیکن مرزا محمد قتیل کے یہ پانچ خطوط انھیں اولین دور کے مکتوب نگاروں میں شمار کرانے کے لیے کافی ہیں۔



غلام امام شہید

رجب علی بیگ سرور کے ایک معاصر غلام امام شہید (۱۸۰۲-۱۸۷۹) ہیں۔ مولوی غلام امام شہید شاہ غلام محمد کے بیٹے تھے وہ قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نعت بہت کہتے تھے اسی سبب سے وہ "مداح نبی"، "عاشق رسول" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مرزا محمد قتیل اور مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ فارسی نظم ونثر میں آغا سید اسماعیل مازندرانی سے اصلاح لیتے تھے اور غلام غوث بے خبر کے سسر تھے۔

مولوی غلام امام شہید الہ آباد میں پیش کار کے عہدے پر فائز تھے لیکن ان کی قدر و منزلت چاروں طرف تھی۔ اس لیے حیدرآباد سے چار سو تیس روپیہ سالانہ بطور وظیفہ مقرر تھا جو انھیں آخری عمر تک ملتا رہا۔ لکھنؤ، حیدرآباد، مرادآباد، رام پور میں ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ غلام امام شہید اپنا کلام جمع نہیں کرتے تھے۔ لیکن زمانے کی دست برد سے جو کچھ بچا رہا وہ مجموعہ "میلاد شریف"، "انشائے بہار بے خزاں" اور فارسی میں قصائد وغزلیات وغیرہ شہید کی یادگار ہیں۔ جو کتاب انھوں نے محفل میلاد النبیؐ میں پڑھنے کے لیے تصنیف کی وہ "مولود شریف شہید" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی حامد حسن قادری نے لکھا ہے:

> "یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی اور اتنی مرتبہ چھپی کہ اس کی اشاعتوں کا شمار دشوار ہے۔ آج تک رائج وشائع ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے، ایک ایک شعر سے شہید کا عشق، ولولہ، جوش وشوق، سوز ودرد مترشح ہے۔ سنا ہے جب شہید خود اس کو محفل میں پڑھتے تھے عجب سماں بندھ جاتا تھا۔"[۲]

مولوی غلام امام شہید کی تحریروں سے متعلق سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:

"آپ کی تحریر پرانے زمانے کے رنگ کی تھی یعنی قافیہ پیمائی اور رنگینی سے عبارت خالی نہیں، پھر بھی سلاست اور دلچسپی ہاتھ سے نہیں جانے پائی۔ بیان میں شاعرانہ تصرف ضرور ہے لیکن زور بھی کافی ہے۔ تاج گنج کے روضہ پر جو مضمون لکھا ہے وہ اس رنگ کے لحاظ سے بہترین ہے، مگر فطری عنصر تصنع اور مبالغہ کے پردے میں رہ جاتا ہے۔" [5]

مولوی غلام امام شہید کے مکاتیب کا مجموعہ "انشائے بہار بے خزاں" کے نام سے ۱۸۶۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ میرے پیش نظر مجموعہ ۱۸۸۹ء کا شائع شدہ ہے۔ یہ مجموعہ منشی نول کشور کے چھاپا خانے میں چھپا تھا۔

'انشائے بہار بے خزاں' میں جو خطوط شامل ہیں وہ خط نویسی سکھانے کے لیے تصنیف کیے گئے تھے۔ جس کی وضاحت مولوی غلام امام شہید نے شروع میں ہی کر دی ہے کہ یہ خطوط انھوں نے صرف خط نویسی سکھانے کے لیے لیفٹیننٹ گورنر جیمس ٹامس کے حکم کی تعمیل میں تصنیف کیے ہیں۔ شہید لکھتے ہیں:

"حکم امیر حاتم بے نظیر نواب مستطاب جناب ایل جیمس ٹامس صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے حضور سے حکم پہنچا کہ انشا مختصر کر لڑکے اس کو سمجھیں اور اس سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم پاویں اردو میں تیار ہو۔ ہر چند کہ فقیر کے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر کسی نظم خواہ نثر فارسی کی فرمائش ہوتی ہے تو وہ زیادہ تر مناسب حال فقیر کے تھی لیکن بجا لانا حاکم کے حکم کا جان کر اور یہی اوراق لکھ کر اس کے چار باب مقرر کیے اور 'بہار بے خزاں' اس کا نام رکھا۔ پہلا باب نظم و نثر کے بیان میں، دوسرا باب بعض دستورات اور خطوط کے قاعدوں کے بیان میں، تیسرا باب رقعات ہیں۔ چوتھے باب میں دستاویزوں کا حال اور ہر ایک کی مثال کے جاننا اس کا لڑکوں کو ضروری ہے۔ خدا قبول فرماوے اور لڑکوں کو نفع اس سے پہنچا دے۔" [6]

خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مقالہ "مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا" میں جو ۱۹۵۳ء میں لکھا گیا۔ اس میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خطوط اصلی ہیں۔ حالانکہ خطوط کو اس وقت اصلی قرار دیا جاتا جب وہ کسی کو لکھے اور بھیجے گئے ہوتے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے غلام امام شہید کے خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"شہید نے اردو مکتوب نگاری کی بنیاد ہی فارسی انشا پر رکھی تھی۔ انھوں نے خط کو ارکان خط کے حصار میں باندھ کر بالکل بے اثر بلکہ مہمل بنا دیا ہے۔ "انشائے بہار بے خزاں" میں خطوط کے جو نمونے دیے گئے ہیں ان میں صرف عبارت آرائی ہے۔ نثر میں شاعری کی گئی ہے اور کثرت مترادفات نے خط کو بے اثر بنا دیا ہے۔ جس طرح شمالی ہند میں اردو شاعری کو ایہام کے خارزاروں سے گزرنا پڑا تھا۔ اسی طرح اردو مکتوب کو فطری حسن حاصل کرنے کے لیے تصنع، بناوٹ اور طرح طرح کی شعبدہ بازیوں سے گزرنا پڑا۔" [7]

خلیق انجم کے اس بیان کی مخالفت میں عبداللطیف اعظمی نے اس طرح لکھا ہے:

"خلیق انجم کی یہ کڑی تنقید اس وقت صحیح معلوم ہوتی جب یہ اصلی خط ہوتے۔ یہ بے چارے شہید نے محض حکم کی تعمیل میں بادل ناخواستہ، انشا کی تعلیم کے لیے زمانے کے رواج اور مذاق کے مطابق آج سے ایک صدی ۱۰ سال پہلے، اردو کے مقبول اور محبوب انداز میں رنگین بیانی اور لفظی آرائش کے ساتھ پر تکلف اور پر تصنع و مسجع عبارت میں غالب کے پہلے مجموعہ خطوط "عود ہندی" کی اشاعت سے بھی دو سال قبل اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔" [8]

مجموعہ "انشائے بہار بے خزاں" ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحہ نمبر تین سے "پہلا باب نظم اور نثر کے بیان میں" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جس میں پہلے شعری اصناف کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہر صنف کی مثال دے کر سمجھایا ہے۔ اس کے بعد "دوسری فصل نثر کے بیان میں" کے عنوان سے صفحہ نمبر ۲۰-۲۱ پر درج ہے۔ دوسرا باب خط و کتابت کے طریقہ پر مشتمل ہے۔

غلام امام شہید لکھتے ہیں:

''فارسی اور عربی کی کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا اور داستان اور کہانیاں عجیب و غریب لکھی گئیں اور لکھی جاتی ہیں اور خط و کتابت کا دستور اردو میں اب تک جاری نہیں ہوا پھر اب اگر کوئی زبان اردو میں اس کا رواج دینا چاہے تو جس طرح نظم اور نثر فارسی کے طور پر جاری ہوئی اسی طرح خط و کتابت کا بھی فارسی کے طور پر جاری ہونا ضروری ہوگا اور فارسی میں جو خط لکھنے کے قاعدے مقرر ہیں نا چار اردو میں بھی اسی کا تابع ہونا پڑے گا یہاں سے معلوم ہوا کہ جس طرح فارسی میں بڑے اور چھوٹے اور برابر والے کو خط لکھتے ہیں اسی طرح اردو میں بھی خواہ نخواہ لکھنا ہوگا۔''[9]

دوسرے باب کی پہلی اور دوسری فصل میں مکتوب نگاری کے ارتقا اور اس کے فن پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ صفحہ نمبر اکتیس سے خطوط کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ خطوط غلام امام شہید نے خط نگاری سکھانے کی غرض سے تصنیف کیے تھے۔ پہلا خط ''ہم سفر'' کے عنوان سے درج ہے۔ خط کی مثال ملاحظہ کیجیے:

''مولوی صاحب شفیق مکرم و معظم زاد لطفہ بعد سلام اور نیاز اور اشتیاق ملاقات مسرت آیات کے کہ بیان سے باہر ہے مطلب لکھتا ہوں کہ نامہ آپ کے پہنچنے سے دل کو نہایت خوشی حاصل ہوئی۔ مضمون اس کا بخوبی سمجھا گیا۔ اس کے پہلے کلفی نے بھی نیاز نامہ بھیجا ہے ملاحظہ ہوا ہوگا۔ اب میر صاحب مشفق میر نیاز علی صاحب حاضر ہوتے ہیں پانچ ہزار روپے میر صاحب موصوف کے ہاتھ لطف فرمایئے بعد بندہ حاضر ہو سکتا ہے نہیں تو آپ ہی تشریف لایئے زیادہ کیا قصہ بڑھاؤں فقط۔''[10]

اس کے بعد الگ الگ عنوان سے حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے خط نویسی سکھانے کے مقصد سے خطوط درج ہیں۔ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو جواب طلب اور خط کے جواب میں لکھے ہونے کے علاوہ ''غیر جوابی خط'' کے عنوان سے بھی درج ہیں۔

''انشائے بہار بے خزاں'' کی تیسری فصل میں غلام امام شہید نے کچھ ایسے خطوط بھی لکھے

ہیں۔ جن میں کچھ صنعتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ایسے خط کی مثال پیش خدمت ہے جس میں ہندی کے سوا کوئی بھی لفظ عربی اور فارسی کا نہیں ہے۔

''بھائی میرے جیتے رہو جب سے تم گھر سدھارے میرا جی بہت بے چین رہتا ہے۔ زندگی میں اداس بیٹھا رہتا ہوں میں تو بہتیرا چاہتا ہوں کہ یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں پر کیا کروں یہی سوچ رہتا ہوں کہ جاؤں تو کہاں جاؤں اور ہوں تو کچھ نہیں مانتا کہ بڑا اندھیرا ہے کہ تمھیں نہ دیکھوں اور جیتا رہوں اب مجھے جینے کا آسرا نہیں ہے آگے اس کے کیا لکھوں۔''[11]

اسی طرح ایک ایسا خط بھی درج ہے جس میں ہندی اور فارسی کے سوا عربی کا کوئی لفظ نہیں، خط جس میں ہندی اور عربی کے سوا فارسی کا کوئی لفظ نہیں، خط جو الف سے خالی ہے اس کی مثال ملاحظہ کیجیے:

''ہندی پرور جس دن سے ہم لکھنؤ پہنچے دلی کی کچھ خبر بھی معلوم ہوتی نہیں طبیعت ہر وقت بے لطف متعلق رہتی ہے۔ دوستوں کی محبت بزرگوں کی شفقت کسی وقت نہیں بھولتی دیکھیے یہ سفر کی تکلیف کب تک ہے جس مطلب کے لیے گھر سے نکلے معلوم نہیں کب ہو وطن کب تک پہنچیں۔''[12]

اسی طرح ایک خط ایسا بھی ہے جس میں 'ب' کا حرف نہیں آیا اس کے علاوہ ایسا خط بھی درج ہے جس کے پڑھنے میں ہونٹ سے ہونٹ نہیں ملتا۔ مثال پیش خدمت ہے:

''تعطیل کی دن نزدیک آنے اور روانگی کا عرصہ قلیل رہ گیا اس واسطے اور گھوڑے اور بیج گاڑی آگے سے روانہ کی جاتی ہے لیکن شوال کی اکیسویں تاریخ آدھی رات کو آگرہ سے سوار ہو کر آٹھویں دن وہاں داخل ہوگا اطلاع کے واسطے لکھا ہے۔''[13]

مندرجہ بالا خطوط کے نمونے کے علاوہ جن عنوانات کے تحت خطوط درج ہیں وہ اس طرح ہیں مثلاً ''صفت منقوطہ''، ''رقعہ غیر منقوطہ''، ''ایک حرف منقوط ایک حرف غیر منقوطہ''، ''رقعہ جس میں سب نقطے نیچے (تحت النقاط) ہیں''، ''رقعہ جس میں سب نقطے اوپر (فوق النقاط)''، ''رقعہ نظم اور

نثر دونوں میں پڑھا جاتا ہے۔

"انشائے بہار بے خزاں" میں شامل خطوط میں غلام امام شہید نے کئی صنعتوں کا استعمال کیا ہے لیکن اکثر خطوط صنعتوں سے خالی ہیں۔ ایک ایسے خط کی مثال پیش ہے جس میں غلام امام شہید نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے خط کو غیر موثر بنا دیا ہے:

"مشفق میرے جس دن سے آپ کلکتے تشریف لے گئے لکھنؤ کا شہر میری آنکھوں میں اجاڑ اور گھر مجھے ایک کالا سا پہاڑ معلوم ہوتا ہے اور بیٹھتا ہوں تو جگر میں درد بے اختیار ایسا اٹھتا ہے کہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں تو تنہائی سے گھبرا کر چار بیٹھ جاتا ہوں رونگا رونگا بدن میں نشتر چبھتا ہے اور کلیجہ آٹھ پہر آگ کے انگارے کی طرح جھلستا ہے کھانا پینا چھوٹ گیا اور دل کے زخم کا ٹانکا ٹوٹ گیا، نیند تو خواب میں بھی صورت نہیں دکھاتی اب موت بھی مجھ سے آنکھ چراتی ہے دن کو بے پانی کے مچھلی کی طرح تڑپتا ہوں رات کو کروٹیں بدل کر کانٹوں پر لوٹتا ہوں۔" ۲۴

چوتھی فصل خطوط نویسی کے ضروری قاعدوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ پہلے قاعدے میں مختصر اور نصیحت دینے والے خطوط درج ہیں جس میں جگہ جگہ لطائف کا استعمال کر کے خطوط کی لطافت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لطائف کے برمحل استعمال سے خطوط پڑھتے وقت ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ کچھ لطائف کی مثال ملاحظہ کیجیے جس کا استعمال غلام امام شہید نے "انشائے بہار بے خزاں" کے خطوط میں کیا ہے:

"لطیفہ کہ ایک چڑیا کسی زمین دار کے باغ میں جا کر کچے پکے میوے سب کاٹ جایا کرتی تھی، زمین دار ہمیشہ اوس کی تاک میں تھا ایک دن انگور کی ٹٹی پر جال لگا کر پکڑا اور ذبح کرنے کا ارادہ کیا چڑیا نے زمین دار سے کہا جو تو مجھ کو چھوڑ دے تو میں اس احسان کے عوض تجھ کو تین باتیں بتادوں کہ اوس میں تجھ کو بڑا فائدہ ہوگا زمین دار نے کہا تو پہلے بتا دے تو میں تجھ کو چھوڑ دوں۔ چڑیا نے اوس کو تین نصیحتیں کیں ایک یہ کہ حریف جو اپنے قابو میں آجائے تو چھوڑنا چاہیے۔ دوسری

بات جو قیاس سے باہر ہو یقین نہ لانا چاہیے۔ تیسری گئی ہوئی چیز کے واسطے افسوس بے فائدہ ہے اور چوتھی ایک بات اور ہے کہ جب تو مجھے چھوڑ دے گا تب کہوں گی زمین دار نے بعد سننے ان نصیحتوں کے موافق اقرار کے اوس کو چھوڑ دیا تو چڑیا نے دیوار پر بیٹھ کر کہا کہ میرے پیٹ میں بیضہ مرغ سے بڑا ایک موتی تھا اگر تو مجھے نہ چھوڑتا اور ذبح کرتا تو وہ موتی تیرے ہاتھ آتا۔ زمین دار افسوس کرنے لگا اوس نے کہا کہ اے سادہ لوح تو میری تینوں نصیحتیں اسی وقت بھول گیا کس واسطے کہ میں تیری حریف تھی جب پکڑ پایا تھا تو چھوڑ دیا کیا تھا اور بیضہ مرغ کے برابر تو میں تول ہی نہیں ہوں تو پھر بیضہ مرغ سے بڑھ کر موتی میرے پیٹ میں ہونا بالکل خلاف قیاس ہے مگر تو نے اس پر اعتبار کیا اور اب جو میں تیرے ہاتھ سے نکل گئی تو اب افسوس کرنا محض لا حاصل ہے فقط غرض یہ کہ جو ہونا تھا سو ہوا اب اوس تقصیر کی تلافی اور افسوس کرنا محض بے فائدہ ہے آئندہ احتیاط کرو۔" ۲۵

ایک اور لطیفہ ملاحظہ کیجیے:

"لطیفہ ایک شاعر نے کسی امیر بخیل کے پاس جا کر کہا کہ تو نے کچھ مال محتاجوں کے واسطے نکالا ہے اوس میں سے مجھے بھی کچھ دے کہ میں محتاج ہوں۔ امیر نے کہا کہ وہ مال صرف اندھوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ شاعر نے کہا کہ اس صورت میں تو میں ہی اوس کا مستحق ہوں کس واسطے کہ حقیقت میں اندھا ہوں اگر اندھا نہ ہوتا تو خدا کا دروازہ چھوڑ کر تیرے در پر کیوں آتا۔ امیر کو یہ کلام پسند آیا اور وہ مال اوس کو دے دیا۔ دیکھو وہ درویش جو جاہل تھا اوس کو اوس کی گفتگو نے خفیف کیا اور یہ شاعر جو عاقل اور قابل تھا تو اوس کی تقریر نے امیر کو شرما دیا۔ دانش مند کے واسطے اسی قدر اشارت کافی ہے۔ ایضاً نورچشم میرے درباریوں اور مجلسیوں کے واسطے حاضر جوابی بہت ضرور ہے یعنی بات کا جواب برجستہ اور درست دینا چاہیے اور یہ بات ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی۔ نہ علم

اور نہ کمال پر موقوف ہے۔ بلکہ اس کے واسطے ذہن اور ذکا اور عقل رسا درکار ہے۔ چنانچہ طبیعت کی رسائی اور نارسائی کا حال دونوں لطیفوں سے واضح ہوسکتا ہے۔" ۱۵

"ایک شخص نے طبیب سے کہا کہ میرا پیٹ دکھتا ہے۔ طبیب نے پوچھا آج کیا کھایا تھا۔ کہا کہ جلی روٹی کھائی تھی۔ طبیب نے سرمہ دیا اور کہا کہ آنکھوں کا معالجہ پہلے کرنا چاہیے کس واسطے کہ آنکھ اچھی ہوتی تو جلی روٹی نہ کھاتا۔" ۱۶

"لطیفہ: کسی بادشاہ نے ایک عالم کو بلوایا اور یہ بھی لکھا کہ جو آپ کو فرصت نہ ہو تو کوئی شاگرد ہی اپنا روانہ کیجیے۔ انھوں نے ایک طالب علم بھیج دیا اور چلتے دم سمجھا دیا کہ بادشاہوں کے دربار میں نرم گفتاری اور شیریں کلامی سے ضرور ہے۔ طالب علم دربار میں حاضر ہوا اور بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارے استاد کے یہاں کس کس علم کا درس جاری ہے۔ جواب دیا روئی، ریشم، مخمل۔ پوچھا کہ اوقات کس طرح بسر ہوتی ہے۔ جواب دیا لڈو، پیڑا، امرتی۔ بادشاہ نے ان جوابوں سے متحیر ہو کر فرمایا کہ شاید اس شخص کو مالیخولیا کی بیماری ہوگی۔ ناچار عالم کو یہ سارا ماجرا لکھ کر رخصت کیا۔ عالم نے جو سبب ایسی بات کرنے کا پوچھا تو کہا کہ آپ نے نرم اور شیریں کلامی کرنے کا حکم دیا تھا سو میں نے ریشم اور روئی اور مخمل سے زیادہ نرمی اور لڈو پیڑا امرتی سے زیادہ شیرینی اور کسی چیز میں نہ پائی اس واسطے ایسا کلام کیا۔

لطیفہ: ایک جاہل نے پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ بادشاہ نے اسے پکڑ بلوایا اور پوچھا کہ تو جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے تو معجزہ کیا دکھلاتا ہے۔ کہا دل کی بات بتا دیتا ہوں۔ بادشاہ نے پوچھا کہ میرے دل میں اس وقت کیا ہے۔ کہا کہ اس وقت آپ کے دل میں یہی ہے کہ میں بالکل جھوٹا ہوں۔ فرمایا کہ ایسا دعویٰ کیوں کیا۔ کہا کہ جو دعویٰ نہ کرتا تو حاکم تک کس طرح پہنچتا۔ بادشاہ اس کے جوابوں سے بہت خوش ہوئے۔ خلعت اور انعام دے کر رفاقت میں نوکر رکھا۔

دوراندیش کے لیے اتنا ہی لکھنا کفایت کرتا ہے۔

واضح ہو کہ تلازمہ صنعت میں داخل ہے اور تلازمہ اس صنعت کا نام ہے کہ کسی چیز کو فرض کر کے اس کے سارے یا بعضے لوازم کو دوسرے مطلب میں ادا کریں اور یہ ادا کرنا ایسی خوبصورتی اور خوشنمائی کے ساتھ ہو کہ اگر دوسرا ناواقف ہو تو یہ نہ جانے کہ کوئی لفظ اس لوازمہ کا بے محل اور بے معنی واقع ہوا۔" ۱۸

"انشائے بہارِ بے خزاں" کے تمام تر خطوط میں عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ہے اور اس طرز نگارش میں وہ کسی سے کم نظر نہیں آتے۔ خطوط کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ نثر میں شاعری کی گئی ہے۔ تخلیق معانی، ایجاد اسالیب اور تزئین بیان کے بہتر نمونے شہید کے نثر میں ملتے ہیں۔ مجموعہ "انشائے بہارِ بے خزاں" میں شامل ایک مضمون "تاج گنج کے روضہ کی تعریف" کے عنوان کے تحت ملتا ہے جو آگرہ کے متعلق بہت مشہور ہے۔ جو اسلوب انھوں نے روضۂ تاج گنج آگرہ کے متعلق مضمون میں اختیار کیا ہے، اس سے محاکات منظر کشی کا کام نہیں لیا جا سکتا بلکہ مدح خوانی کی جاتی ہے۔ قصیدہ سے کسی بادشاہ کی شوکت و عظمت جیسی کچھ باتیں ذہن نشین ہوا کرتی ہیں وہی کام غلام امام شہید کی نثر تاج محل سے متعلق کرتی ہے۔ ان کی نثر ان کے علم و فضل اور صنعت گری کا نہایت نادر نمونہ ہے۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

"تاج گنج کے روضے کی تعریف"

آج قلم کا دماغ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے۔ کاغذ کا صفحہ آنکھ کی سفیدی کی طرح منور ہے۔ نظر کا ڈورا رگِ گل کی طرح پر رنگین ہے۔ نگاہ کا تار رشتۂ گلدستہ کے مانند بہاریں ہے۔ کس واسطے کہ مجھے ایک باغ اور مکان کی صفت لکھنی منظور ہے جس کی سیر سے چشم مردم میں نور ہے۔ اس کے صحن اور دالان میں خدا کی قدرت کا گل کھلا ہے۔ چمن اور سیوان میں صانع کی صنعت کا تماشا ہے۔ وہ کون مکان اور کیسا گلستان جو شاہجہاں ایسے بادشاہ عالی جاہ کا قیام گاہ ہے۔ کون قصر اور کیسا ایوان جو جناب عالیہ بادشاہ بیگم کا آرام گاہ ہے جس جگہ یہ

دونوں آفتاب و ماہتاب ہوتے ہیں۔ چاند اور سورج ان رات اوس زمین کے نثار ہوتے ہیں۔ تاج بی بی کا روضہ جہاں میں مشہور ہے اور ہر چمن اوس کا جنت کی خوشبو سے معمور ہے۔ اکبر آباد کیا بلکہ سارے ہندوستان کی اس مکان سے عزت ہوئی۔ ہندوستان کیا بلکہ تمام روے زمین کی اوس سے زینت ہوئی۔ اس چمن کی ہواے جو گلیوں کی پاوری سے خیال و دماغ معطر کر۔ یا تو باغ کی فضاے نگاہ کے دامن کو گل چیں کے دامن کی طرح پھولوں سے بھر دیا۔ سبحان اللہ! کیا روضہ ہے کہ رضوان جس کے لطف اور لطافت سے راضی اور خوشبو ہے بارک اللہ کیا باغ ہے جس میں بہشت کی ہر نعمت موجود ہے۔ سورج باغ کا ایک ذرہ آتو ہے۔ چاند اس چمن کا گل شبو ہے۔ پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اور سر اوٹھاوے تو اوس کو آفتاب کی پگڑی سنبھالنی مشکل ہو جائے۔ دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ و چوب قلم سے جو لکھا ہے عقل اوس طلسمات سے حیران ہے کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے ویسا ہی دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے مصر انصاف سے دیکھیں یہ بات کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیم کامل ہے۔" 19

"انشائے بہارِ بے خزاں" کی چوتھی فصل کے دوسرے قاعدہ میں مختلف تقریبات مثلاً شادی جیسی تقریبات کے سلسلے میں رقعات لکھنے کا طریقہ بیان کرنے کے ساتھ اس کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

چوتھا باب تحریر دستاویزات کی تعلیم سے متعلق ہے۔ مثلاً غلام امام شہید کے زمانے میں جو دستاویزات مروج تھے ان کی تفصیل اس طرح دی ہے۔ مثلاً تمسک، اقرار نامہ، چِھلک، بیع نامہ، رہن نامہ، ہبہ نامہ، نکاح نامہ، محضر نامہ، مختار نامہ، وکالت نامہ، سرخط، پٹہ، قبولیت، منا مشی، عاریت نامہ، امانت نامہ، تملیک نامہ، رسید، راضی نامہ، صلح نامہ، فیصل نامہ، وصیت نامہ، تقسیم نامہ وغیرہ۔ ان سب دستاویزات کی مثال اور ان کے لکھنے کا طریقہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

"انشائے بہارِ بے خزاں" میں شامل خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہید نے

زمانے رواج اور مذاق کے مطابق، اردو کے مقبول اور محبوب انداز میں، القاب و آداب کی طوالت کے ساتھ، پر تکلف اور پر تصنع، مقفیٰ و مسجع عبارت میں اپنے فن کے جوہر دکھاتے ہیں۔ ان کے اس اسلوب کی وضاحت کے لیے ایک خط کی مثال پیش کی جاتی ہے جو انھوں نے دوست کی شادی اور اس کے والد کے وفات پر لکھے ہیں۔ یہ خط ایک طرف تو تہنیت نامہ کا حامل ہے تو دوسری طرف تعزیت نامہ نظر آتا ہے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

"زمانے میں خوشی اور غم دونوں کا چولی دامن کی طرح ساتھ اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کے طور پر شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ دو پھول ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں۔ ایک دولہا دولھن کے سر کے تاج میں لگاتے ہیں دوسرے کو گور میں پھینک کر دو اس میں ملاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بنتی ہیں ایک محفل رقص کے کام آتی ہے۔ دوسری مردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے۔ چمن میں اگر گل کھلکھلا کے ہنستی اور خوش ہوتی ہے شبنم اوس کے چشمے پر بے اختیار روتی ہے۔ جس باغ میں خزاں ہو وہاں بہار بھی ہے اور جہاں گل ہے وہاں خار بھی ہے۔ بادام کے پوست اور مغز کو دیکھنے کہ تلخی اور تری ایک ہی جگہ موجود اور برف کو سوچیے کہ گرمی اور سردی اوس کے ساتھ ہی موجود ہے۔ سرخی و زردی گل رعنا کی دلیل ہے۔ اس بات پر کہ عالم میں جب تک بنی آدم ہیں خزاں اور بہار دونوں اہم ہیں۔ تقدیر نے اگر صبح کو لباس دن سفید خوشی کا پہنایا تو شام کے واسطے جامہ سیاہ ماتمی بنایا۔ حاصل یہ ہے کہ آپ کے والد ماجد کا عین عید کے دن انتقال فرمانا گویا اسی گردش لیل و نہار اور رنج و راحت اور خزاں بہار کا تماشا دکھانا تھا۔ اس غم نے جتنا رولایا تھا اوتنا ہی آپ کی شادی نے ہنسایا اوس افسوس میں آسمان جو ماتمی لباس پہنے ہوئے نظر آیا تو شفق کی سرخی نے وہیں خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ رنج میں پہلے دو ہنر جوت پر مارا تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اوٹھا کر یوں دعا مانگی کہ خدا اوس مرحوم کو جنت نصیب کرے اور آپ سلامت رہیں اور یہ شادی مبارک ہو بندہ بھی ادائے رسم فاتحہ اور شرکت محفل شادمانی کے واسطے

ضرور ضرور حاضر ہوگا زیادہ والسلام۔" ۲۶

شہید کی اس تحریر پر تنقید کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"اس مضمون کو انسانی جذبات سے قریب رہ کر بات چیت کے طرف میں ادا کیا جا سکتا تھا لیکن مولوی صاحب اپنے زمانے کے خاص انداز میں لکھنے پر مجبور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبارت کی رنگینی، قافیہ پیمائی اور تشبیہ و استعارات کی فراوانی کہیں ہاتھ سے نہیں گئی۔ انسانی جذبات پر تکلفات کے پردے پڑ گئے۔ خوشی اور غم کے ساتھ ساتھ پائے جانے پر جو داد قابلیت دی گئی ہے اس سے تو مضمون تعزیت میں ایک قسم کی کمی پیدا ہوگی۔ قلم کی روانی میں شادی اور وفات کو برابر کا حصہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس صورت میں تقریب پر زیادہ زور دیا جانا چاہیے تھا۔" ۲۷

"انشائے بہارِ بے خزاں" کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعہ میں ایسے خطوط کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جو بہت سادہ سلیس اور رواں زبان میں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بہت ہی مختصر سا خط پیش خدمت ہے:

"بندہ نواز، لالہ صاحب کی تعریف آپ جو کچھ لکھیں سو تھوڑی ہے یہ شخص خلق اور مروت میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اگرچہ بندے کی حاضری کی کچھ ضرورت نہ تھی اور موصی الیہ آپ کے فرمانے سے بھی باہر اور قاصر نہیں ہوتا لیکن موافق ارشاد کے کل چار بجے حاضر ہوں گا اور ہمراہ رکاب چلوں گا زیادہ نیاز۔" ۲۸

"انشائے بہارِ بے خزاں" خطوط نویسی سکھانے کے مقصد سے لکھی گئی تھی۔

غلام امام شہید نے مجموعہ کے دوسرے باب میں خط کے ارکان بتائے ہیں جو ان کے مطابق اس طرح ہیں:

"ارکان خط کے اکیس ہیں یعنی اوستادوں نے خط میں اکیس باتوں کا ہونا ضرور مقرر کیا ہے۔ (۱) مقدمہ القاب، اور (۲) القاب، اور (۳) ادعیہ، اور (۴) آداب، اور (۵) تحیت، اور (۶) اشتیاق، اور (۷) ملاقاتیہ اور

(۸) صفت ملاقاتیہ اور (۹) اظہاریہ، اور (۱۰) خطوں کے نام، اور (۱۱) خطوں کی رسید، اور (۱۲) اورا کیہ، اور (۱۳) کاتب کے نام، اور (۱۴) مکتوب الیہ کے نام، اور (۱۵) دوسرے شخص کی صفت، اور (۱۶) چیز کا بھیجنا، اور (۱۷) چیز کا مانگنا، اور (۱۸) اپنا آنا، اور (۱۹) مکتوب الیہ کا آنا یا جانا، اور (۲۰) مطلب، اور (۲۱) خاتمہ۔ اور اتفاق بعضوں کے نزدیک خط کے ارکان میں داخل نہیں ہے اگر ہو تو بائیس ہوتے ہیں۔" ۲۹

"انشائے بہارِ بے خزاں" کے خطوط میں طول طویل القاب و آداب قدیم طرز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہے جن میں مختصر القاب و آداب کا استعمال کیا گیا ہے۔ خطوط اپنے زمانے کے خاص انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عبارت کی رنگینی، قافیہ پیمائی اور تشبیہ و استعارات کی فراوانی ہے۔ کہیں کہیں اردو اشعار کے استعمال سے خطوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ غلام امام شہید کو مکتوب نگاری کے رجحان مشکل پسندی اور انشا پردازی کے علم برداروں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن ان کے مجموعہ "انشائے بہارِ بے خزاں" میں خط سادہ سلیس اور رواں دواں زبان میں بھی لکھے گئے ہیں۔ اس لیے اردو مکتوب نگاری میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ان کے خطوں کو اردو مکتوب نگاری کے ابتدائی نقوش میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

مجموعہ کے خاتمہ میں غلام امام شہید لکھتے ہیں:

"الحمد للہ کہ اس فقیر خاکسار نے جو ایک دوست یک رنگ اور یکتا سراپا لطف و عطا گنجینۂ فضل و کمال آئینۂ حسن و جمال صاحب علم و ہنر و جوہر فخر ہر فرد بشر سرآمد ظلیاں جادو نگار سر گل سخنوراں شہیں گفتار مخزن لیاقت و قابلیت معدن فصاحت و بلاغت دبیر بے نظیر صاحب تدبیر کریم ابن کریم محب محبوب شہید انجم ضمیر قدر کتاب رموز معانی گلدستۂ بہار حسن والی بے عیب دریا بے لوث پاک دل صاف طینت صفا طینت جناب منشی غلام غوث صاحب زاد اللہ عظمہم کے توسط سے حاکم جلیل القدر قدر افزائے اہل ہنر بحر تا پید کنار شوکت و شان

ابر گوہر بار ہمت و احسان جوہر مرآئینہ مقصود واسطہ پیوند اتحاد و وصل وجود صاحب سیف و قلم عزت چہرہ علم بحر کرم ابر ہم آفتاب چشم ہمایوں شیم فیاض عالم وزیر اعظم دستور مکرم عالی مرتبت والا منزلت ارسطو فطرت سکندر صولت فریدون حشمت افلاطون حکمت جمشید خورشید کلاہ رعیت پناہ کیوان بارگاہ جناب نواب مستطاب آنریبل جیمس ٹامسن صاحب بہادر لیفٹیننٹ گورنر بہادر دام اقبالہم کی فرمائش اپنے زرے ہی تھی سو اس کا انجام بخوبی ہو گیا۔"۳۴



نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات

لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ کی شخصیت پر اختلاف رائے تو ہے ہی ساتھ میں ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات پر بھی مورخ متفق نہیں ہیں۔ کوکب سجاد علی مرزا واجد علی شاہ کی ولادت کے متعلق لکھتے ہے:

> "تاریخ کی کتابوں میں ان کا نام واجد علی شاہ ہے لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا گنج نام محمد واجد علی تھا بعد میں شاہ کی شرکت سے واجد علی شاہ بن گیا۔ سہولت کی خاطر لوگ صرف واجد علی شاہ کہتے ہیں۔ درباری تذکرہ نگار تاب کے نزدیک ولادت کی تاریخ ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۳۳ھ ہے۔ واجد علی شاہ کی خود نوشت اور اکثر دوسرے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاب سے سہو ہوا ہے۔ واجد علی شاہ ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ (۱۹ جولائی ۱۸۲۳) کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔"۳۵

واجد علی شاہ کے والد کا نام امجد علی شاہ اور والدہ کا نام ملکہ کشور تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں ان کی شادی لکھنؤ کے ایک معزز رئیس کی بیٹی عالم آرا بیگم سے ہوئی۔ عالم تخلص تھا۔ نواب خاص محل عرفیت اور نواب بادشاہ محل خطاب تھا۔ اس شادی کے علاوہ واجد علی شاہ نے اور بھی کئی نکاح اور متعہ کیے لیکن جس نکاح کی تاریخ کی کتابوں میں شہرت ہے وہ زمانہ شاہی میں ۱۸۵۱ء میں وزیر زادی نواب رونق آرا بیگم سے ہوا اور بادشاہ نے انھیں اختر محل کا خطاب دیا تھا۔ واجد علی شاہ کی سلطنت کو نو سال ہی ہوئے تھے کہ انگریزوں نے ان پر طرح طرح کے الزام لگا کر معزولی کے اسباب فراہم کیے اور ۱۸۵۶ء میں تخت و تاج سے محروم کر کے کلکتہ بھیج دیا جہاں انھیں اپنی باقی

زندگی جلا وطنی میں گزارنی پڑی۔ واجد علی شاہ کی کتابیں خاص طور سے ان کے مکاتیب جلا وطنی کے اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ واجد علی شاہ کی وفات ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء میں ہوئی۔ اسی تاریخ کو رات گیارہ بجے انتقال سے تقریباً بیس گھنٹے بعد اپنے تیار کردہ امام باڑے سبطین آباد مٹیا برج کلکتے میں دفن کیے گئے۔

انیسویں صدی کا لکھنؤ علم و ادب کا بڑا مرکز تھا۔ اسی لکھنؤ میں تحسین کی نو طرز مرصع لکھی گئی، فسانۂ عجائب کا پسندیدہ اور رائج الوقت نثری اسلوب اسی عہد کا معیاری انداز نگارش تھا۔ اسی لکھنؤ میں واجد علی شاہ کی طرح ان کی تصنیفات بھی شہرت رکھتی ہیں۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط ایک ایسے اسلوب کو پروان چڑھاتے ہیں جو اپنے پیش روؤں سے بہت مشابہت رکھتا ہے لکھنؤ میں مکتوب نگاری کے ایسے نمونے دستیاب ہوتے ہیں جو اپنے طرز فکر کے آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد نثری اسلوب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

انگریزوں نے جب واجد علی شاہ پر الزام لگائے اور ان کی معزولی کے اسباب فراہم کیے تو انھوں نے ہر الزام کا جواب مدلل دیا لیکن ان جوابوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ واجد علی شاہ کی معزولی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس کا اثر ان پر، لکھنؤ پر، اور ان کے متعلقین پر بہت گہرا ہوا۔ کل تک جس کے ۷۰۰ اہل قلم، ۵۰۰ طبیب، ۱۵۰۰ چوب دار ملازم تھے، وہ دفعتہً شہریاری و سروری سے محروم کر دیا گیا اور وطن سے دور دیار غیر میں پھینک دیا گیا۔ جس وقت وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے لکھنؤ سے رخصت ہوئے:

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

تو سننے والوں کے کلیجے شق ہو گئے۔ بچہ، بوڑھا، عورت، مرد، ہندو، مسلمان کوئی ایسا نہیں تھا جو رو نہ رہا ہو۔ ان کی یاد میں غزلیں لکھی گئیں، گیت گائے گئے، ڈھڈے والوں اور بھانڈوں نے اپنے انداز کی نظمیں لکھیں، گلی گلی اور کوچے کوچے میں سنا ئیں کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں عورتیں یہ شعر نہ پڑھتی ہوں:

واجد علی پیارا کلکتے کو سدھارا
سڑکیں نکل رہی ہیں ہوتی گلی گلی ہے ۲۶

واجد علی شاہ کی بہت سی بیگمات ان کے ہمراہ کلکتہ نہ جا سکیں تو بیگمات اور واجد علی شاہ میں صرف خط و کتابت کا ہی تعلق رہ گیا۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کے جو مجموعے دستیاب ہوئے ہیں وہ کسی نہ کسی نام سے موسوم ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کے مجموعوں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

۱) مخزن اسرار سلطانی معروف بہ رقعات بیگمات (قلمی) آصفیہ حیدرآباد دکن
۲) رقعات اہلیہ واجد علی شاہ (قلمی) خدا بخش لائبریری پٹنہ
۳) تاریخ غزال مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ، کتب خانہ پروفیسر مسعود حسین رضوی
۴) تاریخ نور (قلمی) خدا بخش لائبریری پٹنہ
۵) انشراحات روح مطبوعہ مطبع اثنا عشری لکھنؤ، کتب خانہ پروفیسر مسعود حسین رضوی
۶) تاریخ ممتاز مخطوطہ برٹش میوزیم، یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں لاہور سے شائع ہو گئی ہے۔
۷) تاریخ بدر (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن
۸) رقعات بدر مطبوعہ حیدرآباد دکن، یہ تاریخ بدر ہی ہے جس کو نام کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ سید محمد علی عرش ملیح آبادی نے قائم پریس واقع چنچل گوڑہ میں چھپوایا ہے۔
۹) بیگمات اودھ کے خطوط مرتبہ: مفتی انتظام اللہ شہابی مطبوعہ فاروقی پریس دہلی۔ اس میں مرتب نے خطوں کے حوالے نہیں دیے ہیں اور بعض جملے نکال دیے ہیں اور شوقیہ خطوں کے اشعار کم کر دیے ہیں۔" ۲۷

کوکب قدر سجاد علی میرزا نے واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط کے مجموعوں کی تفصیل اس طرح دی ہے:

تاریخ مہذب (۱۲۷۲-۷۳ھ)

مخطوکہ محمد ہادی صاحب، ساکن کڑہ ابو تراب خاں لکھنؤ۔ شیدا بیگم کے نام واجد علی شاہ کے محبت ناموں کا یہ ناقص الطرفین مجموعہ سنہ ۱۹۵۸ء تک محمد ہادی صاحب نامی ایک پریشان حال بزرگ کے قبضہ میں تھا۔ مخطوطہ دو سو روپے میں فروخت کرنا چاہتے تھے۔ مختلف لوگوں نے اسے

دیکھا لیکن کوئی خریدار نہ ہوا۔ ایک صاحب نظر کی دور اندیشی سے اس کی نقل محفوظ ہو گئی۔ اس سلسلے میں کوکب قدر سجاد علی میرزا انھیں موصوف کا بیان بھی درج کیا ہے۔

تاریخ ممتاز (۱۲۷۲-۷۶ھ)

مملوکہ برٹش میوزیم لندن ممتاز بیگم کے نام واجد علی شاہ کے تو دو ناموں کا یہ تاریخی مجموعہ اپنے وطن سے اگرچہ ہزاروں میل دور ہے لیکن مکمل اور محفوظ ہے۔ اہل نظر کی کوششوں نے اسے ۱۹۵۲ء میں لاہور سے شائع بھی کیا۔ اس کے مرتب توقیر ہیں۔

تاریخ غزالہ (۱۲۷۵ھ)

مطبع مفید عام آگرہ، مرتبہ سید وصی بلگرامی۔ سادات بلگرام کے خاندانی کتب خانے میں کچھ قلمی مجموعے واجد علی شاہ کے خطوں کے موجود تھے۔ انھیں میں تاریخ غزالہ بھی تھی۔ مرتب نے بارہ صفحات کی تمہید کے ساتھ اسے شائع کر دیا۔ تمہید کا بیشتر حصہ بادشاہ پر عائد کردہ الزامات کی صفائی اور مرتب کے ذاتی تاثرات اور واقعات پر مشتمل ہے۔

مطبوعہ نسخے کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کس حد تک مخطوطے کی صحیح نقل ہے۔

تاریخ غزالہ میں بادشاہ کے نام بیس خط ہیں جو نواب ملکہ غزالہ کو کلکتے سے لکھنؤ بھیجے گئے تھے۔"۲۸

تاریخ نور (۱۲۷۴-۷۵ھ، مخطوطہ)

مملوکہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ یہ مجموعہ نور زماں بیگم کے خطوں کا ہے۔ خطوں کو ترتیب دینے والے خود واجد علی شاہ ہیں۔ آٹھ صفحات کے دیباچہ میں حمد، نعت، منقبت وغیرہ شامل ہیں۔ کاتب نے نام اور عنوان سرخ روشنائی سے اور خط سیاہ روشنائی سے لکھے ہیں۔ صفحات کا شمار نہ کیا ہے۔

کوکب قدر سجاد علی میرزا لکھتے ہیں:

"نور زماں بیگم اور بادشاہ کے درمیان خط و کتابت کی اور کوئی تفصیل نہیں ملتی اور

نہ تاریخ نور کے شائع ہونے کی کوئی شہادت ہی کہیں نظر آتی ہے۔"۲۹

انھوں نے اپنے اس بیان کے ساتھ جو حوالہ دیا ہے اس میں لکھا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں ادارہ ادب (پٹنہ) نے پروفیسر کلیم الدین احمد کے مملوکہ مذہب نسخے کو انھیں کے دیباچے کے ساتھ شائع کر لیا ہے۔ تقابلی مطالعے کے بغیر اس مطبوعہ نسخے کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنا فی الحال مناسب نہیں۔۳۰

ادارہ ادب پٹنہ سے پروفیسر کلیم الدین احمد کے مقدمے کے ساتھ "تاریخ نور" کا شائع شدہ ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔ اس کے مقدمے میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے لکھا ہے:

> "تاریخ نور" اوراق کا سائز ۷×۱۲، صفحات ۱۱۵، مسطر آٹھ سطروں کا۔ مارجن اور بین السطور مطلا و مذہب جلد سرخ رنگ کی۔ اس پر بھی کچھ مطلا نقش و نگار ہیں۔ سائز ۸×۱۳۔ کتاب کے شروع میں تین سادہ اوراق ہیں۔ ایک ورق پر دو مہریں بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب واجد علی شاہ کے کتب خانہ میں تھی۔ کتاب کے آخر میں بھی دو سادہ ورق ہیں۔ ایک ورق پر اسی قسم کی مہر ہے۔ اس کتاب میں واجد علی شاہ کے ۳۸ خطوط ہیں، جو انھوں نے نواب نور زماں بیگم کو لکھے تھے۔ ۲۶ خطوط ایسے ہیں جو نظر بندی کے زمانے میں لکھے گئے تھے۔ اور نو خط رہائی کے بعد۔ کتاب کے آغاز میں کچھ اشعار کے بعد نور زماں بیگم کی طرف سے آغاز تالیف کتاب کا مختصر سا بیان ہے اور کتاب کے آخر میں بھی نور زماں بیگم کی طرف سے چند سطور اور کاتب محمد حسن لکھنوی نے چند سطریں اور اشعار دعائیہ لکھے ہیں۔
>
> یہ اس کتاب کا شاید واحد نسخہ ہے اور اسے میرے خسر جناب محمد عبدالحفیظ بی اے (آکسن، بار ایٹ لا) نے جب کلکتہ میں واجد علی شاہ کی کتابیں اور دوسری چیزیں نیلام ہو رہی تھیں اسی نیلام میں "تاریخ نور" خریدی۔ میں نے سید مسعود حسین رضوی صاحب سے دریافت کیا کہ ان کی نظر سے اس کتاب کا کوئی نسخہ گزرا ہے یا نہیں جو انھوں نے جواب دیا وہ یہ ہے:
>
> "تاریخ نور" کے دو قلمی نسخے میں نے پٹنے میں دیکھے تھے۔ ایک معمولی نسخہ

اورینٹل پبلک لائبریری میں اور دوسرا نہایت خوش خط مطلا نسخہ آپ کے والد مغفور ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے پاس تھا۔ پبلک لائبریری والے نسخے میں نوروز ماں بیگم کے پچیس خط ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب والے نسخے میں بادشاہ کے انتیس خط ہیں۔ آپ کے بادشاہ کے خطوں کی تعداد اٹھائیس لکھی ہے۔ براہ کرم ان خطوں کا شمار کر کے ان کی صحیح تعداد سے مطلع فرمائیے شکر گزار رہوں گا۔ خوش خط مطلا نسخے کے ابتدائی دو صفحوں کا فوٹو میں نے منگوایا تھا جس ان کا فوٹو لے کر اس میں رنگ بھروا لیا تھا۔"

خدابخش لائبریری میں جو "تاریخ نور" کا نسخہ ہے اسے میں نے منگا کے دیکھا اور صفی صاحب سے کہا کہ خطوط کی تعداد شمار کر لیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس میں ۲۹ نہیں بلکہ ۴۹ خطوط ہیں۔ اس بات کی اطلاع میں نے سید مسعود حسن صاحب کو بھیج دی ہے۔" [۱۲]

تاریخ بدر (۷۶-۱۲۷۳ھ)

مملوکہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد (دکن)۔ مجموعہ "تاریخ بدر" کے ابتدائی صفحے پر شاہی کتب خانے کی مہر کے علاوہ ایک بیضوی مہر لگی ہے۔ اس مہر کے ساتھ یہ عبارت بھی درج ہے:

"بنام بدر عالم صاحب رقعات بدر عالم صاحب، تحفہ نواب حمایت جنگ بہادر،
سید محی الدین قادری زور، ۱۹ رمضان ۱۳۶۰ ہجری۔"

اسی صفحے پر ادارۂ ادبیات اردو کا ربر اسٹامپ ہے۔ یہ مہریں اور عبارتیں کتاب کی قسمت کا حال بیان کرتی ہیں۔ آخری سادہ صفحے پر ایک انگریزی ربر اسٹامپ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی زمانے میں بھدرک (اڑیسہ) کے مولوی مرزا محمد نامی کسی "جنرل مرچنٹ" کی ملکیت رہی ہے۔ کاتب نے صفحات کا شمار نہیں کیا ہے۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات سے متعلق جو بھی خطوں کے مجموعے دستیاب ہوئے ہیں ان میں یہ مجموعہ مختصر ترین ہے۔ شروع میں پانچ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں سبب تالیف کے بارے میں بادشاہ کا بیان بھی درج ہے۔

"تاریخ بدر" ان خطوں کا مجموعہ ہے جو نواب واجد علی شاہ کی محبوبہ بیگم نواب بدر عالم صاحب نے واجد علی شاہ کے نام اپنے نامہ نویسوں سے لکھوائے تھے۔

"تاریخ بدر" کو "رقعات بدر" کے نام سے سید محمد علی عرشی ملیح آبادی نے شائع کرایا۔ اور اس کے شروع میں مختصر سا تعارف بھی لکھا ہے۔

"تاریخ بدر" کے آدھے سے زیادہ خطوں میں تاریخ کتابت نہیں ہے۔ اور مولف نے اگر باب اور فصلوں میں خطوں کو تقسیم نہ کیا ہوتا تو یہ بتانا بھی دشوار ہوتا کہ کون سا خط کس مہینے کا ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر خطوط نظم میں ہیں۔ "تاریخ بدر" کے ساتھ کوکب سجاد علی میرزا نے ملحق انتظام اللہ شہابی کے بیگمات اودھ کے خطوط کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

تاریخ فراق (۱۲۷۵ھ)

مملوکہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ تاریخ فراق کی مکتوب الیہ نوروزی بیگم ہیں۔ مجموعہ کے سادے سرورق شاہی کتب خانے کی مہروں کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ خدابخش مرحوم نے ۲۶ ر اپریل ۱۹۰۰ء میں کتب خانے کو یہ مخطوطہ عطا کیا۔ خطوط کے مجموعے جو اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں ضخیم ترین ہے۔ شاید اسی ضخامت کو کم کرنے کے لیے اس کی کتابت گھٹے ہوئے انداز میں ہوئی ہے اور اکثر حصہ نظم بھی نثر کے طریقے پر لکھا گیا ہے۔ زیادہ تر ایک خط کے ختم ہوتے ہی دوسرے خط کی ابتدا ہوتی ہے اور اختتام یا آغاز کی نشان دہی کے لیے چند سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ تمام خط ایک ہی سال کے لکھے ہوئے ہیں اور ہر مہینے کو فصل قرار دیا گیا ہے۔ اور فصل کی سرخیاں حاشیے پر لکھی ہوئی ہیں۔ شروع میں سات صفحے کا دیباچہ ہے۔ مخطوطے میں کتابت کی غلطیاں ہیں۔ حمد، نعت، منقبت کے ساتھ سبب تالیف بھی بیان کیا گیا ہے۔ تین خط مکمل منظوم ہیں، باقی خطوط میں کچھ حصہ نظم اور کچھ نثر کا ہے۔

"تاریخ فراق" کے خط اب تک غیر مطبوعہ ہیں صرف پہلے خط کا ذرا سا حصہ "رقعات بیگمات" میں چھپ گیا ہے۔ "رقعات بیگمات" محمد امتیاز علی خاں نجیب نے مرتب کر کے فرخ آبادی مطبوعہ سورس کمپنی سے ۱۹۰۲ء میں شائع کرایا۔

تاریخ جمشیدی (۱۲۷۵-۷۶ھ)

مملوکہ کتب خانہ ہاؤس آف اودھ، کلکتہ۔ یہ خطوط نواب جمشیدی بیگم نے بادشاہ کے خطوں کے جواب میں لکھے ہیں۔ اس مجموعے کے کسی خط کا ذکر مبصرین کے بیانات میں نہیں ملتا۔ مخطوطے کا پہلا صفحہ سادہ ہے۔ اس پر شاہی کتب خانے کی دونوں چھوٹی بڑی مہریں ہیں۔ شروع میں چار صفحات کا دیباچہ ہے۔ مخطوطے میں سرخیاں، تاریخیں اور بادشاہ کے نام سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ کتابت کی متعدد غلطیاں ہیں۔ تاریخ جمشیدی کے تمام خطوط مع غزلوں کے میر علی حسین فارغ، کسی گمنام چٹھی نویس اور منشی مظفر علی ہنر کے لکھے ہوئے ہیں۔ ۳۲

واجد علی شاہ اور بیگمات اودھ کے خطوط کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ وہ دور اردو نثر کی نشوونما کا ابتدائی دور تھا۔ حالانکہ بیگمات کے اکثر خطوط منظوم ہیں۔ علمی مباحث کے لیے اردو زبان میں وہ صلاحیت، توانائی اور عمومیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ اس میں ہر طرح کے خیالات آسانی سے ادا کیے جا سکیں۔ شمالی ہند میں سرسید اور ان کے ہم عصر اہل قلم کی کوششوں سے جو ہموار ہوا وہ ذہنی اور جغرافیائی اعتبار سے واجد علی شاہ ان سے کوسوں دور تھے۔ واجد علی شاہ نے موسیقی، علمی اور مذہبی مباحث کے لیے فارسی کو ترجیح دی لیکن اردو کی روز بروز ترقی سے وہ غافل نہ تھے۔ "بنی" (۱۲۹۱-۹۳ھ) کی تصنیف کے وقت واجد علی شاہ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ فارسی کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت عام فہم زبان میں کہنا چاہیے۔ اس لیے "بنی" کے دیباچہ میں اس کے لیے معذرت کی ہے۔

نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط حالانکہ اپنے مقامی رنگ سے عاری نہیں ہیں لیکن بعض خطوں کے نثری آہنگ میں غالب کی آہٹیں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ سادگی و برجستگی کو نہ صرف واجد علی شاہ نے برتا ہے بلکہ بیگمات کے خطوط کے بعض ٹکڑے سادہ و سلیس طرز اسلوب کے غماز ہیں۔ ان کے خطوط سے متعلق خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> "انسان کی اصلی سیرت کا اندازہ بحث میں نہیں، تکلیف میں ہوتا ہے۔ یہ خطوط چونکہ انتزاع سلطنت کے بعد لکھے گئے ہیں اس لیے جان عالم اور ان کی بیگمات

> کے کردار کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ مٹیا برج میں وہ شاہانہ کروفر باقی نہ رہا تھا پھر بھی اس زمانے کا زندہ لکھنؤ تھا۔ اس تہذیب کے اصلی خط و خال ان تحریروں میں صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے زوال کے بعد واجد علی شاہ ان کے متعلقین اور رعایا پر کیا گزری۔ ان کے دلوں میں جان عالم کی کتنی محبت تھی اور خود بادشاہ ان حالات سے کتنے متاثر تھے اس لیے یہ خطوط صرف ادب ہی کا بیش قیمت سرمایہ نہیں، تاریخ ہندوستان کی اہم دستاویز بھی ہیں۔" ۳۳

خط لکھنے کے لیے کسی علم و فضل کی ضرورت نہیں ہوتی وہ صرف چند لمحات کی یاد قائم رکھنے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ زندگی میں یہی لمحات سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ خط کے شروع یا آخر میں "اشتیاق ملاقات"، "آرزوئے وصال" جیسے رسمی کلمات اس نفسیاتی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں جس کی بدولت یہ خطوط محبت نامے قرار دیے گئے ہیں۔ واجد علی شاہ نے اپنے بچوں، بیگمات کے متعلقین اور ملازمین تک کو دعا سلام سے نام بنام یاد کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان معمولی باتوں میں بادشاہ کی ہر دل عزیزی اور عقیدت مندانہ عزت و احترام کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔

"تاریخ نور" کا مطبوعہ نسخہ جو میرے پیش نظر ہے اس کے ایک خط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کی فرمائش پر ترتیب دیا گیا۔ واجد علی شاہ ایک خط میں نور زماں بیگم کو لکھتے ہیں:

> "مجھے منظور ہے کہ تم صاحبوں کے محبت ناموں کی نقلیں میں بھی اپنے پاس رکھوں کس واسطے کہ جو کچھ نظم و نثر لکھ بھیجتا ہوں اس کا مسودہ میرے پاس نہیں رہتا۔ اکیلا آدمی کیا کیا کروں اور کلام نظم و نثر بھی بہت ہو گیا ہوگا جو کچھ کلام ہمارا نظم تمہارے پاس موجود ہو اس کی نقل عمارت الدولہ اور میر علی خاں ہلال اور نثر کا اب اسلاک کو دے دینا۔ اور ایک کتاب اپنے محبت ناموں کی تاریخ اور جس طرح ہم نے بھیجے ہوں خوش خط تقطیع بین السطور اچھا سطر منقل کروا کے ہمارے پاس بھجوا دو مگر جس طرح سے ہم نے لکھا ہے مع نظم و نثر اسی ترتیب سے اور دیباچہ اس کا اپنے نام پر کرنا کہ یہ محبت نامہ مرسلہ جان عالم ہم نے اپنے فرط

محبت سے جمع کیے اور اس کا نام تاریخ نور رکھا اور بعد اس کے تحفہ اس کی جوا کے
ہمارے پاس بھجواؤ اور پھر ہر مہینے کے بعد بھی شغل جاری رکھنا اس تقطیع اول
کے موافق درست کروا کے بعد انقضائے ماہ ہمراہ محبت نامہ وہ اوراق روانہ
کر دیا کرو، تا ہمارے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور رہے اور جو کچھ اس میں صرف
ہوگا وہ ہم سے متعلق ہے۔'' ۲۴؎

''تاریخ ممتاز'' کے ایک خط سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ اپنی بیگمات سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ ان کے خطوط کو خوش خط کاتب سے لکھوا کر مجلد کر کے انھیں بھیج دیں۔ تاریخ ممتاز کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مکرر یہ کہ ایک کتاب اپنے محبت ناموں کی تاریخ اور جس طرح ہم نے بھیجے
ہوں بخوش تقطیع بین السطور اچھا مطلا مذہب کروا کے ہمارے پاس بھجواؤ۔ مگر
جس طرح سے ہم نے لکھا ہے نظم و نثر اسی ترتیب سے اور دیباچہ اس کا اپنے
نام پر کرنا کہ یہ محبت نامہ مرسلہ جان عالم ہم نے اپنے فرط محبت سے جمع کیے
اور اس کا نام تاریخ نور رکھا اور بعد اس کے تحفہ اس کی جوا کے ہمارے پاس بھجواؤ
اور پھر ہر مہینے کے بعد بھی شغل جاری رکھنا کہ اسی تقطیع پر ان کے موافق درست
کروا کے بعد انقضائے ماہ ہمراہ محبت نامہ وہ اوراق روانہ کر دیا کرو، ہمارے دل
کو سرور اور آنکھوں کو نور رہے گا اور جو کچھ اس میں صرف ہوگا وہ ہم سے متعلق
ہے۔ زنہار اس میں پس و پیش نہ کرنا۔ تھوڑے لکھے کو بہت جاننا۔'' ۲۵؎

دونوں خطوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا خط نور زماں بیگم کو لکھا گیا ہے اور دوسرا خط ممتاز جہاں بیگم کو لکھا گیا ہے۔ دونوں میں مشابہت ہے۔ ''تاریخ نور'' میں واجد علی شاہ کی نظم (مثنوی و غزل) اور نثر کے نمونے مل جاتے ہیں اور ساتھ میں اس کی اہمیت تاریخی بھی ہے اس لیے تاریخ نور ایک Human Documnet ہے۔

''تاریخ نور'' کے خطوں کے مطالعے سے جہاں بہت سی نجی زندگی کی باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک بات اور واضح ہوتی ہے کہ واجد علی شاہ قید و بند کے زمانے میں اپنی مصیبتوں کا زیادہ

اظہار نہیں کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں:

''اب کہاں تک داستان مصیبت بیان کروں ایک دفتر میں بھی نہ سماوے۔'' ۲۶؎

واجد علی شاہ کے خطوط بیگمات کے نام محبت نامے تو ہیں ہی لیکن ان کے خطوط میں اپنے بچوں کے علاوہ متعلقین اور ملازمین کی جو مزاج پرسی کی گئی ہے اس سے ان کے خطوط کی فکری خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں اس سے متعلق کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''ہمیں موتی محل تک کا حال، احوال نہیں معلوم کہ وہاں زنان و فرزندان پر کیا
گزرتی ہے۔ فقط اتنا سنا ہے کہ اختر محل سے شاہزادہ متولد ہوا، شاید برس دن
کا ہوا اور ہماری والدہ اور بھائی نے لندن میں انتقال کیا، امید کہ ہمیشہ ارقام
رقائم سے دل مقید کو شاد کیا کرو، اللہ بہت سا سلامت رکھے۔'' ۲۷؎

''والدین کو اور بھائی آغا علی کو میری طرف سے بہت بہت پوچھ دینا اور اچھی
صاحب کو بہت بہت سلام و اشتیاق دوبارہ پہنچے۔'' ۲۸؎

''والدہ صاحب اور اباجان اور بہن اچھی صاحب اور بھائی آغا علی ان سب کو دعا
بعد دعا ہماری طرف سے پوچھ لینا۔'' ۲۹؎

''نصرت الدولہ کا حال معلوم ہوا۔ جان من محمودہ بیگم نے اس کی ماں کی مجھے
بہت شکایت لکھی کہ زمانہ بدلوات میں اس کی ماں نے ان پر بہت ظلم کیے
اور سارا سرکاری زیور ان سے چھین لیا اور مقید کر دیا۔ غرض بہت طول کلام ہے۔
مختصر یہ کہ اس ابلاغ ظلم مطلع کرو کہ معافی اپنی والدہ جا۔ اور محمودہ بیگم کے قدموں پر
گر۔ اور ان سے اپنی تقصیر معاف کروا۔ جب وہ میری ماں کی طرف سے راضی
نامہ بھجوائیں گی اس وقت ہم بھی خطا بخش دیں گے۔'' ۳۰؎

بادشاہ نے اپنے خطوط میں ان حسین لمحات کی یادیں تازہ کی ہیں اور تصور میں اس محفل شادمانی کو ایک بار پھر سے آراستہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گزرے ہوئے اوقات کو جذبات کی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ایک دفعہ پھر، چاہے وہ عالم خیال ہی میں کیوں نہ ہوں بسر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حسین یادوں کو ایک بار اپنے دامن میں سمیٹنا چاہتے ہیں۔ ان حسین لمحات

کو یاد کر کے ان کے دل میں ایک ٹھنڈک سی پڑتی ہے اور حال کی تلخیاں ایک حد تک گوارا ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ مصائب کا ایک اتھاہ سمندر ہے جن کو وہ دلکش یادوں سے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

واجد علی شاہ کی بیگمات نے اکثر منظوم خطوط لکھے ہیں جو ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ بیگمات کے خطوط کا کچھ حصہ سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا اور بیشتر حصہ اس کے بعد کا ہے۔ لکھنؤ ان دو سالوں میں ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس کی مثال اس شہر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ بیگمات جو بادشاہ کے ساتھ کلکتے نہ جا سکیں انھوں نے ان خطوں میں اپنے اشتیاق و محبت کا ذکر تو کیا ہی ہے ساتھ میں ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس کسمپرسی اور پریشانیوں کے دور سے گزریں۔ ایسے ایسے واقعات کا پتہ چلتا ہے کہ دل کانپ اٹھتا ہے۔ بادشاہ کی بیگمات کو سردی کے دنوں میں لحاف تک میسر نہ تھا قرض خواہ تنگ کرتے اور دو وقت نان تک کی پریشانی تھی۔

"بے گھر بے در ہو گئی، بیٹھنے کے ٹھکانے نہ رہے۔ حیثیت ظاہری کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ زیور، اسباب لباس کچھ نہ رہا، کچھ حضرت محل کی بدولت لٹ گیا۔ کچھ نکلنے کے وقت چھٹ گیا، جھاڑی زمین پر بیٹھتے ہیں، ٹوٹے مکان میں رہتے ہیں، نہ وہ محل ہے نہ وہ باغ ہے، خانہ دل چھوٹا ہے۔"۳۱

واجد علی شاہ کی جو بیگمات ناخواندہ تھیں ان کے لیے نامہ نویس مقرر تھے جن کے نام اس طرح ہیں: سرور، عشیر، مشیر، توقیر، جوہر، ہلال، شفق، زائر، شلیخ اور عباد علی وغیرہ۔ ملکہ عز الدولہ کے نام واجد علی شاہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اے عز الدولہ حسب فرمائش تمہارے علی جان شفق کو ہم نے تیس روپیہ مہینہ کا نوکر رکھ کر تمہاری خطوط نویسی کے لیے مقرر کیا ہے۔"۳۲

"مثنوی اعظم کی پانچویں والے خط میں شفق نے بڑا زور طبیعت دکھایا ہے۔ سبحان اللہ کیا کہنا شاباش!"۳۳

زینب بیگم دیگر بیگمات کی طرح ناخواندہ تھیں کیونکہ بادشاہ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ گانے بجانے کے شوق کے ساتھ وہ تھوڑا بہت پڑھنا بھی جانتی تھیں:

"غزل تمہاری دوسرے لقدی نام پر شدت درد فراق میں موزوں کی ہے۔ اچھی ہے تم اسے خود پڑھو گی اور گاؤ گی۔"۳۴

مگر زینت بیگم (ممتاز جہاں) کے خطوط بھی دیگر بیگمات کی طرح پیشہ ور نامہ نویسوں نے لکھے ہیں:

"جس شاعر نے تمہارا جواب لکھا تھا وہ نایاب ہے۔ کئی دفعہ ہم نے تم کو لکھا ہے کہ اپنے خط اس سے لکھوایا کرو۔"۳۵

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے امداد علی عشیر شیدا بیگم اور دوسری بیگمات کی طرف سے نامہ نویس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد انھوں نے نوروزی بیگم کو پناہ دی اور اپنی خدمات ان کے لیے وقف کر دیں۔ تیس روپے ماہوار امیر علی خاں ہلال بھی مقرر تھے۔ وہ بھی نوروزی بیگم کے خط لکھنے پر مامور تھے۔ نواب جمشیدی بیگم بھی ناخواندہ تھیں خط لکھنا تو کیا پڑھنے کی بھی لیاقت نہ رکھتی تھیں ایک جگہ لکھتی ہیں:

"خط تمہارا لکھا ہوا ہمارے پاس بتاریخ بست و ششم رجب کے آیا، مجھ کو میں نے اپنے بڑے بھائی سے نہیں پڑھوایا، وقت کی بات ہے کہ اس وقت ایک چٹھی نویس میرے پاس بیٹھی تھیں، انھیں سے وہ خط میں نے پڑھوایا بلکہ انھیں سے لکھوایا بھی ہے۔"۳۶

رجب علی بیگ سرور نے بھی بیگمات کی طرف سے خطوط لکھے ہیں "انشائے سرور" میں بھی سات خطوط ایسے شامل ہیں جو انھوں نے بیگمات کی طرف سے واجد علی شاہ کو لکھے ہیں، ان سب باتوں اور خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے راز و نیاز کی باتیں اکثر بیگمات نے خود نہیں لکھیں بلکہ پیسہ دے کر منشیوں یا عزیزوں سے لکھوائی ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیگمات کے جذبات نہیں بلکہ اہل قلم کی انشا پردازی ہے۔

خطوط اگر کسی دوست کے نام بھی لکھے گئے ہوں تو وہ ایک ایسی نجی زندگی کو بے نقاب کرتے ہیں جن کو انسان کبھی کسی پر افشاں نہیں کرنا چاہتا لیکن یہی خط و کتابت اگر میاں بیوی کے درمیان ہو تو اور زیادہ قابل احترام بھی جاتی ہے کیونکہ وہ خیالات جن میں دوست ایک دوسرے کے راز دار

نہیں ہوتے شوہر بیوی ایک دوسرے کے ہم راز ہوتے ہیں۔ ان کو شائع کرنا بہت جرأت کا کام ہے۔ واجد علی شاہ نے اپنی بیگمات کے خطوں کو شائع کر کے بہت جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان کے خطوط کھل جاتے تھے تو بیگم اور بادشاہ دونوں کو ناگوار گزرتا تھا لیکن ایک زمانہ ایسا آیا کہ خطوں کو شاہ اور مرتب کروایا گیا۔

واجد علی شاہ کے مرتب کیے ہوئے مجموعوں سے پہلے اردو زبان میں اس طرح کے مجموعے نا پید تھے۔ ان مجموعوں کے مرتب ہو جانے سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ خطوط کے ذریعہ واجد علی شاہ کی نفسیات کا تو مطالعہ کیا ہی جا سکتا ہے لیکن تاریخ، لسانیات اور سوانح نگاری سے متعلق جو معلومات ان خطوں کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے، وہ کسی اور ذریعہ سے میسر نہیں ہوگی۔ حالانکہ یہ سب خط محبت نامے ہیں، چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ان خطوں کی مشترک خصوصیت ہے لیکن غم جاناں کے ساتھ ہی غم دوراں اور غم زنداں کے کچھ عبرت انگیز نقوش ان خطوں کا جزو بن گئے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''خط لکھنے کے لیے صرف کاغذ اور قلم ہی کی نہیں خون جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جان عالم اور ان کی بیگمات کے خطوں میں حسرتوں کی سرگزشت ہے، جذبات کی گھلاوٹ ہے، ارمانوں کا سوگ ہے، ان میں دلی کیفیات کا اظہار ہے لیکن ایسا بے لاگ ہے جیسے تیر کمان سے نکل جائے یہ خطوط صرف تاریخ کے طالب علم کے لیے ہی اہم نہیں، بلکہ مکتوباتی ادب میں بھی ایک درجہ رکھتے ہیں۔'' [57]

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کے اسلوب میں تنوع ہے۔ پُر تکلف القاب، مقفیٰ جملے، انشا پردازی اور طول کلامی واجد علی شاہ کے خطوں کا عام اسلوب ہے۔ کہیں کہیں عام بول چال کی زبان بھی ہے لیکن آراستہ و پیراستہ ہے۔ مختلف مجموعوں میں مختلف اسالیب بیان سے جہاں بادشاہ کی جدت طراز طبیعت اور ندرت ادا سے زبان اور بیان پر قدرت کا ثبوت ملتا ہے، وہیں یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شاید بادشاہ نے اس بات کا خیال رکھا ہو کہ جس رنگ میں سوال ہو جواب بھی اسی رنگ میں دیا جائے۔ اس لیے ان خطوں میں عبارت پُر تکلف ہے۔

یہ خطوط اپنی رنگارنگی کے سبب اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی انفرادیت ایک تو مکالماتی

اسلوب اور دوسری طرف سادگی و صفائی ہے۔ یہ سادگی اور صفائی اپنے اس مکالماتی اسلوب کے سبب سے فطرتی اور بے ساختہ ہے کیونکہ گفتگو میں بے تکلفی اور برجستگی کے لیے لازمی ہے کہ گر وہ دل نشین ہے تو صاف عام فہم زبان میں ہو۔

بیگمات کی طرف سے لکھے خط مختلف لوگوں نے لکھے ہیں۔ لکھنے والوں کی متواتر تبدیلی کے سبب خطوں کے اسلوب میں یکسانیت نہیں ہے۔ حالانکہ خطوط میں بیگماتی زبان نہیں ہے لیکن خطوط اسی لکھنؤ زبان اور تہذیب کا آئینہ ہیں جس میں سرور جیسے انشا پرداز اور شوق جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ خطوط کے آئینے میں شوہر بیوی کے راز و نیاز کے علاوہ لکھنؤ والوں کے رکھ رکھاؤ، میل جول، ان کی دلچسپیوں اور مصروفیات کا عکس نظر آتا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''عورتیں زبان کی سب سے بڑی محافظ ہوتی ہیں اور اردو کی ٹکسالی زبان کا دارو مدار صرف بیگمات پر ہے، واجد علی شاہ کی بیگمات کو اس معاملے میں خصوصیت خاص حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوں میں روزمرہ کی چاشنی، الفاظ کی ترتیب، محاورات کی برجستگی اور ندرت ادا کی شیشہ گری، یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔'' [58]

خطوط میں القاب و آداب میں بھی بڑی جدتیں برتی گئی ہیں۔ کہیں کہیں لمبے لمبے القاب ہیں تو کہیں خط کی ابتدا کسی غزل یا مثنوی سے کی ہے۔ خطوط منظوم، منثور دونوں قسم کے ہیں۔ ہر خط کا انداز الگ ہے، القاب الگ ہے، القاب کی جدتیں ملاحظہ کیجیے:

بدر عالم لکھتی ہیں:

> ''اے میرے قدردان! اے میرے مہربان، اے میرے محسن و مددگار، اے میرے ہمدم و غم خوار، اے میرے یوسف، اے میرے قیدی، اے میرے زندانی، اے میرے جان عالم، اے میرے اختر پیارے میں صدقے تمہارے۔''

شیدا بیگم لکھتی ہیں:

> ''مہر پیشانی، چہرہ نورانی، ابرو کمانی، تیر مژگان، بادام چشم، بہرام خشم، گل کی

خوشبو، بلبل کی گفتگو، فرشتہ، زیب، زاہد فریب، حسینوں کے رنگ، زہرہ جبینوں
کے ڈھنگ، شاہد کی کج عزیز کی رنگی۔"

القاب و آداب کی ندرت کے علاوہ دعائیہ کلمات ان کے اسلوب کی جدت کی گواہی دیتے ہیں:

یہ خطوط کیونکہ فراق میں لکھے گئے ہیں اس لیے بعض جگہ ہجر میں وصال کا لطف ہے اور تحریر میں تقریر کا رنگ محسوس ہوتا ہے۔ یہ خطوط ہندوستانی عورت کے دل کی پکار ہیں۔ وہ بیگمات بادشاہ کے ساتھ کلکتہ نہ جا سکیں انھوں نے اپنے خطوں میں اشتیاق اور محبت کا ذکر کیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"ان خطوں میں اشتیاق و محبت، ہجر و مفارقت اور شکوہ و شکایت سبھی کچھ ہے۔ گویا
ایک دنیا اس دیدۂ تر میں سمٹ آئی ہے۔ بعض جگہ محبت کا اظہار عورت کی طرف
سے کیا گیا ہے اس لیے ان میں ہندی دوہوں کا بھی رنگ ہے۔" ۴۹

یہ خطوط اس زمانے میں لکھے گئے جب ایک بساط الٹ چکی تھی، دوسری بچھائی جا رہی تھی، جاگیردارانہ نظام کا زوال ہو رہا تھا لیکن اس کی تہذیبی اقدار باقی تھیں۔ ان خطوں کے مطالعے سے ایک مٹتے ہوئے درباری ماحول کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ ان میں جذبے کی دہکتی ہوئی آگ ہے کوئی ہلکی آنچ نہیں بلکہ ایک سسکتا رومانی انداز ہے۔ کوئی بلند تصور یا دیوانہ بنا دینے والا احساس نہیں۔ اس کے پیچھے جو معاشرتی زندگی ہے وہ ہوس ناکی اور سطحی قسم کی ہے۔ لکھنؤ کا لوچ، بانکپن اور اس کا ابتذال ہے۔ شوہر بیوی نے اپنے فراق کی داستان کو درد انگیز پیرایے میں بیان کیا ہے۔ خطوط میں واجد علی شاہ گوپیوں سے گھرے ہوئے کشن کنہیا نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان کے خطوط ہندیت کا نکھار ہے۔ خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"یہ خطوط لکھے نہیں گئے ریشم کی طرح بنے گئے ہیں۔ کوئی جملہ جب تک وہ شبنم
کے ایک ایک قطرے سے پھول نہیں بن گیا اس گلدستے میں شامل نہیں کیا گیا
لیکن اس کے باوجود یہ ساحری، و بیمری کا درجہ اختیار نہیں کر سکے۔" ۵۰

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط ان کے نثر نگاری کی واحد یادگار ہیں اور ان کا مرتب

ہونا بھی کچھ جرأت اور جدت طرازی کا کام تھا کیونکہ اس سے پہلے اس طرح کے مجموعے اردو زبان میں مرتب نہیں ہوئے تھے۔ خطوط میں بالمشافہ گفتگو کا انداز نمایاں ہے۔ ان خطوط کی امتیازی خصوصیات ان کی سادگی، صاف گوئی، صفائی اور مکالماتی انداز تحریر ہے۔ یہ خطوط لکھنوی زبان اور تہذیب، معاشرت اور سیاست اور تاریخ کے اہم دستاویز ہیں۔ انھیں خطوں کے ذریعہ ایک غیر معمولی انسان کی شکل سامنے آتی ہے جو اپنے ادنیٰ سے ملازمین کو دعا سلام سے یاد کرتا ہے اور اپنے متعلقین کو صبر و تحمل کی تلقین کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

■❖■

رجب علی بیگ سرور

خط یا مکتوب، مکتوب نگار کے افکار و خیالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ خط کی مدد سے خط نگار کے حالات و واقعات، سیرت و کردار اور عادات و اطوار کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔ خاص طور سے ذاتی نوعیت کے خطوط انسان کی شخصیت کی ایسی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں جس کا علم کسی دوسرے ذریعہ سے ہونا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رجب علی بیگ سرور کے جتنے خطوط محفوظ ہیں ان سے سرور کے متعلق ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو غالباً کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں تھیں۔ رجب علی بیگ سرور کے خطوط سے متعلق نیر مسعود لکھتے ہیں:

> "سرور کے خطوط کی اشاعت کا سبب یہی تھا کہ وہ ایک انشا پرداز کے نثر پارے تھے۔ ان کی اشاعت صرف لطف زبان کی بنا پر تھی۔ چنانچہ سرور کے خطوط کے مجموعے "انشائے سرور" کے ہر صفحے پر کتاب کا نام اس طرح چھپا ہوا ہے۔ "انشائے سرور اردو معلیٰ" اس لیے کہ ان کے خطوں کی زبان کا معلیٰ ہونا ہی گویا ان کی اصل خصوصیت تھی۔ بہر کیف غنیمت ہے کہ اس حیلے سے سرور کے متعلق معلومات کی فراہمی کا ایک معتبر ذریعہ پیدا ہو گیا۔ یہ خطوط منشی نول کشور کی فرمائش پر سرور کے منہ بولے بیٹے مرزا احمد علی نے "انشائے سرور" کے نام سے مرتب کیے۔ نول کشور پریس سے انشائے سرور عرصے تک چھپ چھپ کر شائع ہوتی رہی۔" ۱؎

رجب علی بیگ سرور کے مکاتیب کے مجموعے "انشائے سرور" میں دیباچے کے طور پر "سبب تالیف لطیف" کے عنوان سے مرزا احمد علی نے لکھا ہے:

> "جناب منشی صاحب ممدوح کو بسبب قدر دانی و جوہر شناسی حضرت ولی نعمی والد ماجد مرحوم و مغفور مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب کے ساتھ کمال محبت و عنایت بلکہ بہر حال منظور نظر رعایت تھی وہ بھی تا بقید حیات مرہون سپاس ممنون احسان بے قیاس رہے چنانچہ بہ نظر اتحاد قدیمانہ بنوازش کریمانہ منشی صاحب موصوف کو مرکوز خاطر عاطر ہے کہ جس قدر کلام مرزائے مرحوم کا ہاتھ آئے چھپا دیجیے تاکہ یادگار رہے ضائع نہ جائے چند نوازش نامجات جو بنام کمترین فرزند افتخار بخش سرنیاز ہوئے تھے اور اکثر پر مختلف علیہ تحریر سے سرفراز ہوئے تھے۔ حسب فرمان والا اس ہیچ مدان کج مج زبان خوشہ چین ارباب انکسار احمد علی خاکسار ازلی نے ترتیب دے ایک جا کیا اور انشائے سرور نام رکھا امید واثق و رجا صادق ہے کہ مقبول خاطر انام ہو بخیر انجام ہو۔" ؎

عام طور پر رجب علی بیگ سرور "بابائے مقفیٰ مسجع" عبارت مانے جاتے ہیں لیکن اس بات کی طرف ہمارا ذہن بہت کم جاتا ہے کہ سرور بھی انیسویں صدی کی نثر کے جدید اور تغیر پذیر رجحانات کے نمائندہ ہیں۔ ان کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور کو محض مقفیٰ مسجع اور آرائش و زیبائش سے بھرپور نثر پر ہی قدرت حاصل نہ تھی بلکہ صاف سلیس اور رواں دواں تحریریں لکھنے کے ہنر سے بھی واقف تھے۔

سرور کے خطوط کی بے ریائی و خلوص، سادگی و بے تکلفی اور شگفتگی کی وجہ سے انھیں اردو کے ابتدائی دور کے مکتوب نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔

مجموعہ "انشائے سرور" میں حمد و نعت کے بعد صفحہ تیرہ تک گیارہ عرضیاں شامل ہیں۔ اردو رقعات کا سلسلہ صفحہ چودہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ خطوط اپنے مکتوب الیہم کے ناموں کے ساتھ اس طرح تقسیم ہیں:

۱۔ احباب کے نام	۱۰ خطوط
۲۔ واجد علی شاہ کے نام بیگمات کی طرف سے	۷ خطوط
۳۔ مرزا احمد علی کے نام	۴۷ خطوط

احباب کے خطوط کے بعد ایک دعوت نامہ اور ایک خط واجد علی شاہ کے نام ہے۔ مجموعے کے آخری صفحات پر آٹھ فارسی خطوط ہیں۔

''انشائے سرور'' کے ان خطوں کے علاوہ سرور کے کچھ اور خط شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے آٹھ نہایت اہم ''انشائے اردو'' میں شامل ہیں۔ ایک بہت مختصر اور رسمی خط جو ۱۸۶۹ء میں منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ ماہنامہ ''خیابان'' لکھنؤ کے مارچ ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ صفیر بلگرامی نے اپنے نام سرور کا ایک خط اپنے تذکرے میں جلوۂ خضر (جلد دوم) حصہ اول، میں درج کیا ہے۔ [۵۳]

ایک خط کو یونس جعفری نے ''نوائے ادب'' کے جولائی ۱۹۳۳ء میں شائع کیا تھا۔

''انشائے سرور'' کے خطوط میں مرزا احمد علی نے تاریخ وار ترتیب ملحوظ نہیں رکھی ہے۔ شروع کے خط بعد میں، بعد کے خط شروع میں درج کر دیے ہیں۔ اکثر خطوط پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔ بہت سے خطوں کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ بعض نام، مقام تحریر اور تاریخ درج کر دیتے تو قیاس آرائیوں سے بچا جا سکتا تھا۔

''انشائے سرور'' میں عرضی نمبر ۹ ہے جس پر سنہ اس طرح درج ہے۔ یکم اپریل ۱۸۵۶ء مطابق ۲۴ رجب ۱۲۷۳ ہجری۔ اس کے علاوہ رقعہ نمبر ۱۵ میں اس طرح درج ہے۔ ۱۲ رمضان ۱۲۷۴ ہجری مطابق ۴۹ رمضی سنہ حال۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے سرور کو اولین اردو مکتوب نگار مانتے ہوئے ان کی ایک عرضی کی سنہ تصنیف و تاریخ متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی ایک عرضی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ بادشاہ نصیر الدین کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''یہ عرضداشت ۱۸۲۳ء اور ۱۸۳۷ء کے درمیان لکھی گئی جو نصیر الدین حیدر کا زمانہ ہے۔ اس طرح سرور کو جو غالب اور بے تجربہ دونوں سے بڑے تھے مکتوب نگاری میں بھی تاریخی اعتبار سے اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔'' [۵۴]

اگر اس عرضی کو ۱۸۲۳ء اور ۱۸۳۷ء کے درمیان کا مان لیا جائے تو بھی خطوط کی تاریخ تحریر کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا کیونکہ خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مرتب کرتے وقت تاریخی

تسلسل کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔

رجب علی بیگ سرور خطوط میں مرزا احمد علی کو خطوط نویسی کے متعلق ہدایت اس طرح دیتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ سرور کی نظر میں خطوط نویسی کا معیار کیا تھا۔ سرور کا خیال ہے کہ خط کا مقصد پیغام رسانی ہے اور یہ پیغام رسانی مبہم نہیں ہونی چاہیے۔ خط میں پوری طرح انکشاف ہو جائے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ''انشائے سرور'' میں ملتی ہیں:

> ''رقعہ عزیز از جان سعادت توامان عافاہ عمرہ۔ بعد دعا معلوم ہو خط تمہارا انکل پچو جو مشہور ہے دیا لکھا ہوا تیسری تاریخ چار شنبہ کو آیا یہ جو لکھا ہے کہ پہلے خط بھیج چکا ہوں یہ کیا سبب ہے کہ نیا آیا وہ نہ آیا۔ اگر یہ بھی نہ آتا تو معلوم ہوتا کہ لکھا ہوگا وہ کیوں نہ آیا اس سے معلوم ہوا کہ جو بھیجا آیا وہ وہی ہیں، رہا مرزا حسین بیگ صاحب کا حال لکھا کہ آئے دوسرے دن چلے گئے۔ خط برائے انکشاف حال ہے نہ کہ برائے فال مجھ کو علم غیب نہیں کہ سمجھ جاتا کون سے دن آئے کب چلے گئے۔ قرینہ یہ تھا کہ فلاں تاریخ یہ دن تھا وہ پہر کو یا سہ پہر بیٹھے، اس وقت آئے اور فلاں تاریخ اس دن گئے یوں لکھتے اس قدر جلدی تمہارے مزاج میں ہے کہ مختصر و الحمر لکھتے ہو یہ رسم تحریر نہیں دوسرا ہو دیکھے گا تو سمجھے گا نام رکھے گا خیر جو ہوا سو ہوا آئندہ ایسا نہ ہو یہی نہ دو سطریں زیادہ ہو جائیں گی خط کا حاصل یہ ہے کہ حقیقت مفصل ذہن نشین ہو جائے۔'' [۵۵]

اس طرح ایک دوسرے خط میں احمد علی کو لکھتے ہیں:

> ''تمہارا خط آیا جو تم نے لکھا تھا مفصل معلوم ہوا۔ یہ بھی خوبی قسمت ہے جو خط کہیں سے آئے اس میں ایسا حال ہو کہ سن کر رنج و ملال ہو وحشت بڑھ جائے ایسی خبر نہ ہو کہ جس سے دل کو سرور ہو کچھ کلفت دور ہو۔'' [۵۶]

سرور نے اپنے خطوط میں گھریلو گفتگو کا اسلوب بھی اختیار کیا ہے لیکن یہ خصوصیت ان کے خطوں میں ہر جگہ موجود نہیں بلکہ کہیں کہیں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''تم کو کس کس منت و سماجت سے لکھا کہ اگر چند روز کے بعد چار حرف لکھ کر

بھیجو تو تمہاری تسکین ہو۔ لیکن تمہارے خیال میں ہرگز نہ آیا۔ طرہ اس پر یہ کہ خط میں لکھا اس کا مقصود وہ تھے کیا قصور ہوا کہ جواب نہ آیا۔ بھلا ستوؔ دونوں خط آئے یہ تیسرا خط کیونکر آیا جس کو بھیجا وہ پہنچا جو نہ لکھا اس کا ذکر کیا۔"

انشائے سرور میں سرورؔ کے مختلف انشائی رنگ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے رقعات کی نثر رنگین، مقفیٰ اور تشبیہات و استعارات سے پر ہونے کے باوجود سادگی، سلاست پر جستگی کی بھی نمائندگی کرتے ہیں جو اس بات کی گواہ ہے کہ سرورؔ نے بدلتے ہوئے رجحانات کے علاوہ وہ متعلقہ مراتب کا بھی خیال رکھا ہے۔

'انشائے سرور' میں شامل خطوط سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرور بیگمات واجد علی شاہ کے بھی نامہ نویس رہے ہے۔ ان خطوط میں سرورؔ نے اپنی انشاء پردازی اور رنگینی کی تمام تر رعنائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"شاہنشاہ کشور وفاداری ادیب دبستان دل فریبی وجفا کاری مو جد ناز و نیاز معشوق فراموش عاشق نواز کج کلاہی کی دھوم ہے۔ زمانہ محکوم ہے شکایت فرق میں دفتر سیاہ ہوئے حکایت شورش اشتیاق کے پروانہ گواہ ہوئے تحریر کا سلسلہ صبح وشام جاری ہے لیکن ہاتھ اور قلم عاری ہے۔ ناکام ہے کثرت کے باعث زبان زد خاص وعام ہے۔ اس کا بھی اب تک آغاز ہے نا انجام ہے۔"

پرانے زمانے میں خطوط انشاء پردازی اور رنگین نگاری کے جوہر دکھانے کا بہترین ذریعہ تھے اور انشا پردازی سیکھنے کے لیے جن کتابوں کا مطالعہ ضروری سمجھا جاتا تھا ان میں بھی زیادہ تعداد خطوط کے مجموعوں کی ہی تھی جن کی زبان بہت رنگین ہوا کرتی تھی۔ مثلاً انشائے مادھو رام، رقعات بھی زائن اور رقعات امان اللہ وغیرہ۔ سرورؔ بھی اسی زمانے کے انشاء پرداز ہیں اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ سرورؔ کے خطوط کا اسلوب بھی رنگین، پیچیدہ اور انشاء پرداز ہوگا لیکن جب ہم ان کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر قدامت سے دامن چھڑا رہی ہے اور سرور قدیم اور جدید کے درمیان ایک کڑی ہیں۔ سرورؔ کے خطوط کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں:

"سرورؔ کی مکتوب نگاری کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انشاء پردازی کے وہ جوہر نہیں دکھائے گئے جو عبارت کا عیب بن جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک بات کو ایک دفعہ کہا اور بہت اچھی طرح کہا۔ ایسا نہیں کہ ایک ہی بات کو طرح طرح سے کہہ کر بے معنی اور بے اثر کر دیا ہو۔ ان کے مکاتیب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر اور مکاتیب کی زبان قدیم انشاء پردازی سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن ابھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔"

سرورؔ کے خطوط میں القاب و آداب اور تمہید میں روایتی طرز کی خطوط نویسی کا انداز بھی ملتا ہے۔ کوشش کی ہے کہ مقفیٰ کی شان بنی رہے اس لیے لمبے چوڑے القاب و آداب سے نوازتے ہیں مثلاً برخوردار نور چشم راحت جان طول عمرہ بعد دعا اور درازی عمر کے معلوم ہو کہ۔ بعد از سلام مسنون الاسلام و اشتیاق مالاکلام گزارش حال ہے وغیرہ۔

احباب کے نام خطوط میں سرورؔ نے مکتوب الیہ کے معیار و ذہنی مطابقت کے علاوہ اس کی دلچسپی کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ان مکتوبات میں القاب و آداب میں سادگی اور اختصار کو ملحوظ رکھا ہے مثلاً جناب والا بندگی عرض کرتا ہوں، قبلہ بندہ تسلیم بجالاتا ہوں وغیرہ۔

غالب اور سرورؔ کی دوستی کا اندازہ نہ صرف غالب کے خطوط سے ہوتا ہے بلکہ 'انشائے سرورؔ' کے بعض رقعات سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ سرورؔ کے خطوط کے بعض جملوں سے واضح طور پر غالب کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

"قبلہ بندہ تسلیم بجالاتا ہوں جو کام کیا کرتا ہوں اس کی داد پاتا ہوں۔ آپ کی پوسٹ ماسٹر تک رسائی ہے میں نے ہرکاروں سے رسم بڑھائی ہے گو ہم پلہ نہیں کم ہوں مگر قدم بقدم ہوں آپ ساقدر دان مجھ سا پرو جانفشاں اگر فلک تفرقہ پرداز اپنی عادت بدلے دو ایک جا ہو جائیں عجب لطف ہو بڑے بڑے تماشے نظر آئیں۔"

"واللہ ہر بار دلی دیکھنے کا خیال ہے اگرچہ فلک کو منظور ہے تو مثل مشہور ہے دلی ابھی دور ہے۔"

سرورؔ کے خطوط میں اکثر منکالے کا انداز بھی ملتا ہے۔ سرور کی شخصیت اور ان کے داخلی جذبات کا پرتو ان کی تحریر میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے خطوط بے تکلف مکتوب نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ مرزا احمد علی کے نام لکھے گئے تقریباً ہر خط میں خود نوشت کے کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ان کے خطوط میں سفر کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کے بیان اور تفصیلات سے سفر نامے کا سا انداز ہوتا ہے۔ سرورؔ کے خطوط سے ان کے ذاتی تعلقات کا اندازہ اور کیفیات سے بھی کم وبیش واقفیت ہوتی ہے۔ ان کے خطوط میں سلاطین اکابر و مشاہیر کے علاوہ اس دور کی زندگی کے معاشی و اقتصادی حالات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اس دور میں ہونے والے فسادات، وبائی بیماریاں سیاسی و سماجی غارت گری کی جھلکیاں اور اس میں خصوصاً لکھنؤ کے حالات کا بیان ملتا ہے۔ آج کے دور میں مسلمانان ہند کے مسائل میں جو اہم مسئلہ ہے، وہ بابری مسجد، رام جنم بھومی کے نام سے ہے۔ اس کا ذکر یعنی بابری مسجد کا ذکر سرورؔ کے خطوط میں ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسئلہ سرورؔ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ بابری مسجد سے متعلق ایک خط سے مثال ملاحظہ کیجیے:

"ہندو مسلمان کا جھگڑا ہندوستان کو دونوں سے سروکار نہیں۔ مہتمم اخبار نہیں فقط ارشاد بجا لاتا ہوں متعجب ہو جیسے مشہور داستان سناتا ہوں ذیقعدہ کے مہینے میں مولوی غلام حسین صاحب نام اہل اسلام فیض آباد میں گئے۔ یہ دعویٰ کیا کہ ہندوؤں نے ابتدا کی خاطر مسجد ڈھائی ہے کلس کی دہائی ہو یہ خبر سن کر مسلمانوں کا مجمع ہوا عالم سلطان پور کا نائب اہل علی ہے اسے کہتے ہیں خشت شقی ہے۔ مسلمانوں کو روکا کہا دو روز چپ رہو دنگا نہ کرو ہم فیصلہ کر دیں گے۔ رشوت پہلے سے کھا چکا تھا۔ زر نقد کیسہ میں آ چکا تھا۔ مسلمانوں کو حیلہ سے ٹالا جب لوگ پراگندہ ہوئے جاہل ہندو دوڑ پڑے مسلمانوں کو مسجد میں گھیر لیا وہ جو شہر کے مہتمم تھے انھوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا گو قلیل تھے مگر کثرت سے ہندوؤں کو مار کر مر گئے ساکے کر گئے ستر مسلمان تھے چالیس قرآن شہید ہوئے سی پاروں کو ہزار پارہ کیا کام تمام کیا رکھ جانے کچھ نہ بچے کے صحرا یوں کے ذائقہ

بنانے حاکم ملعون شر کو خیر سمجھا بے گناہ مسلمانوں کا قتل ہوا سیر سمجھا سرکار میں جو خبر ہوئی کچھ تدبیر تقریر نہ نظر ہوئی اب مولوی امیر علی ساکن امیٹھی نے عزم جہاد قصد فیض آباد کیا اودھ اجودھیا اسی کا نام ہندوؤں کے تیرتھ کا مقام ہے۔ قبر عالمگیری بڑی مسجد ہے اس کی یہ وقعت کھوئی ہے کہ اس کے صحن میں سیتا کی رسوئی ہے کہیں سنکھ پھنکتا ہے بم بم کی صدا ہے کہیں تکبیر کی آواز ہے تسبیح کا کھٹکا ہے گنگا مدار کا ساتھ نیا انداز ہے وہاں سے قریب ہنومان گڑھی ہے اسی کے کھودنے کی خاطر مسلمانوں کی بھیڑ پڑی ہے ابھی تک دریاباد میں کہ وہ منزل لکھنؤ سے یہ مقام ہے مولوی امیر علی صاحب کا قیام ہے دو ہزار مسلمان کل ان کے ہمراہ ہیں اور ان کو گھیرے ہوئے کئی پلٹنیں ستاون ضرب توپ گرد جناب سلگتا ہے اور بہت سے ملازم بادشاہ ہیں۔ سرکار سے ممانعت ہے آگے بڑھنے نہ پائیں ہاتھی گھوڑوں پر چڑھنے نہ پائیں اور مولوی صاحب کا یہ قول ہے خدا کی راہ میں سر نذر کیا مرنا اختیار کیا۔" ۲۲

سرور کے خطوط میں جا بجا ان کے افکار و خیالات اور خاص طور پر زمانے کی نیرنگیاں اور موت و حیات کے موضوع پر کئی جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے افکار و خیالات زیادہ تر ان کے تجربوں کے عکس ہیں۔ سرورؔ کے خطوط کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ ان میں سرور کی شخصیت و کردار کے بہت سے پہلو اور ان کی سوانح حیات کے ساتھ ان کے عہد کے حالات کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے ان کے خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"انشائے سرور نہایت اہم کتاب ہے اس کے مطالعے سے مصنف اور اس کے زمانے کے متعلق بہت سی اہم باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ الحاق اودھ ۱۸۵۶ء کے بعد وہاں کے لوگوں پر کیا گزری لوگ کس طرح زندگی سے عاجز تھے۔ خود سرورؔ کی کیا حالت تھی اور کن کن مصائب سے وہ دوچار ہوئے۔" ۲۳

نیر مسعود لکھتے ہیں:

"مجموعی حیثیت سے سرورؔ کے خطوط کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی، ان

کے خطوط صرف زبان اور اسلوب کے لحاظ سے قابل قدر نہیں ہیں بلکہ اس ادبی اہمیت کے علاوہ ان میں ایک طرف سرورؔ کی شخصیت و کردار کے بہت سے پہلو، ان کے افکار و خیالات کے بہت سے نمونے اور ان کی سوانح حیات کے بہت سے اوراق موجود ہیں اور دوسری طرف ان کے عہد کے حالات اور مختلف النوع معلومات کا خزانہ بھی چھپا ہوا ہے۔ ان خطوں میں ایک انسان، ایک معاشرہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یہی ایک خطوط نویس کی بڑی کامیابی ہے۔"[۳۶]

سرور کے خطوط کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے طرز قدیم اور طرز جدید دونوں میں خطوط لکھے۔ وہ اس لیے قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے اپنے ماحول سے ہٹ کر اس طرز کو اختیار کیا۔



خواجہ غلام غوث بےخبر

اردو کے ابتدائی مکتوب نگاروں میں خواجہ غلام غوث بےخبرؔ کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ جہاں تک رجب علی بیگ سرورؔ کے خطوط کا تعلق ہے، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر قدامت سے دامن چھڑا رہی ہے اور سرورؔ قدیم و جدید کے درمیان کی ایک کڑی ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ غلام غوث بےخبرؔ کے مکاتیب کی شان بیک وقت قدیم و جدید ہونے میں پنہاں ہے۔ ان کے خطوط کی یہی خوبی اس دور کے تغیر پذیر انداز فکر اور نثری اسالیب کی ترجمانی کرتی ہے۔

خواجہ غلام غوث بےخبرؔ کے رقعات اردو کا پہلا مجموعہ "فغان بےخبر" کے عنوان سے ۱۸۹۱ء میں نامور پریس الٰہ آباد سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۲۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ امیرالدین احمد الٰہ آبادی نے "فغان بےخبر" کو مرتب کیا تھا۔ اس مجموعے کے سرورق کے بعد والے صفحے پر اطلاع کے عنوان سے اس طرح لکھا ہوا ہے:

"اطلاع

یہ کتاب بموجب ایکٹ ۲۵ ۱۸۶۷ء داخل رجسٹر

گورنمنٹ ہوئی کوئی صاحب بلا اجازت

چھاپنے کا ارادہ نہ فرماویں۔

العبد

امیرالدین احمد از محلہ یحییٰ پور

دایرہ حضرت شاہ

رفیع الزماں

قدس سرہ

واقع

شہر

الٰہ آباد"۹۵

"انشائے بے خبر" میں شامل ایک خط سے امیر الدین احمد اور غلام غوث بے خبر کے تعلقات سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

"میں نے کبھی اپنے کو انشا پردازوں میں اور شاعروں میں شمار نہیں کیا۔ اس سبب سے اگر کبھی بے اختیاری دل سے کوئی والہ بیرایہ نثر میں یا کوئی فقرہ سلسلہ نظم میں لب تک آیا اور طنازی خامہ نے اسے گوشِ صفحہ تک پہنچایا تو وہ ترتیب اور تدوین سے ناکام رہا۔ میرے ایک عنایت فرمانے جو اس شہر کے مشاہیر روسا سے ہیں اور مجھ پر مجھ سے زیادہ شفقت فرماتے ہیں، ان اوراق پریشاں کو شیرازہ بند جمعیت کر کے زینت اشاعت مزین کرنے کی غرض سے چھپوا دیا ہے۔ میرے پاس اس کی جلد نہیں ہے، انھیں کے پاس ہے۔ ان کا نام نامی مولوی امیر الدین احمد صاحب آنریری مجسٹریٹ اور ان کا سکونت الٰہ آباد محلہ یحییٰ پور ہے۔ ان سے آپ طلب فرمائیں تو وہ بے تامل بھیج دیں گے۔"۹۶

خواجہ غلام غوث بے خبر کی دیگر تصنیفات میں "خوننابہ جگر"، "رشک لعل و گوہر" اور "انشائے بے خبر" شامل ہیں۔ بے خبر کی تصنیفات سے متعلق سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے اس طرح لکھا ہے:

"خواجہ غلام غوث بے خبر کی دیگر تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

خوننابہ جگر	فارسی رقعات
فغان بے خبر	اردو رقعات ونثر ۱۸۹۱ء سال طبع
رشک لعل و گوہر	بقیہ مجموعہ نظم ونثر ۱۹۰۸ء سال طبع

انشائے بے خبر۔"۹۷

بے خبر کے مکاتیب کا ایک مجموعہ "انشائے بے خبر" کے عنوان سے ۱۹۳۰ء میں منظر عام پر

آیا۔ اس کو انعام اللہ شہابی نے مرتب کیا تھا۔ یہ مجموعہ ایک سو چار صفحات پر مشتمل ہے جس میں خطوط کی تعداد اکیس ہے اور تیں مکتوب الیہم کے نام ایک ایک خط ہے۔ صرف اسد اللہ خاں غالب کے نام دو خطوط ہیں۔ کسی بھی خط پر سنہ وتاریخ موجود نہیں ہے۔ صفحہ ایک سو چار پر بے خبر کی تحریر کا عکس موجود ہے۔ یہ مجموعہ مرتضائی پریس آگرہ میں چھپا اور مقدمہ حامد حسن قادری نے ۴ر جولائی ۱۹۳۰ء کو تحریر کیا تھا۔ اس مجموعے کی ابتدا میں سوانح اور حالات زندگی بھی درج ہیں۔ صفحہ ۲۲ پر مولانا انعام اللہ شہابی کے خاندانی حالات درج ہیں، ساتھ میں غلام امام شہید کے خاندانی حالات اور ان کی تصنیفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مرزا غالب اور مرزا حاتم علی بیگ کی تحریریں بھی موجود ہیں۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے ۱۹۶۰ء میں چھیالیس صفحات پر مشتمل بے خبر کے خطوط کا دوسرا مجموعہ "انشائے بے خبر" کے عنوان سے ہی شائع کیا۔ یہی مجموعہ (۱۹۶۰ء) میرے پیش نظر ہے۔ اس مجموعہ میں مکتوب الیہم کی تعداد ستائیس ہے۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے بے خبر کی حیات وفن پر مقدمہ قلم بند کیا ہے جس میں چند نئے پہلوؤں کی نشان دہی کے ساتھ بے خبر کے متعلق کافی معلومات فراہم ہوتی ہے۔ "انشائے بے خبر" کے مقدمہ میں سید مرتضیٰ حسین بلگرامی اس مجموعہ کی اشاعت کے متعلق لکھتے ہیں:

"انشائے بے خبر" عرصہ سے کم یاب تھی۔ جناب خواجہ احمد فاروقی کی عنایت سے ایک پرانا اور بوسیدہ نسخہ ملا، جو بہ یہ قارئین کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں میری تمنا تھی کہ بے خبر کے کچھ اور خطوط مل جاتے تو اس مجموعہ میں شامل کر دیتا۔ جہاں جہاں اس کے متعلق دریافت کر سکتا تھا، کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔"۹۸

خطوط پر تاریخ وسنہ کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ مجموعہ کے آخری خط میں "نقل عکس تحریر حضرت بے خبر" کے عنوان سے مرزا قمر الدین کے نام ہے۔ اس پر ۷ر جون ۱۸۹۵ء مقام الٰہ آباد درج ہے:

نقل عکس تحریر حضرت بے خبر

عزیز گرامی منشی مرزا قمر الدین صاحب زاد اللہ قدرکم!

میں نے ہر چند قصد کیا کہ میں اخباروں اور جنتری کو دیکھوں جن میں حضرت

سیدنا امیر ابو العلا صاحب قدس سرہ کے درگاہ عالم پناہ واقع اکبر آباد کی نسبت مضامین اور مراسلے چھپے ہیں مگر افسوس ہے کہ مجھے اوس کی فرصت نہ ملی اور میں مجبور رہا۔

راقم

فقیر غلام غوث بے خبر میر منشی

محکمہ عالی گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی

اودھ ملقب بہ خواجہ و ملقب بہ خطاب

خان بہادر و ذوالقدر از سرکار دولت مدار انگلشیہ

۸ جون ۱۸۹۵ء مقام الہ آباد

نوٹ: اصل خط ملک ڈاکٹر مرزا سعید الدین احمد سجادہ نشین درگاہ امیر ابو العلا احراری۔(۲۹)

"انشائے بے خبر" میں خطوط کے علاوہ غلام امام شہید کی "انشائے بہار بے خزاں" کی تقریظ بھی شامل ہے۔ مولوی غلام امام شہید بے خبر کے رشتے کے خسر ہوتے تھے۔ بے خبر نے غلام امام شہید کا دیوان مرتب کر کے اس کا دیباچہ لکھا تھا وہ بھی "انشائے بے خبر" میں "دیوان" کے عنوان سے شامل ہے۔

دیوان مرتب کر کے اس کا دیباچہ لکھنے کے متعلق بے خبر شہید کے نام ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں:

"قبلہ! میری شوخی دیکھیے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا سعی عمل کرتا ہوں۔ لعل کے روبرو میں رنگ کی دکان کھولتا ہوں۔ قند کے مقابلہ شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں جاں بخشی کی روایت سنیے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ بیضا کی چمک دیکھیے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں

پیش کرتا ہوں۔ میرے لیے اس کا دیباچہ لکھنے کا ارادہ ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں مرے۔ اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے! گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے! اگرچہ طلب و شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی، یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں کیا کہوں اور کیا کرتا ہوں، دیباچہ بھی لکھ ڈالا۔"۲۹

سید مرتضیٰ حسین "انشائے بے خبر" کے مقدمہ میں خطوط سے متعلق لکھتے ہیں:

"انشائے بے خبر" خواجہ غلام غوث بے خبر کے ان خطوط اور مقدمے وغیرہ کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے دوستوں، ساتھیوں اور عزیزوں کو لکھے۔ اس مجموعہ میں جو خطوط درج ہیں ان کا انداز نگارش اگرچہ انیسویں صدی کے اول کی نگارشات کی طرح اور اس پر دور سرسید کے پہلے کے مکاتیب و تحریر کا اطلاق ہوتا ہے مگر مجموعی حیثیت سے انشاپردازی کے نئے اسلوب اور جدید رجحانات کا میلان بھی ملتا ہے۔"۳۰

خواجہ غلام غوث بے خبر کے خطوط میں دو اسالیب ملتے ہیں۔ پہلا قدیم اور مقفیٰ دوسرا سادہ اور سلیس۔ خط نگاری کا اوّلین دور جبکہ قدریں بدل رہی تھیں۔ فکری میلانات ارتقا پذیر ہو رہے تھے۔ ساتھ ساتھ قدامت کا رنگ بھی جاری و ساری تھا۔ خط نگاری کو انشاپردازی کا نمونہ بنایا جاتا تھا۔ بے خبر نے اپنے خطوط میں سادہ اور سلیس کے علاوہ ایسے مقفیٰ اور مسجع اسلوب کو جگہ دی جو قافیہ بندی اور شعری صنعتوں سے آراستہ ہے۔ جگہ جگہ تلمیحات اور بے ساختہ تشبیہات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے لکھا ہے:

"ویسے بے خبر پر بیدل اور فارسی شعرا اور اس کے ادب کا بے حد اثر ہے، جس نے زبان کو ثقیل دے دیا ہے، اس کے باوجود ان کی تحریروں میں جابجا شوخی کی جھلک، قوس قزح کا رنگ، زبان کی فصاحت اور لچک، خیال کی وسعت آفرینی اور انشاپردازی مکمل صورت میں موجود ہے۔"۳۱

عام طور پر تقریظ اور دیباچہ نویسی کی روش یہ رہی ہے کہ لکھتے وقت مبالغہ آمیز ستائش اور

کتاب کی مدح کے ساتھ ساتھ تواضع اور انکساری سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ پیرایۂ بیان میں صرف الفاظ کی بازی گری، پر تکلف بندشوں اور رنگین فقروں اور جملوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ ایک ہی بات کو انداز بدل بدل کر پیش کرنا انشا پردازی کا انتہائی کمال سمجھا جاتا تھا۔ بے خبر کے خطوط کی اسی خوبی نے خطوط میں وہ دلکشی پیدا کر دی ہے کہ ہر فقرہ ایک نیا لطف پیدا کر دیتا ہے۔ "انشائے بہار بے خزاں" کی تقریظ سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

"تقریظ

انشائے بہار بے خزاں از مولانا غلام امام شہید

مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کے سیر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ صفحہ قرطاس پر کیا جوش بہار معانی ہے! تار نگاہ میں بے تکلیف موتی پروئے جاتے ہیں۔ واہ وا! کلک گہر بار کی کیا در فشانی ہے! سبحان اللہ! یہ کیسی انشا ہے؟ جس کے دیکھنے سے پر لطف اٹھتا ہے۔ کتاب ہے یا گلزار بے خزاں۔ جس صفحہ کو دیکھیے حاشیہ فردوس کے روشوں پر حاشیہ کھنچتا ہے۔ جدول کے خطوں پر سلسبیل اور کوثر کا بھی پانی پانی ہوتا ہے۔ سطریں سنبلستان ہیں۔ الفاظ گلستان ہیں۔ حرف کی کششوں پر سرو اور شمشاد کا یقین ہوتا ہے۔ دائروں سے نرگستان آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے۔" ۲؎

بے خبر نے ایسے خطوط بھی لکھے ہیں جس میں انھوں نے انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ "فغان بے خبر" میں شامل ایک خط میں اپنے دوست کے خط کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

"تمہارا خط میرے پاس آیا۔ قاصد کو آتے دیکھ کر خیال ہوا کہ ساقی معہ چنگ و رباب آتا ہے۔ کاغذ کا تھیلا گلے میں دیکھنے سے سمجھا کہ ظالم بغل میں چھپائے ہوئے مینائی شراب لاتا ہے۔ خط کے ہاتھ میں آتے ہی تصور کیا دامن دل دار ہاتھ میں ہے۔ خوشبو جو دماغ میں سمائی معلوم ہوا زلف تابدار ساتھ میں ہے۔ لفافے کو جب وا کیا مدعا حاصل کیا۔ نامہ کی سفیدی پر نظر پڑی تو جی نے کہا شب تاریک فراق کی صبح کا نور ہے۔ اوس کی سیاہی پر نگاہ گئی تو دل بولا شب وصل کی شام کا

ظہور ہے۔ حرفوں کے دوائر نے دور جام کا کام کیا۔ بادۂ مضامین نے ہوش کا کام ہی تمام کیا۔" ۳؎

انشا پردازی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"خدا کا شکر کرو کہ اس نے حسین محبوب صورت مرغوب سیرت حسن شمائل پسندیدہ خصائل فہم رسا ذہن وذکا عقل سلیم طبیعت مستقیم علم مفید بخت سعید تقریر کی فصاحت تحریر کی بلاغت اخلاق تام قبولیت عام صولت ثروت قدرت حکومت نیک نامی کا شہرہ شادکامی کا بہرہ عزت کی دولت، دولت کی عزت سب کچھ دیا ہے۔ سویدا کی صورت ہر جگہ ہر ایک دل میں ہے۔ پتلی کی طرح مقام آنکھوں کے تل میں ہے۔ جسے دیکھو اس کی وضع پاؤں پر سر جھکائے ہوئے جس پر نظر کرو رکاب کی مثال قدم آنکھوں سے لگائے ہوئے خواص کو یہ تمنا کہ طرہ کے مانند سر پر چڑھ جائے عوام کی یہ خواہش کہ خاک رہگزر کی شکل سواری کے پیچھے پس جائے عطر کے مشابہ جس بزم میں آئے مہک اٹھے۔ آفتاب کے مثال جس طرف رخ کیا جائے چمک اٹھے، جس مکان میں تم نہیں وہ چمن بے لالہ رنگ ہے۔"

بے خبر نے خطوط میں اپنی انشا پردازی سے مناظر قدرت کو بہت ہی خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ خطوط میں صبح، دوپہر، شام کا سماں دکھایا ہے۔ ان تحریروں میں مقفیٰ فقرے، مبالغہ اور تشبیہات وغیرہ سے کام لیا ہے اور ساتھ میں سادہ و سلیس عبارتیں بھی موجود ہیں۔ "فغان بے خبر" میں ایک تحریر ایسی شامل ہے جس میں انھوں نے صبح، شام اور دوپہر کے سماں کی منظر کشی اپنے ایک دوست کی فرمائش پر کی ہے۔ صبح، دوپہر اور شام کا منظر ایسا کھینچا ہے کہ لگتا ہے کہ قاری اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہو یعنی اس منظر کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ منظر کشی میں موزوں اور مکمل تشبیہات پیدا کی ہیں۔ صبح کے منظر کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

"رات آخر ہوئی صبح صادق کا جلوہ نظر آنے لگا۔ ستارے جو رات کی تاریکی میں چمک دمک دکھا رہے تھے، اپنی روشنی کو پھیکی دیکھ کے شرمائے اور آہستہ آہستہ

غائب ہونے جیسے چور رنگ آزکا ہوتے ہی اپنے اپنے ٹھکانے کو بھاگتے ہیں۔ شب کی سیاہی کا رنگ اڑا، مشرقی افق پر سپیدۂ صبح نمودار ہوئی گویا محبوب صبح نے رات کے سیاہ بکھرے ہوئے بالوں کو چہرے سے سمیٹ لیا اور اس کی نورانی پیشانی نظر آنے لگی۔ نسیم سحری معشوقوں کی طرح خوش خرامی کرتی ہوئی چلی نرم نرم شاخیں درختوں کی ستون کے مانند جھومنے لگیں، جانوروں نے چہچہانا شروع کیا، باغ میں غنچے کھلنے لگے جیسے نیند سے کوئی آنکھ کھولے۔ دریا میں ریل پیل لہریں پڑیں کا تب قدرت نے قلم شعاع سے زرنگار کرنے کے لیے صفحۂ آب پہ مسطر کیا شاہی نوبت خانہ کے کوس و دہل کی آواز بلند ہوئی۔ جس کی سریلی آواز سے لوگ نیند سے چونک گئے اور اپنے اپنے کام سے لگے۔" ۶۴

بے خبر کے خطوط کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم میں وہ خطوط آتے ہیں جو انھوں نے دوستوں اور احباب کے نام یا ان کے سوالات کے جواب میں لکھے ہیں۔ یہ خطوط ادبی اور علمی گفتگو سے معمور ہیں۔ دوسری قسم کے خطوط محض نجی اور ذاتی حالات پر لکھے گئے ہیں جو بے تکلفی اور بے ساختگی کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بے خبر شاعرانہ نکات معنی و بیان، مسائل تصوف اور ان کے رموز پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا طرز استدلال دلنشین اور سنجیدہ ہے۔ "انشائے بے خبر" میں شامل [illegible] محمد عابد کے نام ایک خط جس میں بے خبر نے ذوق کے شعر کی تشریح کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ذوق کے اس شعر کے معنی جو آپ پوچھتے ہیں:

ہیں آئینہ میں صورت تصویر آئینہ
آئینہ رو کے سامنے حیرانوں میں ہم

یہاں صورت کے معنی لغوی یعنی نقش اور پیکر یا مجازی یعنی چہرہ و عکس مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی اصطلاحی سے مراد ہے جس طرح کیفیت اور حالت اور وضع اور شکل وغیرہ۔ صورت کو ان معنوں میں اساتذہ نے بھی مستعمل کیا ہے۔" ۶۵

"سادہ و سلیس انداز کے پیش نظر بے خبر کو مقلد قرار دیا جاتا رہا، لیکن انھوں نے اسلوب سادہ اختیار کیا ہو یا مقفیٰ و مسجع دونوں ہی انداز کی تحریریں ایک شان دلفریبی لیے ہوئے ہیں۔ ان کے خطوط کی بے ساختگی اور بے تکلفی نے انھیں اس لائق بنایا ہے کہ وہ غالب کے ہم پلہ کھڑے ہو سکیں۔ بے خبر کے ان خطوط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو صاف اور سادہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔" ۶۶

"دراصل زبان کا سلسلہ بڑا نازک ہے، عام بول چال اور تحریر و تقریر کی زبان میں جو فرق ہے، وہی فرق ایک صاحب طرز ادیب اور غیر ادیب میں ہوتا ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر ادیب اسی سوجھ بوجھ سے کام لے جو وقت کا تقاضہ ہو لیکن بے خبر نے اپنی بصیرت اور ذہنی ادراک سے زبان کا جائزہ لیا، اقدار کو پرکھا اور یہ عزم و حوصلہ مندانہ کام تھا جس نے پورے ادب کو متاثر کیا۔" ۶۷

بے خبر غالب کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور عمر میں غالب سے چھوٹے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے۔ غالب کے خطوط کے مجموعہ "عود ہندی" کو سب سے پہلے انھوں نے ہی مرتب کیا تھا۔ بے خبر غالب کو "عود ہندی" سے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نسخۂ عود ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آ گیا۔ میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا، کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں خود سب کو دیکھا جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے ان کو نکال ڈالا۔ کاتب لکھ رہا ہے۔ میں مقابلہ کرتا ہوں۔ اب تک بڑے ورقوں کے دس جز و مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ ادھر گلگشت کا آغاز ہو اور ادھر اس مجموعہ کا انجام ہو، میں اپنے حق سے ادا ہوں، چھپوانے کے لیے ان کے حوالے کروں اس وقت بھی مقابلہ میں

معروف ہوں، پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ، منشی حبیب اللہ صاحب ذکا، میاں داد خاں صاحب سیاح ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہوں گے آپ انھیں ایما کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بسبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں۔ رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے، شاید وہاں سے بھی کچھ آئے جب تک کتاب تمام ہو اور جس قدر خطوط ہاتھ آویں اور اس میں شامل ہوں غنیمت ہے۔''۷۸

بے خبر کے تعزیت نامے، تہنیت نامے اور شکریہ نامے جو کہ خالص روایتی تحریر گردانے جاتے ہیں، بے خبر نے ان میں بھی جدت پیدا کی ہے۔ فارسی و اردو اشعار کی شمولیت نے خطوط کی دل آویزی میں اضافہ کیا ہے۔ بے خبر کے خط اصول خطوط نویسی پر پوری طرح اترتے ہیں۔ ان کا بات کہنے کا طریقہ بہت خوبصورت اور دلچسپ ہے۔ جدید و سلیس خطوط میں نہ صرف ملاقات کا پہلو نظر آتا ہے بلکہ ان کی خلیق و منکسار طبیعت اور انکساری و ہمدردی سے بھرپور شخصیت کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ خطوط بڑی حد تک کسی ادیب کی شخصیت کو بھرپور انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ سید عبداللہ نے لکھا ہے:

''ہر حسین خط کاتب خط کی پوری شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے، تبھی تو وہ بے زبانی کے باوجود اور ظاہری انعکاسات سے بہت دور رہ کر بھی احسن الملاقات کا درجہ حاصل کر پاتا ہے۔ ورنہ پہاڑی گونج کی طرح محض خوف اور سراسیمگی یا ابہام کا پیکر بن کر بے اثر ہو جائے گا۔ اور ملاقات کی جذباتی تاثیر پیدا کرنے سے قاصر رہے گا۔''۷۹

''انشائے بے خبر'' میں ایک خط بھی ایسا نہیں ہے جس میں قدیم طرز کے طویل القاب و آداب پائے جاتے ہوں۔ ان خطوط کے القاب و آداب میں اختصار کے ساتھ جدت و ندرت بھی موجود ہے۔ کچھ خطوط میں القاب و آداب ہی موجود نہیں ہیں۔ مولوی محمد حامد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں اس خط کے عنوان کو القاب سے خالی رکھتا ہوں اس لیے کہ القاب مکتوب

الیہ کی شان کے موافق لکھا جاتا ہے، اور جب ان سے محض لاعلمی ہو تو کیا لکھا جائے اور آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنی شان کے لائق لکھ لیں۔''

۸۰

بے خبر کے جن خطوط میں القاب و آداب ہیں تو نہایت ہی مختصر ہیں۔ مثلاً جناب، جناب عالی، قبلہ، اجی حضرت، قدر دان میرے، مکرمی وغیرہ۔ بے خبر کہیں کہیں خط کی ابتدا شعر سے کرتے ہیں اور القاب کو سرے سے ہی ختم کر دیتے ہیں جس سے خط کی لطافت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اطہر علی فاروقی نے لکھا ہے:

''اس سلسلے میں خواجہ غلام غوث بے خبر کی ایک روش یہ بھی رہی ہے کہ وہ القاب و آداب کے بجائے خط کی ابتدا کسی شعر سے کرتے ہیں جو خط کی اجمالی تفسیر بن جاتا ہے۔ ادھر شعر پڑھا تار باجا راگ بوجھا کا مصداق بن گیا۔ مرزا غالب نے بھی کبھی کبھی ایسا کیا ہے لیکن بے خبر نے یہ چیز ایسی اپنائی ہے کہ خود ان کی معلوم ہوتی ہے۔''۸۱

بے خبر کے خطوط میں مرزا غالب کا رنگ جھلکتا ہے۔ کیونکہ ان کے اکثر خطوط میں سادگی اور سلاست کی وجہ سے شوخی و لطیف ظرافت پیدا ہو گئی ہے۔ مراسلے کو مکالمہ بنا دینے کی خوبی بھی بے خبر کے خطوط میں نمایاں ہے۔ مراسلے کو مکالمہ بنانے کا یہ انداز بے خبر اور سرور سے شروع ہوتا ہے اور غالب نے اسے درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ بے خبر کے خط جو انھوں نے حکیم محمد شفیع صفی پوری کے نام لکھا تھا اس سے مراسلہ کو مکالمہ بنانے کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

''اجی حضرت، عید ملنے آیا ہوں اٹھیے اور ملیے۔''۸۲

''پھر جو ہوش آیا تو اسی وقت ادھر کو چلا بہت جلدی کی دوڑتا ہوا آیا ہوں جو آج پہنچا۔''۸۳

''پھر یہ باتیں تو جانے دیجیے سویاں منگوایے یا دا سے بھی افطاری کی طرح ٹال لیے گا۔ معلوم ہوا آپ کچھ بھی نہ منگوائیں گے آپ کو ٹالنا خوب آتا ہے۔

لا یئے عطر و پان ہی عنایت کیجیے میں رخصت ہوتا ہوں۔''۸۴

بعض محققین کی رائے ہے کہ اردو خطوط نویسی میں بے خبر کو تقدم حاصل ہے۔ حالانکہ اس بات میں شک نہیں کہ اردو خطوط کی دلکشی و بے تکلفی کا سہرا غالبؔ کے سر ہے لیکن غالب اس کے موجد نہیں۔ موجد زمانۂ ایجاد کا صحیح تعین کرنا تو بہت مشکل ہے لیکن محققین و ناقدین نے خطوط کی ابتدا سے متعلق مختلف آرا پیش کی ہیں۔ حامد حسن قادری نے غلام غوث بے خبر کی مکتوب نگاری کی ابتدا سے متعلق لکھا ہے:

> ''اردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کی طرف ۱۸۲۹ء میں توجہ کی یعنی غالب سے بھی کچھ پہلے۔''۵۵

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے لکھا ہے:

> ''تذکروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۸۳۶ء سے قبل اردو نثر کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ روش عام سے ہٹ کر نثر کو آسان اور سادہ بنانے میں ان کا ہاتھ ہو یا نہ ہو مگر اس روش کی تبدیلی اور اس کے رواج دینے والوں میں ان کا شمار ضرور ہے۔ ورنہ اردو نثر میں جو سادگی اور پرکاری آج نظر آرہی ہے اگر اس عہد میں تبدیلی کی ابتدا نہ کی جاتی تو ممکن ہے ایک طویل مدت تک اس صنف میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی رونما نہ ہوتی۔ اسی طرح اس رائے سے اتفاق ممکن نہیں کہ مرزا غالب کی نثری تحریروں سے قبل بے خبر کے جو نثری شہ پارے ملتے ہیں۔ ان سے ان کو تقدم کا شرف حاصل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کی تحریریں بھی اسی زمانے سے ملتی ہیں اور ان میں سادگی و پرکاری کا وہی جوہر موجود ہے۔ القاب و آداب کی بے نیازی کا وہی التزام رکھا ہے۔ اس لیے یہ بات طے ہے کہ دونوں کے ذہن نے ایک ساتھ اور ایک وقت میں مروجہ نثر کو تبدیل کرنے کی ضرورت کا احساس کیا اور عملی قدم اٹھایا۔''۵۶

کسی ادیب یا غیر ادیب کی مکتوب نگاری کا دور باقاعدہ کب سے شروع ہوتا ہے۔ اس بات کی بہت اہمیت ہے۔ تمام تر فیصلے صرف اوّلیت کی بنیاد پر نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ غلام غوث بے خبر عمر میں غالبؔ سے چھوٹے تھے اور غالبؔ کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ بے خبر نے غالب کی

وفات کے بہت دنوں بعد تک خط لکھے۔ اس لیے وہ غالبؔ کے شریک عصر بھی ہیں اور ان کی خط نگاری غالبؔ کے بعد بھی جاری رہی۔ بعد کا یہ دور جس اسلوب نگارش اور شخصی اظہار سے آراستہ ہے اس کو سرور اور غالبؔ کے درمیان کی کڑی نہیں کہہ سکتے بلکہ اس اسلوب نگارش کا انجام کہہ سکتے ہیں۔ جس کے بہترین نمونے غالبؔ کے سامنے آئے اور بے خبر نے ان میں گراں قدر اضافے کیے۔

حامد حسن قادری بے خبر اور غالبؔ کے دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بے خبر کا اسلوب نثر اس زمانے سے جداگانہ نہیں ہے لیکن روش قدیم کے محاسن تحریر کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بے خبر بیسویں صدی کے شروع تک رہے ہیں لیکن ان کا طرز نگارش بھی انیسویں صدی کے نصف اول کا ہے اور اسی زمانے کے لکھنے والوں اور غالب کے ہم عصروں میں ہیں۔ اس لیے ان کو اسی دور میں شامل کر لیا گیا ہے۔''۵۷



مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

خطوط چونکہ انسان کی خارجی و داخلی زندگی کا بے تکلف مرقع ہوتے ہیں اس لیے ان میں انسان کے افکار و خیالات پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ انسان کی روح اس کے خطوط میں عریاں ہوتی ہے۔ خطوط کے آئینے میں انسان کی نفسیات کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں اور بہت سے دھندلے نقوش نظر آتے ہیں۔ انسانی زندگی کے کارناموں کا ریکارڈ تو مل جاتا ہے لیکن ان واقعات کو رونما کرنے میں دلی جذبات اور دماغی کیفیات کا کتنا حصہ ہے اس کا علم صرف خطوط کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ الجھے ہوئے مسائل کو خطوط کی روشنی میں ہی سلجھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے خطوط انسان کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔

یوں تو اردو ادب میں بہت سے مشاہیر ادبا نے خطوط نویسی کو فروغ دیا۔ اس کو نئے تقاضوں اور نئے ادبی شعور سے ہم آہنگ کیا اور ادب میں اپنے لیے ایک الگ مقام بنایا۔ مگر غالب کی طرز تحریر اس کی سادگی و پرکاری، اس کی جاذبیت و دلکشی اور اثر انگیزی کو کوئی بھی اپنا نہیں سکا۔ جذبات کی عکاسی ایسے بہترین پیرائے میں غالب نے کی ہے کہ وہ خطوط نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان کی خودنوشت سوانح عمری معلوم ہوتی ہے۔

اب تک موجود غالب کے اردو خطوط کی روشنی میں ان کی خطوط نویسی کا آغاز مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا پھر رفتہ رفتہ فارسی خطوط نویسی میں کمی اور اردو خطوط میں اضافہ ہوتا گیا۔ تقریباً ۱۸۶۱ تک فارسی میں خطوط لکھنے ترک کر دیے۔ ایک خط میں غالب فارسی چھوڑ کر اردو میں خط لکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے مولوی نعمان احمد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''برسوں سے فارسی خطوط لکھنا چھوڑ دیے ہیں۔ سب شہزادہ بشیر الدین نبیرۂ

ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے۔ اور وہ معاف ہیں اور میں مطیع۔''۵۸

غالب کے خطوط نویسی کی ابتدا کے تقریباً دس گیارہ سال بعد ان کے خطوط کی طباعت و اشاعت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ غالب کے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ اور شیو نرائن آرام دونوں کے خطوط موجود نہیں ہیں۔ لیکن غالب نے انھیں جو جواب دیا ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں شاگردوں نے غالب کے خطوط کی اشاعت کا سوال اٹھایا لیکن غالب اس سوال پر ناراض ہوئے اور انھوں نے اس کا جواب اس طرح دیا۔ ۱۸ رنومبر ۱۸۵۸ء کو منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

''اردو کے خطوط آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخن وری کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرورت ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ ان واقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے۔''۵۹

غالب کے خطوط کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں تفتہ کا خط آیا۔ اسے پڑھ کر ۳ رنومبر ۱۸۵۸ء کو منشی شیو نرائن کو لکھا:

''رقعوں کو چھاپے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں۔ البتہ اس باب میں میری بات پر تم کو اور مرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔''۶۰

اس طرح یہ مسئلہ پیدا ہوا اور دب گیا لیکن شیو نرائن اور تفتہ کی کوشش سے اس بات کی امکانی صورت سامنے آ گئی کہ غالب کے اردو خطوط کی طباعت میں احباب گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور کسی دن یہ تحریریں منظر عام پر آ کر رہیں گی۔

کچھ سال گزرنے کے بعد ۱۸۶۱ء میں عبدالغفور سرور مارہروی نے منشی محمد ممتاز علی خاں کے مشورے سے مرزا غالب کی اجازت حاصل کیے بغیر ان کے خطوط کی طباعت کا ارادہ کر لیا۔ وہ خطوط مرزا غالب نے سرور مارہروی کے نام لکھے تھے۔ انھوں نے ۳۱ خطوط کا مجموعہ ''مہر غالب'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ ۱۸۶۳ تک یہ مجموعہ مسودے کی شکل میں پڑا رہا۔ سرور نے اس کے

دیباچے میں لکھا ہے:

"ارباب علوم کو معلوم ہو کہ میں احقر الخلق، عبدالغفور متخلص بہ سرور، مارہروی بعد شعور سے اہلِ سخن کا طالب اور صاحب کمال کا خواہاں تھا۔ جب کلام بلاغت نظام رشک صاحب فخر طالب، جناب اسد اللہ خاں غالب کا دیکھا، دل کو بھایا، یکتا پایا، از بس کہ مراسلت میں قدم بڑھایا، ہر کتاب کا جواب آیا... جو نامہ کہ بنام میرے عبارت اردو تحریر کیا، مکتوب سادہ رویوں سے طرحدار تر، اور ہر سطر اس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرما زیادہ ہے، جس آنکھ نے دیکھا وہ بینا ہے۔ جس کان نے سنا وہ شنوا ہے۔ پس تنہا محظوظ ہونا اور آپ ہی آپ مزا اٹھانا خلاف انصاف جانا۔ دل مائل تمام بہ شہرت عام ہوا، اور ہنوز یہ قصد ناتمام تھا کہ بحسن اتفاق فخر زماں، وحید دوراں، جناب ممتاز علی خاں صاحب، متوطن میرٹھ... رونق افزا مارہرہ ہوئے... ایک روز محفل ممدوح میں ذکر صداقت و شیوہ بیانی جناب استاذی الحضرت درمیان آیا۔ ارشاد کیا کہ کلام میرزا صاحب نسیم جاں فزا اور شمیم دل کشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا۔ اردو بھی یکتا ہے۔ نظم و نثر فارسی تو کب کی حلیہ انطباع ہوا لیکن نثر اردو زیور طبع سے عاری رہا اگر وہ خطوط کے بنام تمہارے ہیں آئے اور تم لے جانے دیتے ہو تو میں اس کے انطباع کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ اس تقریر سے نسیم تاثیر سے غنچہ دل کھلایا۔ خلاف خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے تھے، ترتیب دیے۔ گویا جواہر بے بہا کان، قلم دان سے نکال کر کشتی اوراق میں جمع کیے۔ چونکہ محبت جناب غالب میرے حال پر بہت غالب ہے، لہٰذا نام اس انشا کا 'مہر غالب' مناسب ہے، سال ختم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا۔"۹۱

عود ہندی

منشی ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ اگر "مہر غالب" میں کچھ اور احباب کے خطوط بھی شامل

کر لیے جائیں تو مناسب ہوگا۔ اس دوران خواجہ غلام غوث بے خبر نے بھی غالب کے خطوط کا مجموعہ ترتیب کرنا شروع کر دیا تھا۔ غالب بھی اس میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ یہ مجموعہ جلد از جلد چھپ جائے۔ اور اس بات کا اظہار مختلف خطوط میں ہونے لگا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہاں حضرت کیسے ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی؟ وہ مجموعہ اردو چھپا یا چھپتا ہی رہے گا؟ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو بسرحد تقاضا پہنچا دیا ہے۔"۹۲

خواجہ غلام غوث بے خبر نے نسخہ "عود ہندی" کے مرتب ہونے کا ذکر غالب کے نام ایک خط میں اس طرح کیا:

"حضرت نسخہ عود ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہوا ہے۔ چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آ گیا ہیں لے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا، کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبر آباد سے آپ کی تحریریں فراہم کی خود ان کو دیکھا جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے ان کو نکال ڈالا کاتب لکھ رہا ہے۔"۹۳

آخر غالب کے خطوط کا مجموعہ "عود ہندی" غالب کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپا۔ ۱۸۸ صفحات کے اس مجموعے کے شروع دو دیباچے (عرض ناشر و دیباچہ سرور) ہیں۔ اس کے بعد فصل اول "مہر غالب" فصل دوم "عود ہندی" آخر میں خاتمہ (از قلق میرٹھی)، دو تقریظیں اور تین دیباچے جو غالب نے دوسروں کی کتابوں پر تحریر کیے۔ اس مجموعے کے خطوط کی تفصیل یہ ہے:

(فصل اول) عبدالغفور سرور ۲۶، صاحب عالم ۳، شاہ عالم ۴، تفتہ ۱، غلام رسول مہر ۱۸، غلام غوث بے خبر ۲۵، عبدالغفور نساخ، غلام مصطفےٰ خاں شیفتہ ۱، رضا مراد آبادی ۱، مرزا رحیم بیگ ۱، علاء الدین احمد علائی ۱، شاگرد ۱، جنون بریلوی ۱۵، عزیز الدین ۱، سید محمد عباس ۱، منشی غلام بسم اللہ ۱، ایک خط ظہیر الدین خاں کی طرف سے ان کے چچا کے نام، ایک خط غلام غوث بے خبر کا مرزا غالب کے نام۔

مجموعہ مکاتیب "عودِ ہندی" میں شامل خطوط میں اصلاحی، علمی اور تنقیدی مضامین پائے جاتے ہیں۔

اردوئے معلّیٰ (حصہ اول)

اردو خطوط کا وہ مجموعہ جو غالب کی زندگی میں مرتب ہوا۔ دہلی میں چھپنا شروع ہوا لیکن غالب کی وفات کے بعد مکمل ہوا۔ دہلی کے احباب کو بھی غالب کے خطوط جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اکمل المطابع جس میں غالب کے شاگرد منشی بہاری لال مشتاق کام کرتے تھے۔ اسی مطبع نے غالب کے خطوط کی طباعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس مجموعے کی ترتیب اطباعت میں غالب خود دلچسپی لے رہے تھے۔ اور خطوط کی جمع آوری کے لیے احباب کو لکھ رہے تھے۔ علائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع "اکمل المطابع" میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں۔ اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا جو لکھا وہ جہاں بھیجا ہوا وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اور اس کو دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔ اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔"۹۴

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ اردوئے معلّیٰ (حصہ اول) اکمل المطابع دہلی میں ۲۱ ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۶/ مارچ ۱۸۶۹ء بروز جمعہ کو چھپ کر تیار ہوا۔ غالب کا انتقال ۲/ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵/ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ یہ مجموعہ چار سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں 'آغاز' خاتمہ و غلط نامہ شامل ہیں۔ سرورق سبز اور پیلا ہے۔ سرورق کی پیشانی پر غالب کا یہ شعر درج ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اوسے سنا کہ یوں

اس کے بعد عنوان کتاب "اردوئے معلّیٰ" (حصہ اول) اور اس کے نیچے یہ عبارت ہے:

"یعنی رقعات اردوئے نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب، جو تعلیم اطفال کے لیے دستور العمل ہے۔"

شروع میں میر مہدی مجروح کا دیباچہ ہے۔ قربان علی خاں بیگ سالک نے اس کا خاتمہ لکھا ہے اور حکیم غلام رضا خاں نے کتاب کے حقوق حاصل کیے کیونکہ وہ اکمل المطابع کے مالک تھے۔ اس میں خطوط کی تعداد ۲۴۷ ہے۔ اور مکتوب الیہم کی تعداد ۵۱ ہے۔

اردوئے معلّیٰ (حصہ دوم)

اردوئے معلّیٰ حصہ اول ۱۸۶۹ء میں چھپ گئی لیکن اس کے دوسرے حصے کی طباعت نہ ہو سکی۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا الطاف حسین حالی نے مطبع مجتبائی دہلی سے دوسرے حصے کو بھی چھپوا دیا۔ یہ حصہ مطبوعہ مجتبائی چھپن صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں کتابوں پر دیباچے اور تقریظیں ہیں اس کے بعد تریپن خطوط ہیں۔ اور مکتوب الیہ کی تعداد دس ہے۔

اردوئے معلّیٰ کے دونوں حصے یکجا مجتبائی پریس دہلی سے چھپنے کے بعد متعدد بار مختلف مطابع سے شائع ہوئے۔ بقول پروفیسر نظیر حسین زیدی:

"اس مجموعہ خطوط میں عودِ ہندی کی طرح علمی مسائل تو زیادہ نہیں لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے اس کتاب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب سے خود غالب کے متعلق نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق ذاتی معلومات کے علاوہ ان کی بشری کمزوریوں کا بھی پتہ چلتا ہے جن کو غالب نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے مزاج، آدابِ زندگی، خانگی قصے، گھریلو پریشانیوں کے ساتھ ساتھ ان کی پرخلوص محبت، مراسم دوستی جواب خطوط میں جھلکت، ان کے احباب و آشنا سے ان کے مراسم کی نوعیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگر تاریخی نوعیت سے مرتب ہو کر یہ خطوط سامنے آ جائیں تو غالب سے بہتر اٹھارہ سو ستاون کے واقعات پر تبصرہ کرنے والا کوئی شاید اس انداز سے سامنے نہ آ سکے گا۔"۹۵

مکاتیب غالب

مولوی امتیاز علی عرشی نے ۱۹۳۷ء میں غالب کے ان خطوط کا مجموعہ مکاتیب غالب کے نام سے شائع کروایا جو انھوں نے رام پور کے نواب فردوس مکاں، خلد آشیاں وابستگان دربار کو لکھے تھے۔ اس مجموعے میں صرف دو خطوط شامل ہیں جو اردو انشا میں مکتوط تھے۔۹۶

مکاتیب غالب کے خطوط کی تعداد ایک سو انتیس ہے اور مکتوب الیہم کی تعداد سات ہے۔

نادرات غالب

"نادرات غالب" مرزا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو منشی نبی بخش حقیر کو لکھے گئے۔ منشی نبی بخش حقیر سے مرزا کے بہت گہرے اور قلبی مراسم تھے۔ خطوط کے مجموعے "اردوئے معلیٰ" میں حقیر کے نام صرف دو (۲) خطوط شامل ہیں۔ آفاق حسین آفاق دہلوی عو۷ نے ۱۹۳۹ء میں "نادرات غالب" کے نام سے یہ مجموعہ مشہور پریس کراچی سے شائع کرایا۔ اس مجموعے میں ۷۲ خطوط منشی نبی بخش حقیر کے نام، ۲۰ خطوط حقیر کے فرزند منشی عبداللطیف کے نام اور وہ خطوط جو "اردوئے معلیٰ" میں نبی بخش حقیر کے نام ہیں ان کو بھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا ہے۔ "نادرات غالب" میں شامل خطوط ۱۸۲۸ء اور ۱۸۵۹ء کے درمیان لکھے گئے۔ پہلا خط فارسی میں ہے اور "پنج آہنگ" میں شامل ہے۔ حقیر کے نام غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ حیات غالب کا ایک اہم ماخذ ہے۔ مرتب نے اس مجموعے پر حواشی لکھ کر اسے قابل قدر بنا دیا ہے۔

نادر خطوط غالب

رسا لکھنوی نے ستائیس اردو خطوط کا مجموعہ پیش کیا۔ یہ خطوط کرامت حسین ہمدانی صفیر بلگرامی اور صوفی منیر کے نام ہیں۔ ان خطوط سے متعلق غلام رسول مہر نے لکھا ہے:

"میرے نزدیک ان میں سے بعض خطوں کا مستقل وجود محل نظر ہے۔"۹۸

خطوط غالب (از مہیش پرشاد)

منشی مہیش پرشاد نے خطوط غالب کی از سر نو ترتیب و تصحیح کا بیڑا اٹھایا۔ اس میں انھوں نے کچھ غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل کیے۔ اس مجموعے کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۴۱ء میں شائع کی۔ خطوط غالب کے اس مجموعے کو مزید اضافوں کے ساتھ مالک رام نے ۱۹۶۲ء میں چھپوایا۔

خطوط غالب (از غلام رسول مہر)

منشی مہیش پرشاد۹۹ کے مرتب کردہ مجموعے کے بعد غلام رسول مہر نے اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کی ترتیب توڑ کر اور غالب کے متفرق خطوط کو یکجا کر کے اس ضخیم مجموعے میں پیش کیا۔ مہر نے مکتوب الیہم کے حالات، تاریخوں کی تصحیح و اندراج اور بعض خطوط کے حواشی لکھ کر از سر نو تاریخ وار ترتیب دے کر پیش کیا۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ خطوط زیادہ قابل قدر ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے منشی مہیش پرشاد کے مجموعے کے متعلق لکھا ہے:

"منشی مہیش پرشاد صاحب کی کاوش مستحق صد ستائش ہے لیکن ان کا جو مجموعہ چھپا، وہ بھی غلطیوں سے پاک نہ تھا۔ پھر ان کا مرتب مجموعہ مکمل نہ چھپا اور کام ادھورا رہ گیا۔ نیز منشی صاحب نے نہ حواشی لکھے نہ مکتوب الیہم کے حالات پر توجہ فرمائی۔"۱۰۰

اس کے بعد مولانا غلام رسول مہر اپنے مرتب کردہ مجموعہ خطوط کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مجموعہ کر دیا اور جتنے متفرق خطوط مل سکے وہ بھی اس مجموعے میں شامل کر دیے تاکہ غالب کی زیادہ سے زیادہ تحریر یکجا ہو جائے۔ "اردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" کی تقسیم توڑ دی اور سارے خطوط کو اکٹھا کر دیا۔ آخر میں "ضمیمۂ غالب" اور تقریظیں نگاریں۔"۱۰۱

انتخابِ غالب

خلیق انجم کے مجموعے "غالب کے خطوط" میں اس مجموعے یعنی "انتخابِ غالب" کے بارے میں لکھا ہے۔ غالب کی اردو نظم ونثر کا مختصر سا انتخاب ڈاکٹر مولوی ضیاءالدین خاں کی فرمائش پر غالباً انگریز افسروں اور فوجیوں کو پڑھانے کے لیے ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ گویا "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" سے پہلے یہ مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاءالدین خاں صاحب کو لکھوایا، وہ عبدالرزاق راشد نے مرتب کر کے ۱۹۲۶ء میں چشتیہ پریس، حیدرآباد سے شائع کر دیا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۳۳ء میں دینِ محمدی پریس، لاہور سے شائع ہوا۔ اس انتخاب کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ملکیت تھا جس کی فوٹو کاپی غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں خلیق انجم نے مزید لکھا ہے:

> "مالک رام صاحب کا کہنا ہے کہ یہ انتخاب چالیس صفحات پر مشتمل ہے، جب کہ اس قلمی نسخے میں کل تیس صفحات ہیں۔ ابتدا میں اس انتخاب پر غالب کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانۂ سرور" اور خواجہ بدرالدین خاں کی "حدائق الانظار" پر لکھے گئے غالب کے وہ دیباچے ہیں جو "اردوئے معلّٰی" میں شامل ہیں۔ پھر میر مہدی مجروح کے نام بارہ خط ہیں۔ اس کے بعد دو نظمیں اور ایک لطیفہ۔ دوسرے حصے میں ۱۳۹ اردو اشعار ہیں۔ اور آخر میں اس کتاب سے متعلق غالب کی لکھی ہوئی ایک مختصر سی نثر ہے۔"[۲۲]

ادبی خطوطِ غالب (مرتبہ مرزا محمد عسکری)

یہ کتاب ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور ۱۹۳۹ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں ایسے خطوط کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں غالب نے "نکات ادبیہ حل کیے ہیں" اشعار کے معنی بتائے ہیں اور شعرا کے متعلق رائے زنی کی ہے۔

نادراتِ غالب

خطوطِ غالب کا یہ مجموعہ آفاق حسین آفاق نے مرتب کر کے ۱۹۳۹ء میں ادارۂ نادرات کراچی سے شائع کرایا۔ میرن دہلوی نے منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے ۳۰ خطوط اور منشی عبداللطیف کے نام ایک خط فراہم کر کے مرتب کیے تھے۔ خطوط کا یہ مجموعہ مسودے کی شکل میں میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق کو ملا تھا۔

غالب کی نادر تحریریں

یہ مجموعہ خلیق انجم نے مرتب کر کے ۱۹۶۱ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع کرایا۔ اس میں صرف وہ خطوط شامل کیے جو "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ اور بعد میں مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔

غالب کے خطوط

خلیق انجم نے 'غالب کے خطوط' کے نام سے خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ اس مجموعے کی چار جلدیں ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۸۴ء، دوسری ۱۹۸۵ء، تیسری ۱۹۸۷ء اور چوتھی جلد ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ بقول خلیق انجم:

> "ان چار جلدوں میں غالب کے خطوط دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جو غالب کے خطوط کے مجموعے "اردوئے معلّٰی"، "عودِ ہندی" مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مرتبہ "مکاتیبِ غالب"، جناب آفاق حسین آفاق کے مرتبہ "نادراتِ غالب" اور خلیق انجم کی مرتبہ "غالب کی نادر تحریریں" میں شامل ہیں۔ لیکن بہت بڑی تعداد غالب کے خطوط کی ایسی بھی ہے جو مختلف رسالوں اور کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔"[۲۳]

مرزا غالب کے خطوط اردو خطوط نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان میں مرزا کا

رنگ طبیعت نجی اور پرائیویٹ زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ غالب کے خطوط کی مقبولیت سے اردو خط نگاری کو ایک خاص ادبی رتبہ حاصل ہوا ہے۔ ان کے بعد کے زمانے میں خط نگاری عموماً ان کی روش کی تقلید کرتی نظر آتی ہے۔ بقول عبدالقوی دسنوی:

"مرزا غالب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر وہ شاعری نہ کرتے اور اردو ادب کو صرف خطوط کا سرمایہ دے کر رخصت ہو جاتے تو بھی ان کا مقام نہ صرف اردو میں بلکہ دنیائے ادب میں منفرد رہتا۔ اس لیے کہ انھوں نے اردو میں خط نگاری کو فروغ ہی نہیں دیا بلکہ وہ فرسودگی، اکتا دینے والی یکسانیت، رکی آداب والقاب اور پرانی روش سے نجات دلانے کا باعث بھی بنے۔ انھوں نے اسے نیا آب ورنگ دیا۔ اس میں اپنے محسوسات، خیالات اور دل کی دھڑکنوں کو اس طرح سمو دیا اور کاروباری تحریر کی نوک پلک کو اپنی فنکارانہ صلاحیت کی مدد سے اس سلیقے کے ساتھ درست کیا کہ وہ دنیائے ادب کی اچھی تحریروں سے ہاتھ ملانے کے لائق ہوگئی۔ اور اگر ادب پر کوئی قلم اٹھانے والا خط نگاروں کا تذکرہ کرے اور غالب کا ذکر نہ کرے تو اس کے اس عمل سے غالب کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ وہ خود اپنا نقصان کرے گا۔ اس کا یہ عمل اس کی کم علمی، کم فہمی، کم مائیگی کے ثبوت میں ہمیشہ ہمیشہ پیش کیا جاتا رہے گا۔"۴؎

مرزا غالب نے خطوط نویسی کے قدیم انداز کو جسے وہ "محمد شاہی روش" کہہ کر پکارتے ہیں، بدل دیا۔ جس کا احساس خطوط غالب کے آغاز میں القاب وآداب کے استعمال سے ہوتا ہے۔ بقول ثریا حسین:

"مرزا غالب ۱۸۵۰ء کے قریب فارسی کے پر تکلف القاب وآداب ترک کر کے بے تکلف اور غیر رسمی انداز تحریر اپنایا اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔"۵؎

مکتوب نگاری کا جو انداز غالب نے اختیار کیا اس میں رسمی القاب وآداب کی گنجائش نہیں تھی۔ غالب نے اپنے خطوط میں حفظ مراتب کا خاص خیال رکھا ہے۔ جس کا اندازہ ان کے خطوط کے مطالعے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ القاب میں بے تکلفی اور ندرت وہیں تک ہے جہاں مراسم کی

نوعیت اس کی اجازت دیتی ہے۔ جہاں ادب واحترام واجب ہوتا ہے، وہاں القاب میں کلمات احترام آجاتے ہیں۔ بہت کم خطوط ایسے ہیں جن میں غالب نے القاب نہیں لکھے ہیں۔ اردو خطوط میں القاب لکھتے ہوئے غالب مخاطب کی حیثیت کے مطابق مختصر القاب لکھ کر مطلب کی بات بیان کر دیتے ہیں۔ بقول خلیق انجم:

"عام طور سے صرف القاب پڑھ کر ہمیں مکتوب الیہ سے غالب کے ذہنی رشتے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان القابوں میں بے تکلفی، بے ساختگی، اور گفتگو کا انداز ہے۔ کبھی کبھی یہ القاب خط کے مضمون کے مطابق ہوتے ہیں۔"۶؎

غالب کے خطوط میں جہاں ادب واحترام واجب ہوتا ہے وہاں القاب کی نوعیت اس طرح ہوتی ہے مثلاً خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام خط میں پیر و مرشد، قبلہ، جناب عالی، حضور، حضرت پیر و مرشد، بندہ پرور وغیرہ ہیں۔ جہاں تعلقات میں زیادہ یگانگت نہیں ہوتی وہاں القاب میں بھی رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت مخدوم ومکرم، جناب عالی، صاحب وغیرہ۔ بے تکلف احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں القابات اس طرح ہیں مثلاً علاء الدین احمد خاں علائی کو لکھتے ہیں۔ مرزا علائی مولائی، میرزا تسمی کو دعا پہنچے، صاحب، یار جیتے گویا بھائی مولانا علائی باخدا کی دہائی، میاں وغیرہ۔

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں: بندہ پرور، کیوں صاحب، دیکھو صاحب، میاں، مہاراج بھائی شفیق، برخوردار مرزا تفتہ، آؤ مرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ اور میری حقیقت سنو، میری جان مرزا تفتہ سخن داں وغیرہ۔ حالانکہ ۷۰خطوط ایسے ہیں جن میں غالب نے القاب نہیں لکھے ہیں۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں: بندہ پرور، صاحب میرے، بھائی صاحب، مرزا صاحب وغیرہ۔

غالب نے خطوط میں باتیں کرنے اور خبریں سنانے کا جو انداز اختیار کیا ہے، اس سے ان کے اسلوب میں بیانیہ طرز، مرقع نگاری اور مکالمہ نگاری کی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

القاب وآداب کی بے تکلفی کے ساتھ ہی دوسرا اہم پہلو جس نے خطوط غالب کو ادبی لحاظ سے دلکش ودلچسپ بنا دیا ہے وہ باتیں کرنے کا انداز ہے۔ ادبی اسلوب میں باتوں کے انداز میں

جو اپنائیت، یگانگت اور بے تکلفی ہوتی ہے، وہ کسی اور انداز میں نہیں ہوتی۔ غالب نے اپنے اسی انداز نگارش سے مجلسی ماحول پیدا کر دیا ہے۔ غالب نے خطوط میں مراسلے کو مکالے کی جو صورت دی ہے، اس میں مکالے بھی ہیں اور بات چیت کی مجلسی کیفیت بھی۔

"بھائی صاحب کا خط کئی دن ہونے کو آیا ہے اور میرے خط کے جواب میں ہے۔ وہ ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب ان کو خط لکھوں گا۔" ۷؎

"اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھے باتیں کرنے کا مزہ ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا، اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔" ۸؎

"اب میں حضرت سے باتیں کر چکا ہوں خط کو سر نامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں کہ ڈاک میں دے آوے۔" ۹؎

غالب نے خطوط میں باتیں کرنے کا جو انداز اختیار کیا ہے اس سے نثر میں زندگی کا احساس بیدار ہوتا ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی جیتے جاگتے ماحول میں بیٹھا ہے۔ جہاں احباب ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہیں۔ باتیں کرنے اور سننے والے کے درمیان اتنا قرب ہوتا ہے کہ وہ باتوں کے علاوہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں بھی سن سکتے ہیں۔ اسلوب میں اس انداز سے باہمی اعتماد اور رفاقت کی جو فضا پیدا ہوتی ہے اس میں معمولی سے لے غیر معمولی باتیں بھی یکساں توجہ سے سنی جاتی ہیں اور انسان ان میں لطف لینے لگتا ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں گفتگو کو مزید جاندار اور پر لطف بنانے کے لیے مکالموں کو بھی جگہ دی ہے جو مختصر اور برجستہ ہیں۔ بعض مکالموں نے تو ایسا سماں پیدا کر دیا ہے کہ ان کی وجہ سے متعلقہ خطوط ادبی لحاظ سے ضرب المثل بن گئے ہیں۔ مثلاً:

(غالب): کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو!

(؟): لو صاحب، وہ آئے!

(غالب): میاں میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے، مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے، اب سن لو! ۱۰؎

غالب کا شاہکار مکالمہ وہ ہے جس میں مکتوب الیہ میر مہدی مجروح ہیں۔ جس میں مکالمہ میرن صاحب سے ہو رہا ہے۔ کتنا برجستہ لطیف اور دلچسپ انداز ہے:

(غالب): اے میرن صاحب السلام علیکم!

(میرن): حضرت آداب!

(غالب): کہو صاحب آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟

(میرن): حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر تکلیف کیوں کریں۔

(غالب): نہیں میرن صاحب! اس کے خط کو آئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔

(میرن): حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیوں ہوں گے؟

(غالب): بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتاؤ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

(میرن): سبحان اللہ! اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

(غالب): اچھا تم باز نہیں رکھتے، مگر تم یہ تو کہو کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟

(میرن): کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ آج آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور خط اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جائے۔ میں پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھئے گا۔

(غالب): میاں جھوٹی ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آ گیا۔ اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔" ۱۱؎

مکالموں اور باتوں کے ساتھ ساتھ مجلسی زندگی کا ایک اہم پہلو خبریں سنانے کا ہے۔ خبریں سننے سنانے کے اس پہلو نے غالب کے خطوط میں مجلسی رنگ کو مزید نمایاں کر دیا ہے۔ غالب نہ صحافی تھے نہ مورخ لیکن وہ احباب کی خاطر نامہ نگار اور اخبار نویس بھی بنے اس لحاظ سے غالب کے خطوط بہت اہم تاریخی دستاویز بھی بن گئے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

''آج شہر کے اخبار لکھتا ہوا سوانح لکھنؤ بہار لکھتا ہوں۔'' [۱۱۳]

''ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں۔'' [۱۱۳]

خطوط غالب میں بیان کردہ واقعات و حالات کی تصدیق دوسرے ذرائع سے کر کے ان کی تاریخی حیثیت متعین کی جا سکتی ہے۔ غالب تک اطلاعات یا خبریں دوسرے یا مختلف ذرائع سے پہنچتی تھیں۔ وہ ان کا عقلی تجزیہ بھی ضرور کرتے تھے۔ خبر اور افواہ میں فرق ان کے پیش نظر رہتا تھا لکھتے ہیں:

''خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات از ادی موسار سے شہر میں مشہور ہے۔'' [۱۱۴]

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد غالب نے اپنے خطوط میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کی بعض ایسی تفصیلات بھی پیش کی ہیں جو کسی دوسرے ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ غالب نے صرف واقعات و حالات ہی بیان نہیں کیے ہیں بلکہ رد عمل اور تاثرات بھی قلم بند کیے ہیں۔ اس طرح غالب کے خطوط کا یہ سرمایہ رپورتاژ کی ذیل میں آ جاتا ہے جسے ادب میں اب ایک الگ صنف کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

خطوط غالب میں اس عہد کی زندگی کی بہت سی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جزئیات نگاری کی وجہ سے معمولی سی باتیں اس دور کی معاشرتی زندگی کے بعید گوشوں کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔ دلی کی بربادی اس کی آبادی، خاص و عام کے ساتھ گزارے اوقات، معاشی حالات، سفر کے ذرائع، ڈاک کے انتظامات اور موسمی تغیرات وغیرہ ایسے امور ہیں جو خطوط کی مجلسی فضا سے ابھر کر اس عہد کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پنشن سب کو سر اسر شاہی ملنے کا حکم ہو گیا۔ ہر مہینے میں سودی لو اور کھاؤ۔

کشمیری کٹرا منہدم ہو گیا ہے۔ ہائے اوہ اونچے اونچے دار اور بڑی بڑی کوٹھریاں دور تک نظر نہیں آتیں کہ کیا ہو گئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی راہ گزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ جاڑا دن سے بے پروا ہوا چلتی ہے۔ ابر آتے ہیں مگر صاف چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ مینہ نہیں برستا۔ گیہوں، چنا، باجرہ تینوں اناج ایک بھاؤ ہیں۔ تو سیر ساڑھے نو سیر۔'' [۱۱۵]

غالب خط لکھتے وقت نہ صرف اپنے لیے بلکہ مکتوب الیہ کے لیے بھی مجلسی فضا تخلیق کرنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں گرد و پیش کے منظر کی ایسی جزئیات پیش کی ہیں کہ مکتوب الیہ اور قاری کی نگاہوں کے سامنے اس فضا کا دلکش مرقع ابھرنے لگتا ہے۔ مرقع وہی کامیاب ہوتا ہے جس میں خارجی ماحول کی خیالی باتیں نہ ہوں۔ بلکہ حقیقی جزئیات ہوں۔ غالب کے خطوط میں منظر کشی اور مرقع نگاری اس لحاظ سے کافی جاندار ہیں کہ وہ ماحول کی خیالی تصویروں کے بجائے حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ حسن انتخاب اور حسن ترتیب سے ایسے مرقعے و مناظر تیار کرتے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری اس ماحول کا پورا احساس کرنے لگتا ہے۔ منظر نگاری کی مثال ملاحظہ کیجیے:

منظر کشی یا موسم کا حال

''رات کو خوب مینہ برسا ہے صبح کو تھم گیا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ ابر تنک چھا رہا ہے۔'' [۱۱۶]

موسم کا حال ہو یا آس پاس کا منظر نامہ، جاڑا، گرمی، برسات کا تذکرہ جس دلفریب انداز میں کرتے ہیں اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری اس ماحول کا فرد بن گیا ہے۔ غالب کے قلم کا کمال ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں موسم کی تمام کیفیات کو صفحہ قرطاس پر اتار دیتے ہیں:

''برسات کا حال تمھیں معلوم ہے اور یہ بھی جانتے ہو میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں جولائی سے مینہ شروع ہو گیا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت دن میں دو چار بار برسے اور برسے اس زور

سے کہ ندی نالے بہہ نکلے۔ بالا خانہ کا جو دالان ہے اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اٹھا کر توشہ خانے کی کوٹھری میں رکھ دیں۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا اب نجات ہوئی۔" [117]

"کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کر لیں۔" [118]

خاکہ نگاری

غالب نے اپنے خطوط میں خاکہ نگاری کے کچھ ایسے نمونے پیش کیے ہیں جس سے ان کے خطوط میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا ثبوت ملتا ہے۔ حالانکہ غالب کے خطوط میں مرقع نگاری کے نمونے بہت کم ہیں۔ لیکن انھوں نے مختصر الفاظ میں ایسا مرقع پیش کیا ہے کہ پوری تصویر اور صاحب تصویر کا کردار ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ رام پور کے نواب کلب علی خاں کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ایک خط میں انھوں نے نواب صاحب کی پوری شخصیت، چہرہ، نثر نگاری، تقریر، شعر فہمی غرض ہر چیز اس طرح بیان کی ہے کہ ان کی پوری شخصیت و کردار سامنے آ جاتا ہے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

"رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں: قد، رنگ، شکل، شمائل، بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں، عمر کا فرق، حلیم و خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، شعر فہم، سیکڑوں شعر یاد، نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالا لے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں دور بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک نئی روح قالب میں آ جائے۔" [119]

غالب کے خطوں کا مطالعہ کیا جائے تو ابتدا سے ہی نئے پن، بانکپن اور انوکھے پن کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ عام طور سے غالب نے خطوط کی ابتدا ہی اس انداز سے کی ہے کہ مکتوب الیہ کی شخصیت

اور اس کے غالب سے تعلقات کی نوعیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔

بے تکلفی

غالب کے خطوں میں بے تکلفی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خط نویسی یا القاب و آداب کے پرانے طریقے کو جسے وہ "محمد شاہی روشیں" کہہ کر پکارتے تھے، یکسر بدل دیا ہے۔ اس تبدیلی کا احساس خطوط غالب کے آغاز میں القاب و آداب کے استعمال سے ہی ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ بغیر القاب و آداب کے ہی خط لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد، یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔" [120]

اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب نے القاب و آداب لکھنے بند کر دیے بلکہ انھوں نے لمبے لمبے، پر تکلف اور پر تصنع القاب کا استعمال بند کر دیا ہے۔ ایسے خطوں کی تعداد بہت کم ہے جن میں القاب نہیں ہیں۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام صرف بیس خطوط ایسے ہیں جن میں القاب نہیں ہیں۔ اسی طرح نواب علاء الدین خاں علائی کے نام صرف چھ، میر مہدی مجروح کے نام چھ، چودھری عبد الغفور کے نام دو، خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام تین اور انور الدولہ شفق کے نام صرف دو خطوط ایسے ہیں جن میں القاب نہیں لکھے گئے ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

"سبحان اللہ ہزار برس تک نہ پیام بھیجا نہ خط لکھا۔ اور پھر لکھا تو سراسر غلط لکھا۔" [121]

"صاحب میری داستان سنیے۔ پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔" [122]

القاب

خطوط غالب کے مطالعہ سے عام طور سے صرف القاب پڑھ کر ہی ہمیں مکتوب الیہ سے غالب کے ذہنی رشتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق چھوٹا سا القاب لکھ کر

مطلب کی بات بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے کا انداز ملاحظہ کیجیے۔ بھائی صاحب، مولانا، سمی، میری جان، جانِ غالب، علائی مولائی، صاحب، مہاراج وغیرہ۔

اس طرح کے انداز تخاطب کے متعلق ایک خط میں خود لکھتے ہیں:

"میرا طریقہ یہ ہے کہ جب میں قلم دوات اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ
جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد اپنا مطلب
شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب کا پرانا طریقہ شکر و شکوہ و شادی و غم کا قدیم
رویہ میں نے بالکل اٹھا دیا ہے۔" ۱۴۳

مکتوب نگاری کا جو انداز غالب نے اختیار کیا اس میں رسمی القاب و آداب کی گنجائش نہیں تھی۔ غالب نے خطوط میں حفظِ مراتب کو بہر حال ملحوظ رکھا ہے۔ القاب میں بے تکلفی اور ندرت وہیں تک ہے جہاں مراسم کی نوعیت اس کی اجازت دیتی ہے۔ جہاں ادب و احترام ضروری ہوتا ہے وہاں القاب میں کلمات احترام آجاتے ہیں۔ موقع اور حالات کے اعتبار سے تخاطب کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے:

"شفیق بالتحقیق، منشی ہرگوپال تفتہ سلامت رہیں۔" ۱۴۴

"کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ۔" ۱۴۵

"نورِ بصر لختِ جگر منشی شیو نراین کو دعا پہنچے۔" ۱۴۶

"برخوردار حکیم غلام نجف خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔" ۱۴۷

غالب نے یہ سادگی، خلوص، قربت، ندرت اور اپنائیت کا انداز خطوط کے اختتام میں بھی اختیار کیا ہے۔ وہ عموماً اپنا نام اس طرح تحریر کرتے ہیں: نجات کا طالب غالب، علائی کے دیدار کا طالب غالب، مرگ کا طالب غالب، غالب علی شاہ، اسد اللہ مضطرب، وغیرہ۔

بہر حال خط کی ابتدا ہو یا انتہا یہ ایک حقیقت ہے کہ ان میں سادگی، بے تکلفی اور اپنائیت کی فضا ملتی ہے۔ خطوطِ غالب میں القاب و آداب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں:

"اردو خطوط نویسی کو غالب کی دین یہ نہیں ہے کہ انھوں نے القاب و آداب لکھنے
بند کر دیے بلکہ ان کی دین یہ ہے کہ ایک تو القاب کو مختصر کیا اور دوسرے القاب

کو مکتوب الیہ سے اپنے ذاتی رشتے کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جس کی وجہ سے
القاب میں تصنع اور تکلف کے بجائے ایک فطری انداز پیدا ہو گیا۔ اور "یہاں
سب خیریت ہے، اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے" جیسی
چیزوں سے اردو خطوط کو نجات دلائی۔" ۱۴۸

غالب نے خطوط کو دلچسپ بنانے کے لیے کبھی ڈرامے کے فن کا سہارا لیا، کبھی مکالمے کی مدد لی، کبھی باتیں کرنے اور خبریں سنانے جیسا انوکھا انداز اختیار کیا تو کبھی افسانوی رنگ بھر دیا۔ افسانوی رنگ اختیار کرنے کی وجہ سے خطوط نہ صرف بہت پر لطف ہو گئے ہیں بلکہ ان میں ایک خاص انفرادیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک خط ملاحظہ کیجیے:

"یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو آدمی آ گئے، دن بھی تھوڑا رہ گیا، میں نے بکس بند کیا،
باہر تختوں پر آ بیٹھا، شام ہوئی، چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد سرہانے کی طرف
مونڈھے کی طرف بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ
دودمانِ علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوزا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ، اس
کے سر پر ٹوکرا، اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی، آہا ہا ہا! سلطان العلما مولانا سرفراز
حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے، معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے، یہ کچھ اور ہے۔
فیض خاص نہیں لطف عام ہے شراب نہیں آم ہے۔" ۱۴۹

غالب نے خطوط میں رنگین اور مرصع زبان کے بجائے سلیس اور بے ساختہ عبارت لکھی اور سہل ممتنع کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے قلبی واردات، ذہنی افکار، کائنات کے اسرار اور اپنے مشاہدات و تجربات کو سیدھے سچے بے تکلف مگر سحر آفریں طریقے سے بیان کیا ہے۔ یہ خطوط صرف ان کی ظاہری و باطنی زندگی کے ترجمان ہیں بلکہ وہ مصفّی آئینے ہیں جس میں ہر شخص اپنے خد و خال دیکھ سکتا ہے اور دل کی دھڑکنیں سن سکتا ہے۔ ضیاء احمد بدایونی غالب کے خطوط کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردو خطوط نگاری میں جو روش غالب نے اختیار کی وہ اپنا جواب نہیں
رکھتی۔ مانا کہ اس سے پہلے بھی اردو خطوط کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں لیکن

غالب نے یہ نقارہ اس لے میں چھیڑا کہ ان کے سامنے سب آوازیں دب کر رہ گئیں۔ بعد میں آنے والوں نے بھی ان کی تقلید کرنی چاہی مگر غالب 'علی کل غالب' حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ فارسی کے زبردست شاعر اور انشاپرداز ہونے اور اردو شاعری میں مشکل پسندی کے خوگر ہونے کے باوجود انھوں نے اردو خطوط میں وہ طرز برتا جس کو سہل ممتنع کہا جائے تو بے جا نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سادگی اور شوخی کا ایسا امتزاج اور کہیں نہیں ملتا۔ ان کے خطوط کیا ہیں انھوں نے زندگی کے صد رنگ جلووں کو جیسا دیکھا اور محسوس کیا ہے اپنی اعلیٰ فن کاری سے ہو بہو اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔"۱۳۰

غالب سیاسی آدمی نہیں تھے۔ وہ ایک ادیب و شاعر تھے۔ اس لیے ان کا تعلق سیاسی دنیا کے مقابلے میں تصورات وتخیلات کی دنیا سے زیادہ تھا۔ علمی دنیا سے ان کا تعلق تو صرف اتنا کہ وہ تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور تھے۔ دوسری طرف ان کے انگریزوں سے تعلقات تھے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب عظیم غالب کی نگاہوں کے سامنے برپا ہوا وہ اس ہنگامے کے عینی شاہد تھے۔ غالب نے کئی خطوں میں دہلی کی بربادی اور پھر اس کی بتدریج آبادی کے سلسلے میں متعدد واقعات بیان کیے ہیں۔ یہ بیانات اس دور کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کے سلسلے میں بہت اہم ہیں۔ خطوط میں بعض جگہ غالب نے اہم سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں اپنے تاثرات بھی پیش کیے ہیں۔ ان تاثرات کی روشنی میں ہم اس نازک دور کی ذہنی کیفیات کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جو اہم سیاسی تبدیلی ہوئی اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ اور برِعظیم کا براہِ راست تاج برطانیہ کے زیرِ سایہ آنا تھا۔ غالب اس تبدیلی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت یہاں دو چیزیں مشہور ہیں ان کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر گورنمنٹ کلکتہ کے

سیکرٹری اکبرآباد کے لیفٹیننٹ گورنر ہو گئے۔ خبریں دونوں اچھی ہیں خدا کرے سچ ہوں۔"۱۳۱

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو انقلاب کا آغاز ہوا اور آخر سال تک نفسی نفسی کا عالم رہا۔ لوگوں نے کس طرح گزر کی ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ غالب کے خطوط اور ان کی کتاب دستنبو میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ تاریخ کی کتابیں انگریزوں کے ظلم وستم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ خطوط غالب کے اسی پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھا ہے:

"ان کے خطوط کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ سلاست، روانی، ظرافت کا ایک حسین امتزاج اور مکالمہ نگاری ان خطوط کی خصوصیات ہیں۔ مگر ان باتوں کے علاوہ غالب کے خطوط اس دور کی سماجی ومعاشرتی حالت کا جیتا جاگتا مرقع ہیں۔ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں دہلی کی بربادی کے نادر دستاویز ہیں۔ جن میں واقعات بغیر کسی مصلحت کے بیان کیے گئے ہیں۔ عوام وخواص کا مرثیہ لکھا گیا ہے۔ دہلی کی بربادی پر افسوس کیا ہے۔ اگر غالب کے یہ خطوط ہمارے سامنے نہ ہوتے تو دہلی کی بربادی کی اتنی مکمل سوز تصویر شاید نہ ملتی۔"۱۳۲

گوپی چند نارنگ نے خطوط غالب کے اسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"ہنگامے کے دنوں میں غالب پر جو گزری اس کا ذکر دستنبو کے علاوہ ان کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ جو نسبتاً زیادہ آزادی اور بے باکی سے لکھے گئے ہیں۔ غالب کی وطن دوستی یا انگریزوں کے تئیں ان کے سچے جذبات معلوم کرنے کے لیے صرف دستنبو کے بیانات پر نظر رکھنا کافی نہیں بلکہ غالب کی شخصیت ان کے مزاج اور ان کے مخصوص حالات کو جاننا بھی ضروری ہے۔ نیز وہ خطوط اس بارے میں بہت اہم ہیں تو انھوں نے خاص خاص دوستوں کو لکھے تھے اور جن میں ان کا جذبات دل بے تابانہ چھلک گیا ہے۔"۱۳۳

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت اور شکست کے نتیجے میں دلّی کی جو درگت بنی اور

وہاں کے لوگ جن مصائب و مشکلات کے شکار ہوئے اس کی سچی تصویریں غالب کے خطوط میں ادھر ادھر کافی مل جاتی ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

"کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلی کہاں۔ کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"[۱۳۴]

غالب نے خطوط میں اپنے قلبی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ اظہار وہ برملا نہیں کر سکتے تھے۔ انگریزی دارو گیر میں صاف صاف لکھنا اور اسے ڈاک کے سپرد کرنا ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی غالب نے واقعہ انقلاب کے سلسلے میں حالات و کوائف بیان کرتے ہوئے دبے دبے الفاظ میں اپنے تاثرات و احساسات بھی پیش کر دیے ہیں۔

دلی اور لکھنؤ کے تہذیبی گہواروں کا مٹنا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ غالب نے اس پر کوئی مرثیہ تو نہیں لکھا لیکن اس تہذیبی المیے کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس احساس و اضطراب کا اظہار خطوط میں جا بجا ملتا ہے:

"بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں، ان میں سیکڑوں گرفتار ہیں۔"[۱۳۵]

لکھنؤ کے متعلق لکھتے ہیں:

"لکھنؤ کا کیا کہنا وہ ہندوستان کا بغداد تھا، اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سر و پا وہاں پہنچا امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصل خزاں ہے۔"[۱۳۶]

غالب دوران غدر گھر سے باہر نہیں نکلے۔ آخر تک بلی ماران میں حکیموں کی گلی میں بند رہے۔ چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"میں مع زن و فرزند ہر وقت اس شہر میں قلزم خوں کا شناور ہوں۔ دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا۔ نہ قید ہوا۔ نہ مارا گیا۔"[۱۳۷]

لیکن غدر کی تباہی ایسی ہمہ گیر تھی کہ یہ ممکن نہ تھا کہ پورا ملک اور پوری دلی اس کی لپیٹ میں

نہ آجائے اور حکیموں کی گلی اس سے محفوظ رہے۔ اس مصیبت کا نقشہ بھی غالب نے خطوط میں کھینچا ہے۔ گلی کے دروازے کو پتھر سے چن کر اسے بند کر دیا اور گھروں میں بیٹھے رہے۔ باہر کی لوٹ مار سے تو محفوظ ہو گئے مگر کھانے پینے کا جو سامان گھروں میں تھا وہ تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہو گیا۔ نہ آٹے کی چٹکی تھی نہ پینے کو پانی ایک خط میں لکھتے ہیں:

"گھروں میں کھانے پینے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ سب ختم ہو گیا۔ پانی اگرچہ احتیاط سے پیا گیا لیکن پانی کی بھی ایک بوند نہ رہی عورتوں اور مردوں کی زبان پر پیاس کی شدت سے آبلے پڑ گئے۔"[۱۳۸]

دوران غدر اہل ملک اور دلی والوں پر جو گزر رہی تھی اس کا غم بھی غالب کا اپنا ہی غم تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں، خط بنام ہر گوپال تفتہ:

"ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔"[۱۳۹]

خطوط غالب میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی داستان الم پوری شرح و بسط کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن ایک جگہ نہیں ٹکڑوں میں ہے۔ کہیں کسی کے نام کوئی اشارہ ہے تو کہیں کسی کے نام کوئی تفصیل ہے۔ حالات و واقعات کا کوئی پہلو نہیں ہے جس کا ذکر خطوط غالب میں نہ ہو۔ ہنگامۂ انقلاب کے بعد غالب نے اپنی پنشن کی بازیافت کے لیے جو کوششیں کیں اور انھیں جن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا اظہار بھی خطوط میں موجود ہے۔ بقول اقبال مسعود:

"غدر کے بعد کے خطوں میں بھی غالب کی شخصیت کھی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ اور جس طرح کہنا چاہتے تھے، اس پر بہت سی مصلحتیں مسلط تھیں جس کا احساس ان کے خطوط کی عبارت سے ہوتا ہے لیکن یہ ان کی فنکاری کا نادر نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی فکر کے مبہم و نازک احساسات کو بڑی کامیابی سے الفاظ میں سمو دیا ہے۔"[۱۴۰]

ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں مفصل حالات نہ لکھنے کی مجبوری کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"۱۴۱

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد غالب کی خطوط نویسی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اب خطوط صرف ادائے مطلب ہی کا ذریعہ نہیں رہے بلکہ راز و نیاز کی باتیں کرنے کا ذریعہ بھی بن گئے۔ ان میں جذبات و احساسات، تصورات و تخیلات، واقعہ نگاری و مرقع کشی بھی موجود ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو خطوط کو کاروباری سطح سے بلند کر کے ان کو ادب کے دائرے میں لے آتے ہیں۔ ادب کی یہ وہ خاموش فضا ہے جہاں احباب کی ملاقات ہوتی ہے۔ خط کو عام طور پر نصف ملاقات کہا جاتا ہے لیکن اس خاموش فضا میں خط کبھی کبھی پوری ملاقات بلکہ اس سے بھی زائد بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ انسان جو باتیں سامنے بیٹھ کر نہیں کہہ پاتا وہ خطوط میں کہہ گزرتا ہے۔ خطوط نگاری کا یہی انداز جو ۱۸۵۷ء انقلاب کے بعد تنہائی کی خاموش فضا میں پیدا ہوا۔ غالب کے شاگردوں اور دوستوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ تھا۔

مرزا کے مزاج میں شوخی و ظرافت اس درجہ تھی کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے انھیں "حیوانِ ظریف" کہا ہے۔ یہ شوخی ان کے خطوں میں جا بجا موجود ہے۔ مرزا غالب کی شوخی و ظرافت بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا اندازہ ان لطائف سے لگایا جا سکتا ہے جو مختلف موقعوں پر ان کی حاضر جوابی کی وجہ سے آپ ہی آپ بنتے چلے گئے۔ ذاتی اور اجتماعی ماحول کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں سانس لیتے ہوئے بھی غالب نے اگر خوش طبعی کے چراغ جلائے تو یہ بہت حوصلے کی بات ہے۔ انھوں نے آنسوؤں اور قہقہوں کے درمیان زندہ رہنے اور زندگی کا احساس دلانے کی جو راہ تلاش کی اس میں شوخی و ظرافت کا عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کی ظرافت کے اعلیٰ نمونے ان مقامات پر خصوصاً سامنے آتے ہیں جہاں وہ اپنے مکتوب الیہ کو کوئی ادبی یا لسانی نکتہ اپنے لطیف انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں جو صرف غالب ہی کے انداز تخاطب کا حصہ ہے۔

مرزا گوپال تفتہ کو ایک خط میں قصیدہ نگاری کی روش سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہر حال مجھ کو، کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں، اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ کیا کروں، اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش فارسی ہندوستانی لکھنے کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھانوں کی طرح بکنا شروع کر دوں۔"۱۴۲

غالب کو حیوان ظریف کہا گیا ہے کیوں کہ ظرافت کا مادہ ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کو یہ انعام قدرت کا دیا ہوا تھا۔ غالب بات میں بات پیدا کرنے کا کمال رکھتے تھے۔ نہایت معمولی باتوں کو انھوں نے اتنے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثال کے طور پر وہ خط ملاحظہ ہو جو انھوں نے برسات کے متعلق مختلف دوستوں کو لکھے:

"برسات کا نام آگیا۔ لو پہلے تو مجملاً سنو ایک غدر کالوں کا۔ ایک ہنگامہ گوروں کا۔ ایک فتنہ انہدام مکانات کا۔ ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کے جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزار مکان گر گئے۔"۱۴۳

ان کی ایک ملازمہ تھیں "بی وفادار" مرزا غالب نے ایک خط میں ان کے عادات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"باہر نکلتی ہیں سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ گل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں۔ اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں۔"۱۴۴

غالب کے وہ خطوط جو تعزیت نامے ہیں۔ ان میں بھی ان کی شوخی اور بذلہ سنجی برقرار رہتی ہے۔ امراؤ سنگھ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تو غالب اپنی بذلہ سنجی سے باز نہیں آئے۔

"امراؤ سنگھ کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچے کو پال لوں گا۔ کیوں بلا میں پھنستا ہے۔" ۱۳۵

غالب کو یوسف مرزا سے بہت محبت تھی۔ پہلے ان کے بیٹے کی وفات ہوئی اور کچھ عرصے بعد ان کے والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس موقع پر مرزا غالب نے جو تعزیت نامہ لکھا اس کی نقل ملاحظہ کیجیے:

"یوسف مرزا کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔"

۱۳۶

مرزا کے بہت سے خطوط ایسے ہیں جن میں علمی بحثیں کلام کی اصلاح اور ان کے کلام کی تشریح و توضیح ملتی ہے جن سے ان کے کلام کے مفہوم تک پہنچنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ خطوط غالب کے اسی پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے اخلاق حسین عارف نے لکھا ہے:

"غالب کی نثری تصانیف میں مکتوبات کا سرمایہ گراں بہا ہے۔ وہ اگر ان کی داخلی اور خارجی زندگی کے ترجمان ہیں تو دوسری طرف ان کی شوخی تحریر اور نفاست کی جیتی جاگتی تصاویر ہیں۔ غالب کے کلام کا معتدبہ حصہ ایسا ہے جس کی تشریح انھوں نے اپنے مکتوبات میں کر دی ہے۔ بہت سے اشعار جن میں کوئی پیچ پایا جاتا ہے، ان کا مطلب واقعی کی تشریح کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے۔ بہت

سے اشعار انھوں نے اپنے مکتوبات میں ایسے استعمال کیے ہیں جن سے اشعار سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے بھی واقفیت ہوتی ہے کہ وہ اشعار انھوں نے کب اور کس موقع پر کہے۔" ۱۳۷

غالب کے خطوط ادبی بحثوں سے بھرے ہوئے کسی خط میں کسی شاگرد کو فن کے نکتے سمجھائے ہیں۔ یا کسی میں غلطی پر ٹوکا ہے کسی میں اپنی فارسی دانی کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ کسی میں اپنے کلام کی داد چاہی ہے۔ کسی میں کسی فارسی شعر یا لغت نویس کا مذاق اڑایا ہے کسی میں دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اس طرح خطوط ان کی زندگی اور تاریخی اہمیت کے علاوہ ادبی معنویت بھی رکھتے ہیں۔ علمی بحثوں میں تذکیر و تانیث کے متعلق غالب نے جس بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ قابل قدر ہے جس سے غالب کے صاف ذہن ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں ہے جس پر حکم کیا جائے۔ جو جس کے کانوں کو لگے جس کا دل قبول کرے اسی طرح کہے۔ رتھ میرے نزدیک مذکر ہے یعنی رتھ آیا۔ لیکن جمع میں کیا کہوں گا چار مونث بولنا پڑے گا۔ یعنی رتھیں آئیں۔ خیر مونث ہے باتفاق مگر کا اقضا اس کو مجھ کو تمہارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ بڑ ہوئی یا ہوا یہ متعلق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں ہم کہیں کے دو شنبہ ہوا۔ بڑا کا دن ہوا۔ بڑ ہوئی یا بڑ ہوا ہم کیوں بولیں گے۔ بلبل میرے نزدیک مونث ہے۔ جمع اس کی بلبلیں طوطی بولتا ہے بلبل بولتی ہے۔ بھائی اس امر میں منطق و مجتہد نہیں بن سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتا ہوں۔ جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔" ۱۳۸

خطوط غالب میں علمی بحثوں کے یہ نمونے اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ اردو نثر کے فروغ و ترقی میں جہاں اس وقت ادبی اظہار کے لیے نئے نئے پیرایوں کی ضرورت تھی، وہاں علمی اظہار کے لیے بھی ایک ٹھوس منطقی پیرائے کی ضرورت تھی جس میں کوئی حشو و زوائد نہ ہوں۔ بلکہ علمی معلومات سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ طالبان علم تک پہنچا دی جائیں اور ان کے ذہن پر زبان و طرز بیان کا کوئی بوجھ نہ پڑے۔

145 - 144

مطلب کے اظہار کے لیے اردو زبان نے ہر دور میں اپنے دامن کو وسیع کیا۔ مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ غالب کے زمانے میں انگریزی اثر و نفوذ شروع ہو چکا تھا۔ نئی حکومت کے ساتھ نئی تہذیبی، تمدنی، اور علمی اصطلاحات اور الفاظ اردو کے دامن میں آ رہے تھے۔ حالانکہ غالب انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن ان الفاظ سے آگاہ تھے جو اس دور میں رائج ہو چکے تھے۔ غالب کے خطوط میں انگریزی کے اکثر الفاظ مل جاتے ہیں۔ مثلاً ٹکٹ، پوسٹ پیڈ، رجسٹری، بکس، پاکٹ، پارسل، پمفلٹ، پاکٹ، کونسل، لیکچر، سارٹیفکٹ، کیمپ، چیف سیکریٹری، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، گورنمنٹ، پولیٹکل، رپورٹ، ایگریمنٹ وغیرہ کا استعمال خطوط غالب میں جا بجا ملتا ہے:

"یقین ہے تم رپورٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم آ جائے گا۔"۱۴۹

"یوں تمام عمر بخوبی گزر جائے لیکن تم کے برس، کے مہینے، کے بچے کا اگریمنٹ لکھتے ہو۔"۱۵۰

"کیوں صاحب ایڈیشنل خط پوسٹ پیڈ بھیجا اور وہ بھی دلی سے سکندر آباد کو آیا۔ حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا۔"۱۵۱

غالب نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ محاوروں کا استعمال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے نثری اسلوب میں شگفتگی، سلاست اور بے تکلفی پیدا ہو گئی ہے۔ خطوط غالب میں استعمال کیے گئے کچھ محاوروں کی مثال اس طرح ہے: چھاتی پر سانپ پھر جانا، آنکھ پھوٹنا، ہاتھ دھو بیٹھنا، جان کے لالے پڑنا، جہاں کو سر پر اٹھانا وغیرہ۔ اس کے علاوہ کہاوتوں کا استعمال نہ صرف خطوط میں دلچسپی کا اضافہ کرتے ہیں بلکہ اسلوب میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

مراسلت میں اشعار کا استعمال ہمارے یہاں ایک عام رواج رہا ہے۔ اشعار کے استعمال سے مکتوب الیہ تو متاثر ہوتا ہی ہے ساتھ میں مکتوب نگار کے حسن ذوق اور ادبیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ شعر کے استعمال سے مفہوم حسین پیرائے میں اور کم سے کم الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ جس سے عبارت کا زور و اثر اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ اگر شعر اعلیٰ درجے کا ہو تو عبارت کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

غالب نے اپنے خطوط میں فارسی اشعار کے ساتھ ساتھ اردو اشعار کا بھی استعمال کیا ہے۔

اس سے خطوط کی ادبی شان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اردو اشعار کے استعمال سے تحریر میں مزید لطف پیدا ہوتا ہے۔ غالب نے مکتوب الیہ کو اپنا کوئی شعر، قطعہ، قصیدہ یا غزل بھیجی ہے۔ مگر اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ خطوط غالب میں ایسے اشعار موجود ہیں جو انھوں نے مکتوب الیہ کو بحیثیت شاعر نہیں بلکہ بحیثیت مکتوب نگار ارسال کیے ہیں۔ غالب نے بحیثیت مکتوب نگار ادائے مطلب یا حسن بیان میں اثر پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ وہ جزو عبارت بن گئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی دوسرا لکھنے والا ان کے اشعار کا استعمال کرتا ہے۔

خطوط غالب کے اشعار کا اگر ان کے دیوان سے مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر انھوں نے ترمیم و تغیر کر دیا ہے۔ خطوط میں ایسے مصرعے اور شعر بھی موجود ہیں جو ان کے دیوان میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن خط لکھتے وقت برجستہ موزوں ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو شعریت اور دلکشی ہے اور بعض ہنگامی نوعیت یا مزاح کا پہلو لیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان اشعار کے متعلق خلیق انجم نے لکھا ہے:

"کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے موقع اور محل کی مناسبت سے کوئی شعر یا مصرع موزوں کر دیا ہے۔ بعض مصرعے اس روانی کے ساتھ آئے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ غالب کے قلم سے برجستہ نکل گئے ہیں جس کا احساس شاید خود غالب کو بھی لکھنے کے بعد ہوا ہو۔ مفہوم کی ادائیگی کے لیے کہے گئے یہ فی البدیہہ شعر عام طور سے جذبے کی آنچ، شعریت اور تاثیر سے محروم ہیں۔"۱۵۲

غالب نے خطوط میں اپنے اشعار کے علاوہ اردو اور فارسی کے دوسرے شاعروں کے شعروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً فارسی میں انوری، عرفی، سعدی، حافظ شیرازی، کلیم اور ظہوری کے علاوہ دیگر شعرا کے اشعار استعمال کیے ہیں۔

غالب کے وہ اشعار جس میں انھوں نے ترمیم و تغیر کر دیا ہے ان میں سے کچھ اس طرح ہیں مثلاً:

"مشفق دیکری چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام شوق کہیے گا اور یہ پیغام پہنچا دیجیے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بقید مارہرہ کہنا یاں سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے:

147-146

خواہش وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں۔" ۱۵۳

دیوان غالب میں یہ مصرعہ اس طرح ہے:

مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

اسی طرح میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"قرۃ العین میر مہدی و میر سرفراز حسین مجھ سے ناخوش و گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھتا۔"

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں		کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے۔" ۱۵۴

دیوان غالب میں یہ شعر اس طرح ہے:

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل آیا ہے کہ جس کو بہت دن ہوئے آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب کو نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے ۱۵۵

دیوان غالب میں مصرعہ اولی اس طرح ہے:

عشق نے غالب نکما کر دیا

خط بنام میاں داد خاں سیاح:

"تم برا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو:

غالب برا نہ مان جو دشمن برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے ۱۵۶

دیوان غالب میں مصرعہ اولی اس طرح ہے:

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے

خطوط غالب میں کچھ اشعار ایسے ہیں جو غالب کے دیوان میں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً خط بنام صفیر بلگرامی:

"آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ سترواں برس لگے جاتا ہے۔

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں تین چار برس ۱۵۷

یہ شعر غالب کے دیوان میں نہیں ہے۔

خط بنام علاء الدین احمد خاں علائی:

"ولی عہد میں شادی ہو مبارک
عنایت الٰہی ہو مبارک ۱۵۸

غالب نے علائی کے نام اس شعر سے خط کی ابتدا کی ہے۔ یہ شعر دیوان غالب میں نہیں ہے۔

خط بنام میر مہدی مجروح:

"زلزلہ اس شہر میں ایک منجم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت ہے۔" ۱۵۹

اس خط میں جو شعر لکھا گیا ہے وہ غالب کے دیوان میں نہیں ہے۔

شیخ محمد اکرام نے اردو کے کچھ اشعار دیوان میں موجود نہ ہونے کی وجہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اردو کے کئی اشعار ہیں جو دیوان غالب کی چوتھی اشاعت میں نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض تو بعد میں لکھے گئے۔ بعض (مثلاً غدر کے متعلق قطعہ) کی دیوان میں شمولیت مرزا نے مناسب خیال نہ کی ہوگی۔ اور چند ایک دیوان مرتب کرتے وقت مرزا کے پیش نظر نہ ہوں گے۔" ۱۶۰

غالب نے اپنے اشعار سے خطوں کی ابتدا کی ہے ان میں سے چند اس طرح ہیں:

خط بنام تفتہ:

"دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے "۱۶۱

خط بنام شہزادہ بشیر الدین

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار　　۱۶۲

نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں روسائے رام پور کے نام جو خط غالب نے لکھے ہیں ان کے آخر میں یہ شعر اکثر لکھا ہے۔

غالب کے خطوط کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ خط نہیں معلوم ہوتے انھوں نے خط کو کبھی خط سمجھ کر لکھا ہی نہیں۔ انھوں نے خطوط ہمیشہ اس طرح سے لکھے جیسے خطوط نہ لکھے ہوں بلکہ ڈرامے لکھے ہوں مراسلے کو مکالمے میں تبدیل کر دینا غالب کا فن خاص رہا ہے۔ انھوں نے اس بات کو خود بھی محسوس کیا اور مراسلے کو مکالمے بنانے کا دعوہ کیا ہے۔ ان کے خطوط ان کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ بقول احمد ابراہیم علوی:

"حقیقت تو یہ ہے کہ غالب اپنے اشعار میں جتنا چھپا ہوا ہے اتنا ہی اپنے خطوط میں کھلا ہوا ہے۔ اس کے خطوط اس کی شخصیت کی اس طرح آئینہ داری کرتے ہیں کہ اس کی عادات و اطوار، اس کا رہن سہن، اس کا کردار و گفتار کچھ اس طرح عیاں ہے کہ اب تلاش و جستجو کی گنجائش نہیں جسے غالب کو دیکھنا ہو سمجھنا ہو وہ اس کے خطوط پڑھ لے۔" ۱۶۳

اردو ادب میں مرزا غالب کی پہچان کا ذریعہ شاعری اور خاص طور سے غزل ہے اور نثر میں ان کے خطوط بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ عظمت اور خطوط کی اہمیت و قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ غالب کے خطوط پر تحقیقی و تنقیدی کام کا سلسلہ ہر زمانے میں جاری ہے اور اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان کی خوبیوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"غالب کے خط کو لکھے ایک زمانہ ہوتا ہے۔ اس طویل مدت میں اردو زبان نے بڑی ترقی کی ہے۔ بڑے بڑے اہل قلم نے اپنے نتائج طبع سے اس زبان کو مالا مال کیا ہے۔ اور اب زبان میں اتنی لچک اور وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ طرح طرح کے خیالات اور علمی مضامین آسانی سے اس زبان میں ادا ہو سکتے ہیں۔ لیکن زبان اور ادب کے اس ترقی کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ مرزا جیسا انشا پرداز جو روزمرہ کے معمولی واقعات کو اس خوبی اور صفائی سے بیان کرے کہ ان میں افسانے کی دلچسپی اور اشعار عاشقانہ کی دل آویزی نظر آنے لگے، ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔" ۱۶۴

غالب کے خطوط تاریخی، ادبی اور سوانحی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطوں کی شگفتگی و دل پذیری، معنی گیری، تہذیبی مصوری اور سیاسی و عصری عکاسی قابل ذکر ہے۔ یہ خط صرف خط نہیں ہیں بلکہ ہماری قدر و تہذیب کی مثبت تاریخ ہیں۔ غالب کے خطوط اپنے عزیزوں، دوستوں، جاننے والوں اور شاگردوں کو لکھے گئے ہیں جن میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے علاوہ اس وقت کے مختلف مسائل، حالات و واقعات اور دوسری علمی، ادبی، سیاسی، سماجی باتوں کا ذکر غالب نے اس طرح کیا ہے کہ خطوں کو اپنے دور اور زمانہ کا آئینہ دار ہی نہیں بنایا بلکہ اردو نثر میں اسے وہ درجہ دیا جہاں اردو کے بہت کم نثر نگار پہنچ سکے ہیں۔ عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں:

"غالب کے خطوط کی اہمیت، عظمت اور مقبولیت کی کوئی ایک وجہ نہیں ہے۔ بہت سی خصوصیات اور خوبیوں نے مل کر ان خطوں کے مرتبے کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ اردو خط نگاری کی دنیا میں غالب جیسا قد آور شخص کوئی اور نہیں نظر آتا۔ یہ خطوط بے پناہ خلوص کے مظہر، تکلف سے بری، تصنع سے بے نیاز اور مبالغے سے پاک نظر آتے ہیں۔ ان میں سچائی، اپنائیت اور ماحولیت کی فضا ملتی ہے۔ ایسے مکمل ماحول میں غالب اپنے مکتوب الیہ سے بہت قریب ہو کر ہنستے، بولتے، چلتے پھرتے، علمی مباحث میں حصہ لیتے، اصلاح دیتے، شعر سناتے،

151 - 150

مسکراتے، چٹکیاں لیتے، ناراض ہوتے، غصہ کرتے، اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا اظہار کرتے، سرگوشی کرتے، اپنے دکھ درد سناتے، دوسروں کے غم والم میں شریک ہوتے، شکوے شکایتیں کرتے، لطیفے سناتے، اپنے پرزے اڑاتے، دوسروں کی دھجیاں بکھیرتے، دوستوں کی تعریف کرتے اور یاروں سے چھیڑ کرتے نظر آتے ہیں اور چونکہ اس پوری فضا پر سادگی اور سچائی کی حکمرانی رہتی ہے۔ اس لیے غالب کے جذبات واحساسات، تاثرات اور تخیلات ہم سب کو معلوم ہونے لگتے ہیں۔"١٩٥



حواشی

١۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص ١٥٣، لکشمی نارائن اگروال تاجر کتب، آگرہ، ١٩٣٨ء
٢۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جون ١٩٦٧ء، "مرزا قتیل کے غیر مطبوعہ اردو خطوط"
٣۔ مکتوب اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، غیر مطبوعہ، ص ٩٧
٤۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص ٣٣٩، آگرہ اخبار پریس، آگرہ، ١٩٦٦ء
٥۔ مختصر تاریخ ادب اردو، سید اعجاز حسین، ص ٢١٦
٦۔ انشائے بہار بے خزاں، غلام امام شہید، ص ٣، مطبع منشی نول کشور، ١٨٨٩ء
٧۔ غالب اور شاہان تیموریہ، خلیق انجم، ص ١٣٠
٨۔ دور جدید کے اردو خطوط: تنقیدی جائزہ، عبداللطیف اعظمی، ص ١٥، غیر مطبوعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
٩۔ انشائے بہار بے خزاں، غلام امام شہید، ص ٢٢
١٠۔ ایضاً، ص ٣٢
١١۔ ایضاً، ص ٥٣
١٢۔ ایضاً، ص ٥٥

١٣۔ ایضاً، ص ٥٦-٥٥
١٤۔ ایضاً، ص ٣٩-٣٨
١٥۔ ایضاً، ص ٦٠
١٦۔ ایضاً، ص ٦٦-٦٥
١٧۔ ایضاً، ص ٦١
١٨۔ ایضاً، ص ٦٢
١٩۔ ایضاً، ص ٦٩
٢٠۔ ایضاً، ص ٣٥-٣٣
٢١۔ اردو خطوط، شمس الرحمٰن، ص ٢٥، بار اول، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی، جولائی ١٩٣٧ء
٢٢۔ انشائے بہار بے خزاں، غلام امام شہید، ص ٣٣-٣٢
٢٣۔ ایضاً، ص ٣٢
٢٤۔ ایضاً، ص ٩٥-٩٣
٢٥۔ واجد علی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات، کوکب قدر سجاد علی میرزا، ص ٣٢، ٥٣۔ بحوالہ اسرار واجدی، الحسن الحسین، تقویم سلطانی، اختر جناں، تاریخ اودھ، واجد علی شاہ
٢٦۔ ذوق جستجو، خواجہ احمد فاروقی، ص ١٣٩-١٣٨، ادارۂ فروغ اردو، امین آباد لکھنؤ، فروری ١٩٦٧ء
٢٧۔ ذوق جستجو، ص ١٣٨-١٣٧
٢٨۔ واجد علی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات، ص ٣٠٣
٢٩۔ ایضاً، ص ٣١٥
٣٠۔ واجد علی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات، ص ٣١٥
٣١۔ تاریخ نور، کلیم الدین احمد، ص ٢١، ٣٠۔ دائرۂ ادب، پٹنہ، جولائی ١٩٧٢ء
٣٢۔ بحوالہ واجد علی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات، ص ٢٣٨
٣٣۔ ذوق جستجو، ص ١٣٨
٣٤۔ تاریخ نور، کلیم الدین احمد، ص ٢١، ٣٠۔ دائرۂ ادب، پٹنہ، جولائی ١٩٧٢ء

۳۵۔ تاریخ ممتاز، بحوالہ تاریخ نور، کلیم الدین احمد، ص ۵

۳۶۔ تاریخ نور، ص ۷۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۹-۴۸

۳۸۔ ایضاً، ص ۴۵

۳۹۔ ایضاً، ص ۷۵

۴۰۔ ایضاً، ص ۵۹

۴۱۔ تاریخ حیدر (قلمی) ص ۱۹، بحوالہ: واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات، ص ۲۱۸

۴۲۔ تاریخ غزالہ، ص ۲۵-۲۳، بحوالہ: ایضاً، ص ۲۰۶

۴۳۔ ایضاً، ص ۳۲-۳۱۔ بحوالہ: ایضاً

۴۴۔ تاریخ ممتاز، ص ۴۱

۴۵۔ ایضاً، ص ۵۷

۴۶۔ تاریخ جمشیدی، بحوالہ: واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات۔ ص ۲۵۰

۴۷۔ ذوق و جستجو، ص ۱۵۰

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۵۲-۱۵۱

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۵۰۔ ذوق و جستجو، ص ۱۶۶

۵۱۔ انشائے سرور، مرتبہ مرزا علی احمد، ص ۵، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ

۵۲۔ ایضاً، انشائے سرور، مرتبہ مرزا علی احمد، ص ۹۹، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ

۵۳۔ رجب علی سرور: حیات اور کارنامے، نیر مسعود، ص ۳۱۱

۵۴۔ خواجہ احمد فاروقی، مکاتیب رجب علی بیگ سرور، ماہنامہ نگار، نومبر ۱۹۳۳ء

۵۵۔ انشائے سرور، رقعہ ۶۵، ص ۷۰

۵۶۔ ایضاً، رقعہ ۵۶، ص ۵۳

۵۷۔ ایضاً، رقعہ ۳۰، ص ۵۴

۵۸۔ ایضاً، رقعہ ۳۱، ص ۴۰

۵۹۔ غالب اور شاہان تیموریہ، خلیق انجم، ص ۱۳۶، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

۶۰۔ انشائے سرور، رقعہ ۱۵، ص ۱۹

۶۱۔ ایضاً، رقعہ ۱۷، ص ۲۳

۶۲۔ ایضاً، رقعہ ۱۹، ص ۲۴

۶۳۔ خواجہ احمد فاروقی، ماہنامہ نگار، نومبر ۱۹۳۳ء، ص ۴۲

۶۴۔ رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے، ص ۳۳۵

۶۵۔ فغان بے خبر، خواجہ غلام غوث بے خبر، ص ۲

۶۶۔ انشائے بے خبر، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، ص ۳۵، خط بنام غلام علی خان، مطبع سود پریس دلّی، ناشر ادبی دنیا، ذگی روڈ، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء

۶۷۔ انشائے بے خبر، ص ۸

۶۸۔ مقدمہ انشائے بے خبر، سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، ص ۸

۶۹۔ انشائے بے خبر، خط بنام مولانا غلام امام شہید، ص ۱۰

۷۰۔ انشائے بے خبر، مقدمہ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، ص ۹-۷

۷۱۔ ایضاً، ایضاً، ص ۶

۷۲۔ ایضاً، ص ۳۷

۷۳۔ فغان بے خبر، ص ۳۳۶

۷۴۔ فغان بے خبر، ص ۶۸

۷۵۔ انشائے بے خبر، ص ۱۷، خط بنام مولوی محمد حامد

۷۶۔ غالب اور شاہان تیموریہ، خلیق انجم، ص ۱۴۰، کوہ نور پریس، دہلی، ۱۹۷۴ء

۷۷۔ انشائے بے خبر، ص ۷

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۱، خط بنام مرزا اسد اللہ خاں غالب

۷۹۔ وجہی سے عبدالحق تک، سید عبداللہ، ص ۲۸۹

۸۰۔　انشائے بے خبر، خط بنام مولوی محمد حامد، ص ۲۱

۸۱۔　ماہنامہ سب رس غالب نمبر اکتوبر ۱۹۷۹ء

۸۲،۸۳،۸۴۔ انشائے بے خبر، ص ۱۹

۸۵۔　داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص ۲۳۵، ناشر اخبار پریس آگرہ، ۱۹۶۶ء

۸۶۔　انشائے بے خبر، ص ۶

۸۷۔　داستان تاریخ ادب اردو، حامد حسن قادری، ص ۲۳۷

۸۸۔　خطوط غالب، مرتب: مولانا مہر، ص ۱۵۱

۸۹۔　مکاتیب غالب، مرتب: امتیاز علی عرشی، ص ۲۳۹، کتاب خانہ رام پور، بار ششم، ۱۹۳۹ء

۹۰۔　ایضاً، ایضاً، ایضاً

۹۱۔　مکاتیب غالب، امتیاز علی عرشی، ص ۲۳۸-۲۳۷

۹۲۔　خط بنام غلام غوث بے خبر، ۷، مارچ ۱۸۶۳ء، خطوط غالب، از مہر، ص ۳۳۸

۹۳۔　انشائے بے خبر، ص ۱۱

۹۴۔　خط بنام علائی، ۱۸۶۳ء، خطوط غالب، ص ۵۵-۵۶، غلام رسول مہر

۹۵۔　اردوئے معلی پر ایک نظر، پروفیسر ظہیر زیدی

۹۶۔　دیباچہ مکاتیب غالب، مرتب: امتیاز علی عرشی، ص ۲۵۳

۹۷۔　میرن صاحب کے نواسے

۹۸۔　مقدمہ خطوط غالب، از غلام رسول مہر، ص ۱۱

۹۹۔　پروفیسر بنارس یونیورسٹی

۱۰۰۔　مقدمہ خطوط غالب، از غلام رسول مہر، ص ۱۵

۱۰۱۔　ایضاً　　ایضاً　　ایضاً

۱۰۲۔　غالب کے خطوط، خلیق انجم، ص ۲۵-۴۳

۱۰۳۔　ایضاً　　ایضاً　جلد اول، ص ۱۳، ۲۰۰۰ء

۱۰۴۔　مطالعہ خطوط غالب، عبدالقوی دسنوی، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ، مئی ۱۹۷۹ء

۱۰۵۔　سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۲۵۶، ۱۹۹۲ء

۱۰۶۔　غالب کے خطوط، خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص ۱۳۹، ۲۰۰۰ء

۱۰۷۔　خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۱۶۰

۱۰۸۔　ایضاً　　ایضاً　ص ۲۸۶

۱۰۹۔　ایضاً　　ایضاً　ص ۳۶

۱۰۰۔　خط بنام یوسف مرزا، ص ۴۰۴

۱۱۱۔　خطوط غالب، ص ۲۸۰

۱۱۲۔　ایضاً، ص ۳۲۹

۱۱۳۔　ایضاً، ص ۶۸-۶۹

۱۱۴۔　خطوط غالب، ص ۱۸۰

۱۱۵۔　خطوط غالب، ص ۳۲۹

۱۱۶۔　خطوط غالب، ص ۶۸-۶۹

۱۱۷۔　خط بنام تفتہ، اکتوبر ۱۸۶۳ء

۱۱۸۔　خطوط غالب، ص ۲۹۷

۱۱۹۔　خط بنام علاء الدین علائی

۱۲۰۔　خطوط غالب، ص ۳۶۲

۱۲۱۔　ایضاً، ص ۵۶

۱۲۲۔　ایضاً،

۱۲۳۔　ایضاً، ۳۸-۳۹

۱۲۴۔　خطوط غالب، ص ۵۶

۱۲۵۔　ایضاً

۱۲۶۔　ایضاً

۱۲۷۔　ایضاً، ص ۲۸۰

۱۲۸۔ غالب کے خطوط، خلیق انجم، ص ۱۵۱
۱۲۹۔ خطوط غالب، ص ۴۹۰
۱۳۰۔ غالب کی خطوط نگاری، ضیا احمد بدایونی، ص ۱۱۵، اپریل تا جون ۱۹۶۹ء، العلم کراچی
۱۳۱۔ بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء
۱۳۲۔ العلم کراچی، اپریل تا جون ۱۹۶۹ء، ۲۷ (غالب کی سوانحی حیثیت)
۱۳۳۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، ص ۱۴۴، مرتب: تنویر احمد علوی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۱ء
(غالب کا جذبہ حب الوطنی اور ستاون)
۱۳۴۔ خطوط غالب، ص ۲۹۳
۱۳۵۔ ایضاً، ص ۴۵۶
۱۳۶۔ خطوط غالب، ص ۴۳۷
۱۳۷۔ اردوئے معلی، ص ۱۰۴
۱۳۸۔ العلم کراچی، ص ۱۰۴، ۱۹۳۹ء
۱۳۹۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، ص ۱۳۹
۱۴۰۔ مجلہ سیفیہ، غالب نمبر، اقبال مسعود، انقلاب ۱۸۵۷ء کا غالب پر اثر، ص ۳۰۴
۱۴۱۔ خط بنام ہرگوپال تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء
۱۴۲۔ غالب کے خطوط، خلیق انجم، ص ۴۳۶
۱۴۳۔ خط بنام میر مہدی
۱۴۴۔ خطوط غالب، مہر، ص ۳۹
۱۴۵۔ اردو خطوط، مہر، ص ۱۷۰
۱۴۶۔ خطوط غالب، مہر، ص ۴۰۹
۱۴۷۔ غالب کا تنقیدی شعور: مکتوبات کے آئینے میں، اخلاق حسین عارف، ص ۴۰، ادارہ فروغ
اردو، امین آباد لکھنؤ، ۱۹۹۹ء
۱۴۸۔ خطوط غالب، مہر، ص ۳۱۷

۱۴۹۔ ایضاً　ایضاً　ص ۱۱۶
۱۵۰۔ ایضاً　ایضاً　ص ۹۸
۱۵۱۔ غالب کے خطوط، جلد اول، ص ۲۰۵
۱۵۲۔ ایضاً　ایضاً　ص ۱۸۳
۱۵۳۔ خط بنام شاہ عالم، خطوط غالب، مہر، ص ۵۹
۱۵۴۔ ۱۷ جولائی ۱۸۶۸ء، ایضاً، ص ۳۱۱
۱۵۵۔ ۲۱ نومبر ۱۸۶۳ء، ایضاً، ص ۱۹۱
۱۵۶۔ خطوط غالب، ص ۳۳۵، ۵ دسمبر ۱۸۶۶ء
۱۵۷۔ ایضاً، ص ۵۹۸، ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء
۱۵۸۔ ایضاً، ص ۸۴، ۱۸۶۳ء
۱۵۹۔ ایضاً، ص ۴۷۳
۱۶۰۔ غالب نامہ یا آثار غالب، شیخ محمد اکرام، ص ۲۳۹، احسان بک ڈپو، پرنٹنگ پریس لکھنؤ
۱۶۱۔ عود ہندی، ص ۱۴۳
۱۶۲۔ خطوط غالب، مہر، ص ۴۱۵
۱۶۳۔ مکاتیب غالب اور اس کی ادبی افادیت، اردو ادب، غالب نمبر، ص ۱۹۳، شمارہ ۱۹۶۹ء
۱۶۴۔ غالب نامہ یا آثار غالب، شیخ محمد اکرام، ص ۴۳۰
۱۶۵۔ مطالعہ خطوط غالب، عبدالقوی دسنوی، ص ۳۷



تیسرا باب

عہد سرسیدؔ میں اُردو مکتوب نگاری

(سرسید اور ان کے رفقاء)

- سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء–۱۸۹۸ء)
- محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء–۱۹۱۰ء)
- مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶ء–۱۹۱۲ء)
- نواب محسن الملک (۱۸۳۷ء–۱۹۰۷ء)
- مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء–۱۹۱۴ء)
- نواب وقار الملک (۱۸۴۱ء–۱۹۱۷ء)
- شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء–۱۹۱۴ء)

○

سرسید احمد خاں ہماری قومی و ملی تاریخ کے مستحکم ستون اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں قدآور شخصیت کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام مطالعے کا ایک وسیع موضوع ہے۔ سرسید کے سیاسی افکار، مذہبی خیالات، تعلیمی تصورات اور ادبی خدمات غرض ہر پہلو پر تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکا ہے۔ اگر سرسید کے عہد کی خطوط نویسی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بھی ایک وسیع موضوع ہے کیونکہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے مختلف موضوعات پر خطوط لکھے ہیں۔

عہد سرسید کے مکتوب نگاروں کے اردو خطوط اس خاص طرز کی ترجمانی کرتے ہیں جس نے تاریخ و سوانح، تحقیق و تنقید، ناول و افسانہ، طنز و مزاح، انشائیوں اور مضامین کو نئی جہات عطا کیں اور زبان کو اس لائق بنایا کہ تمدنی، سائنسی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ غرض کہ مختلف موضوعات کو پیش کر سکے۔

اسلوبیاتی اعتبار سے اس دور کی مکتوباتی نثر میں عبارت آرائی کے بجائے سادگی مقصدیت اور واقعیت ملتی ہے۔ چنانچہ سرسید کے عہد کے خطوط میں فنی نقطۂ نظر سے عبارت آرائی کم ہوئی تکلف کی جگہ سادگی نے لی اس لیے اس دور کے خطوط میں براہ راست بات کہنے کی جھلکیاں زیادہ نظر آتی ہیں اور اس دور کی ابتدا سے ہی یہ رجحان ہمہ گیر اور پسندیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خط تحریر کرتے وقت القاب و آداب کے علاوہ غرض مدعا کی ضرورت کو سب سے پہلے مد نظر رکھا جاتا تھا۔ اس عہد کے بیش تر اردو مکتوب نگاروں کے یہاں نثر نگاری کا ایک خاص رنگ ملتا ہے جو سادیت، اجتماعیت، عقلیت

اور حقیقت نگاری سے متاثر ہے۔ مقصدیت، متانت اور سنجیدگی نے زیادہ تر تحریروں میں ادبی خلوص کی فضا پیدا کردی ہے۔

سرسید احمد خاں کے عہد کے مکتوب نگاروں کی اپنی شخصیت کے اثرات بھی ان کے خطوط کے مختلف نمونوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ حالانکہ اس دور میں مکتوبات سیاسی، سماجی، معاشرتی احوال اور اسلوب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک خاص رنگ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس دور کے مکتوبات میں رسائل وجرائد اور صحافت کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس دور کا اہم رجحان عقلیت پسندی ہے۔ جس نے ذہنوں کو سوچنے کے نئے زاویے عطا کیے۔ اس عقلیت پسندی کی وجہ سے ہی اس دور کے مکتوب نگار ایک جداگانہ انداز تحریر کرنے پر آمادہ ہوئے۔ بقول ثریا حسین:

> "اردو مکتوب نگاری میں علی گڑھ تحریک سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان کے اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح خطوط نویسی کا رنگ بھی بدل دیا اور تاریخ، سوانح، تحقیق زبان، تنقید، تبصرہ، ناول، افسانہ، طنز ومزاح اور صحافت نے بھی مراسلے کو فروغ دیا۔"[1]

سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں کے خطوط سے اردو کے مکتوباتی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ غالب کے بعد سرسید احمد خاں پہلے شخص ہیں جن کے خطوط زبان وادب اور علم وعمل کے نقطہ نظر سے دلکشی اور افادہ کا گنجینہ ہیں۔ ان کے نجی یا ذاتی نوعیت کے خطوط بھی موجود ہیں اور قومی وملکی ومذہبی معاملات کے متعلق بھی۔ ان کے خطوط سے سرسید احمد خاں کی سیرت واخلاق کا صحیح واصلی نقشہ مرتب ہوسکتا ہے۔

سرسید کے خطوط کے کئی مجموعے دستیاب ہیں، جن کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ مجموعہ خطوط: مرتبہ احمد الدین نبیرۂ سرسید

اس مجموعے میں ایک سو بائیس خطوط ہیں۔ جس کو ۱۸۹۹ء میں احمد الدین نے مرتب کیا تھا۔ مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات کے سیکشن میں یہ مجموعہ موجود ہے۔

۲۔ تحریر فی اصول التفسیر

مطبع مفید عام، آگرہ سن اشاعت ۱۸۹۲ء۔ یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں اصول تفسیر سے متعلق سرسید احمد خاں کے دو خطوں کو شامل کیا گیا ہے۔

۳۔ مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن

مرتبہ عثمان مقبول، مطبع احمدی۔ علی گڑھ سے یکم فروری ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں سرسید احمد خاں کے تین خط شامل ہیں۔

۴۔ سرسید کے خطوط: مرتبہ۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی ۔ ے

یہ مجموعہ حالی پریس پانی پت سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں پچپن خطوط شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

خطوط زمانی اعتبار سے ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۱ء تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ رسالہ معارف کے شماروں میں اپریل، مئی، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۱ء میں چھپے یہ خطوط محسن الملک، زین العابدین، منشی نیاز محمد خاں، میر واحد علی، شیخ محمد عمر، نواب انتصار جنگ، سردار محمد حیات خاں، الطاف حسین حالی اور منشی سراج الدین کے نام ہیں۔

۵۔ خطوط سرسید: مرتبہ۔ سر راس مسعود ۔ ح

دو سو بیالیس خطوط کا یہ مجموعہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا مقدمہ مولوی عبداللہ جان وکیل سہارن پور کا لکھا ہوا ہے۔ مکتوب الیہم کی تعداد اٹھائیس ہے اور ان کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کے ابتدائی صفحہ اول پر سرسید کی تصویر ہے۔ بعد فہرست خطوط کے "سرسید مرحوم کے خط کا عکس" کے عنوان سے ایک تصدیق نامہ سرسید احمد خاں کے اپنے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ اس مجموعے کے دو ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

۱۔ نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۴ء، صفحات ۳۳۲
۲۔ نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱ء، صفحات ۲۶۲

۶۔ انتخاب مکاتیب: مرتبہ۔ شیخ عطاء اللہ ۔ ط

سرسید احمد خاں شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کے خطوط کا انتخاب قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے ناشر نصیر الدین ہمایوں تھے۔ اس میں سرسید کے چالیس خطوط شامل ہیں اور سیر حاصل تبصرہ بھی درج ہے۔ خطوط کو عنوانات کے تحت بانٹا گیا ہے اور مکتوب الیہم کا مختصر تعارف بھی درج ہے۔

۷۔ مکتوبات سرسید احمد خاں: مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی

یہ مجموعہ ۱۹۵۹ء میں مجلس ترقی ادب، زرین آرٹ پریس ریلوے روڈ لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں شامل خطوط کی تعداد ۳۲۳ ہے اور ۱۸۳۹ء سے ۱۸۹۸ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان میں چند خطوط فارسی میں بھی ہیں۔ سرورق کے فوراً بعد سرسید احمد خاں کی تصویر ہے۔ اس کے بعد "مکتوبات سرسید" کے عنوان سے فہرست ہے۔ اس میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جن کے شروع میں مکتوب الیہم کا نام درج نہیں ہے۔ ان خطوط کو "بلا عنوان" کے ذیل میں رکھا گیا ہے۔ مرتب نے بارہ صفحات کا پیش لفظ لکھا ہے۔ سات سو صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ خطوط سرسید احمد خاں کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرتب نے ابتدا میں مختصر طور پر مکتوب الیہم کے ساتھ سرسید کے تعلقات، ان کی سوانح اور اہم اوصاف کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں "مکتوبات سرسید کے ماخذ" کے تحت ماخذات بھی درج کر دیے ہیں۔

۸۔ مکاتیب سرسید احمد خاں: مرتبہ۔ مشتاق حسین

اکتوبر ۱۹۶۰ء کو یونین پرنٹنگ پریس دہلی سے شائع ہوا یہ مجموعہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں مکتوب الیہم کی تعداد اٹھاون اور خطوط کی تعداد ایک سو اکتالیس ہے جو تین سو بیالیس صفحات کو محیط ہے۔ حصہ دوم کی ابتدا دو سو چھتیس صفحے سے ہوتی ہے۔ اس میں مکتوب الیہم کی تعداد بیس ہے اور خطوط کی تعداد چونتیس ہے۔ یہ خطوط مختلف اخبارات، رسائل و کمیاب کتابوں سے جمع کیے گئے ہیں۔ سوائے ایک غیر مطبوعہ خط کے جو عبداللہ مہر علی کے نام ہے۔ خطوط کے اختتام پر ہر مکتوب الیہ کا مختصر تعارف اور خط کی نوعیت کے علاوہ اس کے ماخذ بھی درج کیے ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ خلیل الرحمٰن اعظمی اور تعارف عابد حسین نے لکھا ہے۔

۹۔ خطوط سرسید: مرتبہ۔ نسرین ممتاز بصیر

فروری ۱۹۹۵ء کو نسرین ممتاز بصیر نے مرتب کر کے مطبوعہ لیتھو گرافک پرنٹرس، اچل تالاب،

علی گڑھ سے شائع کرایا۔ اس مجموعے میں شامل خطوط کے متعلق نسرین ممتاز بصیر لکھتی ہیں:

"یہ نادر مجموعہ قلمی صورت میں ہے اور قلمی نسخے کی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا سائز ۱۲×۲، ۱۳×۱۰ ہے۔ اس میں کل ۱۲۲ خطوط ہیں، جس میں سے ۱۱۷ خطوط احمد الدین کے نام ۳، سید حامد کے نام، ایک خط ہمشیرہ صاحب کے نام اور ایک خط احمدی بیگم کے نام ہے۔ اس مجموعے میں سر سید کی تحریر کے علاوہ سید حامد اور دیگر لوگوں کے بھی خطوط موجود ہیں۔ اس کے مرتب حکیم احمد الدین صاحب ہیں جو بقول خود سر سید احمد خاں کے نواسے ہیں۔ اور دلی میں سر سید نے اپنے مکانات وجائیداد کی دیکھ بھال انھیں کے سپرد کر رکھی تھی۔" [۶]

حکیم احمد الدین بعد میں ضلع حصار میں بحیثیت داروغہ آبکاری ملازم ہو گئے اور وہیں انھوں نے یہ مجموعہ ترتیب دیا۔ اس مجموعہ کی ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے:

"میں سر سید مغفور کا نواسہ ہوں اور اسی تعلق سے میرے نام جو شفقت نامہ مغفور کے قلم کے یادگار آئے ہیں ان کی یہ جلد بندی ہے۔" [۷]

نسرین ممتاز بصیر کے مرتب کردہ مجموعے میں جو خطوط شامل ہیں، اس کے چند خطوط "مکاتیب سر سید احمد خاں" مرتبہ مشتاق حسین میں بھی موجود ہیں اور چند مختار الدین آرزو نے "رسالہ فکر و نظر" شمارہ جنوری۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں بھی شائع کرائے ہیں۔

مجموعہ "خطوط سر سید" کے سرورق پر سر سید احمد خاں کے خطوط درج ہیں جو احمد الدین کے نام ہیں۔ اس مجموعے میں سر سید کے صرف ذاتی خطوط ہی شامل ہیں۔ صفحہ نمبر ۵ تا ۳۱ مرتبہ نے مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں مجموعہ میں شامل خطوط کے ماخذ، ان کی نثری خصوصیات اور ان خطوط کی اہمیت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

مقدمہ کے بعد صفحہ نمبر اکتیس پر "التماس" کے عنوان سے احمد الدین کی ایک تحریر درج ہے جس میں سر سید احمد خاں کی شخصی خوبیوں کے علاوہ ان کے انتقال پر تعزیت کا اظہار بھی ہے۔ اس تحریر میں احمد الدین نے جو خطوط درج کیے ہیں۔ ان کے مکتوب الیہ خود احمد الدین ہیں۔ یہ تحریر اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ وہ سر سید احمد خاں کے نواسے تھے۔ یہ تحریر ۱۳ نومبر ۱۸۹۶ء کی ہے،

اس وقت احمد الدین حصار میں مقیم تھے۔

صفحہ بتیس سے چالیس تک تاریخ وار خطوط کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد خطوط کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ خطوط کی تعداد ایک سو بائیس ہے۔ مکتوب الیہم کی تعداد تین ہے۔ مجموعہ میں دو خطوط سید حامد ایک خط احمدی بیگم اور ایک خط ہمشیرہ صاحب کے نام ہے۔ باقی سارے ہی خطوط احمد الدین کے نام ہیں۔ کتاب کے آخر میں جلد کے اوپر سر سید کی تصویر اور سن ولادت اور وفات بھی درج ہے۔

سر سید کے خطوط کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خطوط نگاری کی تاریخ میں موضوع و اسلوب دونوں اعتبار سے اضافہ ہوتا ہے۔ سید عبداللہ نے سر سید کی مکتوب نگاری پر اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سر سید کی ادبی تحریک اور ان کے شخصی رنگ نے خط نگاری نے بھی خاص حد تک اردو خط و کتابت پر اثر ڈالا۔ سر سید جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اسی طرح خط نگاری میں بھی مقصدیت کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے مضامین "تہذیب الاخلاق" میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ صرف کام کی باتیں کہنا چاہتے ہیں اور عبارت آرائی، تکلف اور اطناب بے مقصد سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے خط ان کی عام نثر کے مقابلے میں زیادہ شگفتہ ہیں۔ ان کی عام نثر بالعموم خشکی کا میلان رکھتی ہے لیکن خطوں کا معاملہ مختلف ہے، خطوں میں ظرافت اور خوش طبعی کی آمیزش ہوتی ہے۔ تفصیل کو پسند کرتے ہیں اور خاص خاص موقعوں پر جوش و خروش اور طول کلام کو روا رکھتے ہیں۔" [۸]

آگے لکھتے ہیں:

"مسلم یہ ہے کہ سر سید نے اردو خط نگاری کو مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور مخاطب کے خلوص سے آشنا کیا اور یہی چیز ان کے اکثر رفقا کے خطوں میں پائی جاتی ہے۔" [۹]

غالب کے خطوط کی مقبولیت سے اردو خطوط نگاری میں نئے باب کا اضافہ ہوا اور اس کے

بعد میں مکتوب نگاری عموماً ان کی ہی روش کی تقلید کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن سرسید احمد خاں کا اپنا الگ ہی رنگ و مزاج تھا۔ سرسید احمد خاں نے خط مقصد اور ضرورت کے تحت لکھے۔ اپنے مقصد و مشن سے شدید ذہنی و قلبی وابستگی نے بھی سرسید احمد خاں کے خطوط کو دوسرے لکھنے والوں کے مقابلے میں منفرد بنا دیا ہے۔ بقول علی احمد فاطمی:

> "انیسویں صدی میں غالب کے بعد دوسری بڑی شخصیت سرسید کی ہے جن کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن ان کے زیادہ تر خطوط فلسفہ، پرنسپل، رجسٹرار، سکریٹری، ایڈیٹر یا سرکاری و نیم سرکاری اداروں اور افسروں کو لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے ان میں وہ کیفیت، دلچسپی اور آفرینی ممکن نہیں جو غالب کے خطوں میں ہے۔ پھر غالب، غالب ہیں اور سرسید سرسید۔ ایک شاعر دوسرا ادیب، ایک بیباک اور لاابالی دوسرا اقتدار اور ڈپلومیٹ، ایک فنکار، دوسرا معمار اور بھی بہت کچھ۔ بدلا بدلا سا اس لیے فرق تو ہونا ہی چاہیے۔ لیکن اس فراق اور ایسے خطوط کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ یہ ایک بڑے معمار قوم اور تحریک کے بانی کے خطوط ہیں۔"۹

بے شک سرسید احمد خاں قوم کے معمار اور ایک تحریک کے بانی ہیں اس لیے ان کے خطوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ غالب نے اپنے خطوں میں رنگین مرصع زبان کے بجائے سلیس اور بے ساختہ عبارت لکھی اور سہل ممتنع کی داغ بیل ڈالی۔ غالب کے خطوں کے بارے میں ثریا حسین رقم طراز ہیں:

> "یہ خطوط نہ صرف ان کی ظاہری و باطنی زندگی کے ترجمان تھے بلکہ ایسا مجلّٰی و مصفا آئینہ جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا اور دل کی دھڑکنیں سن سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا اسلوب اتنا قوی نہیں تھا کہ عمیق، دقیق اور علمی و ادبی موضوعات کا بار گراں اٹھا سکتا۔"۱۰

سرسید احمد خاں کے خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے:

> "سرسید کے خطوط کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کی حیثیت ذاتی خطوط کی نہیں

> بلکہ "علی گڑھ تحریک اور اس زمانے کے دیگر قومی و تمدنی مسائل سے متعلق ہیں۔"۱۱

موضوعی اعتبار سے خطوط کے اوراق کی سیر کے بعد ہی سرسید احمد خاں کے خطوط کو سمجھا جا سکتا ہے۔ رسالہ فکر و نظر کے شمارہ ستمبر-اکتوبر ۱۹۶۰ء میں مختار احمد آرزو نے سرسید احمد خاں کے چند ذاتی نوعیت کے خطوط شائع کیے اور نسرین ممتاز بصیر کا مرتب کردہ صرف ذاتی خطوط کا مجموعہ "خطوط سرسید" کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے نشیب و فراز کو سمجھنے کے ساتھ ان کے خطوط سے نجی اور گھریلو زندگی کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے احمد الدین کو خط لکھتے وقت حفظ مراتب کا خیال رکھا ہے اور شعوری طور پر مکتوب الیہ کو ہمراز یا ہمدم نہیں بنایا ہے بلکہ نواسہ ہونے کے ناطے بہت سے نجی معاملات اور رشتہ داروں کی بعض احتیاطیں بھی دانستہ طور پر عیاں ہو گئی ہیں۔

عام طور سے خانگی خطوط کی قدر اس لیے بھی کی جاتی ہے کہ ان میں مکتوب نگار اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بے تکلفی میں ایسی آرا اور خیالات کا اظہار کر دیتا ہے کہ جن کا اعلانیہ کہنا یا لکھنا مصلحت کے خلاف سمجھا جاتا ہے لیکن سرسید احمد خاں کے خطوط اس خوبی یا عیب سے پاک ہیں۔ سرسید احمد خاں کے نزدیک مصلحت یا پالیسی کو کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ جو بات ان کے دل میں تھی وہی ان کی زبان و قلم پر تھی۔ خطوط سرسید احمد خاں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ تقریباً تمام خطوں میں ان کے تیور صاف نظر آتے ہیں۔ وہ بحث کی باتیں کرتے ہیں اور بے تکلف دوستوں سے شرافت اور شوخی سے بھی نہیں چوکتے، مصیبت میں ہمدردی کرتے ہیں اور خوشی سے خوش ہوتے ہیں، لیکن قوم کی بدحالی کے غم میں ان کی آنکھ نم نظر آتی ہے۔

سرسید احمد خاں کے خطوط کے ایک ایک لفظ سے صداقت اور خلوص ٹپکتا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے ان کی طبیعت، سیرت اور اخلاق کا دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے سرسید احمد خاں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے مزاج، افکار و خیالات سے بخوبی واقف تھے۔ مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں سرسید احمد خاں کی مکمل

تصویر کھینچی ہے لیکن سرسید احمد خاں نے اپنے خطوط میں اپنی شخصیت کی تصویر خود اپنے ہاتھوں سے بنائی وہ اس طرح ہے، بقول محمد عزیز:

> "ایک تصویر اور بھی ہے جو خود سرسید نے اضطراری طور پر اپنے ہاتھ سے کھینچی تھی۔ اس میں وہ جزئیات تو نہیں ہیں جو حالی نے پیش کیں ہیں مگر وہ تمام خدوخال موجود ہیں جن سے صاحب تصویر کا اصل چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ تصویر ہمیں ان کے خطوط میں ملتی ہے۔ شاید یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہو کہ حیات جاوید کی غیر موجودگی میں بھی یہ خطوط ان کی سیرت کی اہم خصوصیات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔" [۱۲]

سرسید احمد خاں کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبالغہ آرائی مقفّیٰ انداز بیان کے بجائے اثر آفرینی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی مکتوباتی نثر میں موضوعات کے ذیل میں سنجیدہ اور مدلل و پروقار لہجے کے ساتھ ساتھ شگفتگی، روانی اور خوش طبعی کے عناصر بھی موجود ہیں۔ غرض یہ کہ خطوط میں ان کے اخلاق، سیرت اور شخصیت کے تمام پہلو صاف نظر آتے ہیں۔ بقول عبدالحق:

> "ان کی پرخلوص اور دلی محبت کا اندازہ کرنا ہو تو نواب محسن الملک اور مولوی زین العابدین خاں مرحوم کے نام کے خط پڑھیے۔ ان کا استقلال اور ضد اور اس کے ساتھ صاف باطنی دیکھنی ہو تو نواب وقار الملک کے نام کے خط ملاحظہ کیجیے۔ ان کی خود داری ثبات اور غیرت مندی دیکھنی ہو تو وہ خطوط مطالعہ فرمائیں جو لندن سے بیٹھ کر لکھے ہیں۔ ان کی قدر دانی کا حال جاننا ہو تو نواب عماد الملک بہادر کے نام خط دیکھیے۔ چھوٹوں پر شفقت دیکھنی ہو تو عنایت اللہ صاحب کے نام کے خط پڑھیے۔" [۱۳]

سرسید احمد خاں نے خطوط کی ابتدا عام طور سے مختصر اور سادہ القاب و آداب سے کی ہے۔ القاب و آداب میں انھوں نے ادبیت یا انشا پردازی کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ مختصر القاب سے مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے کے بعد عرض مدعا پر آجاتے ہیں۔ بقول ثریا حسین:

> "ان کے خطوں میں سادگی و سلاست، جامعیت اور اختصار ہے۔ القاب و

> آداب کا کوئی خاص اہتمام نہیں بلکہ سادہ اور برمحل القاب کی وجہ سے ان کے یہاں یگانگت اور گرم جوشی کا احساس ہوتا ہے اور مخاطب سے ان کی وابستگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔" [۱۴]

سرسید احمد خاں نے خطوط ایک خاص مقصد، حقیقت بیان، پیغام رسانی اور اپنی بات کی پرتاثیر وضاحت کے لیے تحریر کیے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں بے ساختہ، برجستہ اور بے تکلف اظہار کے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے خطوط میں مکرمی، مخدومی، محترمی، بھائی سراج الدین شفیق من، مکرمی زید بو جیسے القاب استعمال کیے ہیں جن میں اختصار کو خاص طور سے ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں سرسید احمد خاں نے دوستوں کو نہایت بے تکلفانہ انداز سے بھی مخاطب کیا ہے۔ مثلاً واہ واہ جناب محسن الملک واہ واہ، جناب مخدوم و مکرم من باعث افتخار من و قوم من نواب عماد الملک بہادر، جناب مولانا مخدوم مکرم بندی، عزیزی و مکرمی نواب وقار الملک بہادر وغیرہ۔ خطوط میں القاب و آداب کے فوراً بعد گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ خطوط کے انداز تخاطب میں مکتوب الیہ سے قربت و اپنائیت کے حدود، تعلقات کی نوعیت، حالات اور موضوع گفتگو کو بہت دخل ہے اور حفظ مراتب کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔

سرسید احمد خاں کبھی کبھی کسی خاص موڈ اور کیفیت کے زیر اثر خطوط میں عبارت آرائی کے ساتھ صنائع لفظی، معنوی اور تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں حالانکہ ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہے کیونکہ سرسید احمد خاں کا یہ مزاج نہ تھا اور یہ اسلوب ان کے مطابق بھی نہیں تھا۔ ایک خط میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

> "جناب مخدوم و مکرم بندہ نواز! آپ کا عنایت نامہ بلا تاریخ پایا۔ اسی وقت "تو خوش کرد وقت ما خوش کردی" جس قدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی ہے بیان نہیں کر سکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی۔ جس محبت سے لکھا تھا وہ اثر ان لفظوں میں موجود تھا اور آنکھ سے برابر دل میں پہنچتا تھا جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے ان کو پڑھ کر ایسا محو حیرت ہوا کہ گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں اور اس

کیفیت سے وحدت وجود کے مسئلے کا عقدہ حل ہوتا تھا

میان احمد و احمدی نہ بیچ ہست حجاب
تو خود حجاب خودی احمد از میان برخیز

بے تصنع آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کے شکستہ رقم نے اور بھی زیادہ لطف دیا۔ دو تین دفعہ پڑھنا پڑا۔ ایک دفعہ کے پڑھنے میں جو لطف رہ گیا تھا دوسری دفعہ میں نکلا اور بہت زیادہ مزہ دیا۔" (۱۵)

سرسید احمد خاں کا مقصد مراسلہ کو مکالمہ بنانا یا نرالا طرز تحریر ایجاد کرنا نہیں تھا۔ بلکہ وہ خطوط کو خالص پیغام رسانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس لیے وہ صرف مدعا کی ترسیل کے لیے انداز بیان کا سہارا لیے بغیر اپنی منشا کا اظہار کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نثر میں واقعیت، صداقت اور سنجیدگی ہے۔ خطوط چونکہ ترسیل خیال کے لیے لکھے گئے ہیں اس میں کہیں کہیں جملوں کی ترتیب اور قواعد سے بے پروائی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ خط لکھتے وقت جو خیال جس طرح ادا ہو گیا اسی طرح لکھ دیا اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس بے تکلفی اور بے ساختہ پن میں بعض وقت عجیب فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔ جس طرح ان کی طبیعت میں تکلف اور تصنع کو دخل نہیں تھا اسی طرح ان کی عبارت بھی اس ہنر نما عیب سے خالی نہیں ہے۔ سرسید احمد خاں میں مخالفتوں اور اعتراضات کو برداشت کرنے کی قوت تھی۔ مولوی سراج الدین احمد نے اپنے اخبار "سرمور گزٹ" میں ایک تحریر کا جواب لکھ دیا تو اسے پڑھ کر سرسید احمد خاں نے انھیں ایک خط میں لکھا:

"بلاشبہ میں آپ کی محبت کا جو آپ کو مجھ سے ہے، ممنون و احسان مند ہوں اور آپ کو اس تحریر کی نسبت جو اس پرچے میں ہے بعد جوش محبت معذور سمجھتا ہوں مگر جانے دو جس کا دل چاہے کہے، ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اگر ہمارے برا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے، خوش کر لینے دو۔ تم بھی ان کے برا کہنے سے خوش ہو کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔" (۱۶)

سرسید احمد خاں کے خطوط میں کہیں کہیں انگریزی الفاظ کے ساتھ ساتھ عام بول چال کی زبان بھی ملتی ہے۔ بعض محاورات، روزمرہ الفاظ اور ضرب الامثال کا استعمال ان کی تحریروں کا

امتیازی وصف کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً "میں نے خیال کیا تھا، جب ولایت سے پھر آؤں گا، میں نے یہاں بڑی غل مچائی وغیرہ" سرسید احمد خاں نے محاورات، ضرب الامثال اور روزمرہ کے علاوہ انوکھی تراکیب بھی استعمال کی ہیں۔ بہت سی لسانی اور املائی خصوصیات کو کچھ مرتبین نے بدل دیا ہے۔ کچھ خصوصیات ویسے ہی موجود ہیں۔ مثلاً کر کر کا استعمال جاویں، کھاویں، لاویں وغیرہ۔

خطوط سرسید احمد خاں میں بعض فقرے اور جملے موجودہ انداز تحریر سے جداگانہ ملتے ہیں۔ مثلاً ان کے خطوط میں "چھاپہ ہوئی ہے" جب کہ آج کے دور میں "چھپی ہے" لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح "اجرت چھاپہ کا" - "چھپائی کی اجرت" - "چھاپہ ہو دیں گے" - "چھاپے جائیں گے"

اس، آن، اُتار، وغیرہ کے اضافے کے ساتھ ملتے ہیں۔ مثلاً: "اوتارنا" - "اُتارنا"

شراکت بامعنی شرکت، دونوں لفظ اصلاً بالکل صحیح ہیں مگر آج کل شرکت زیادہ مستعمل اور مقبول ہے۔ شکر بامعنی شکریہ، شکر اصلاً صحیح ہے اور شکریہ رواجاً صحیح ہے۔ سرسید نے اصل کو رواج پر ترجیح دی ہے۔ جانچنا اور پرتالنا بامعنی جانچ پرتال۔ لفظوں کو ملا کر لکھا ہے کیونکہ اس دور میں لفظوں کو ملا کر لکھنا آج کل کی طرح معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ نون غنہ کی جگہ نون نقطہ دار ہے۔ نقطے، تشدید، مد، علامت تنوین کا التزام نہیں ہوا ہے۔

اسی طرح سرسید احمد خاں نے انگریزی الفاظ بھی دوسرے انداز سے تحریر کیے ہیں: رپورٹ کو رپوٹ، لائف کو لیف، پمفلٹ کو پمفلت، سیکریٹری کو سکریتری، گورنمنٹ کو گورنمنت وغیرہ۔

انگریزی الفاظ اور عربی و فارسی محاورات اور جملوں کے علاوہ اکثر فارسی اور انگریزی لفظوں کے درمیان اضافت لگا کر بات کو بیان کرتے ہیں۔ مثلاً خلاف کانشنس یہ ترکیب مہمل کی مثال ہے۔ سرسید احمد خاں کے مخالفین کی کمی نہیں تھی مگر انھوں نے ہر مخالفت کو برداشت کرتے ہوئے مخالفین کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ لیکن ان کے مخالفین ہر کام میں حائل رہے اور نئے الزام تراشتے رہے۔ سرسید احمد خاں نے جب انگلستان کا سفر کیا تو لوگوں نے سیکڑوں افسانے تراشے۔ مثلاً "سرسید قوم کے پیسے سے تفریح کو چل پڑے۔" مگر اس سفر کے دو مقصد تھے ایک تو یہ کہ اس زمانے میں جب سر ولیم کی کتاب "لائف آف محمدؐ" چھپ کر ہندوستان پہنچی تو اس میں الزام تراشی اور غلط بہتان تھے جسے پڑھ کر مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچی۔ سرسید احمد خاں اس

کتاب کا جواب لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے برٹش میوزیم، انڈیا آفس کے کتب خانوں سے وہ کتابیں فراہم کرنا چاہتے تھے جو ولیم میور کے کتاب کا جواب لکھنے کے لیے ضروری تھیں کیونکہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے برباد ہو چکے تھے۔

سر سید احمد خاں ۱۸۶۹ء میں لندن پہنچتے ہی کام میں مصروف ہو گئے۔ وہاں سے نواب محسن الملک کے نام جو بھی خطوط لکھے ان میں سے اکثر خطوط میں خطبات احمدیہ کا ذکر ہے۔ جسے میور کی کتاب کے جواب کے لیے تیار کر رہے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ان دنوں میرے دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں حضرتؐ کے حال میں لکھی ہے۔ اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا ہے اور ان کی ناانصافیوں اور تعصبات کو دیکھ کر دل کباب ہو گیا ہے اور مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلعم کی سیرت پر جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔"[12]

سر سید احمد خاں کو اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک انگلستان جا کر جواب میں اپنی کتاب "خطبات احمدیہ" مرتب نہ کر لی۔ اس کی تیاری میں ان کی جانفشانی اور دل سوزی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ ان کے خطوط کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ سر سید احمد خاں اپنی مخالفتوں کا چالیس سال تک نہایت صبر و تحمل سے مقابلہ کرتے رہے لیکن کہیں اپنے خطوں میں غم و غصہ کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کے بعض مخلص دوست ان کی حمایت میں مضامین لکھ کر شائع کر دیا کرتے تھے۔ سر سید ان کو روکتے تھے مثلاً ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"لوگوں نے مجھ کو اخبار میں جو برا بھلا لکھا اس سے آپ کو غصہ آ گیا۔ معلوم نہیں آپ نے آرٹیکل میں کیا لکھا ہوگا۔ مگر مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے؟ میں تو ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آئے جو لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں۔"[13]

سر سید کے مزاج میں صبر و تحمل اور استقلال حد سے زیادہ تھا۔ وہ اپنی مخالفوں سے خوف زدہ ہو کر ذرہ برابر نہ گھبرائے۔ قوم کی مخالفت ان کے مزاج میں تیزی پیدا کرنے کے بجائے ان کے جوش و عمل کو بڑھا دیتی تھی۔ اپنے دوست سراج الدین احمد صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہم کو خدا نے دنیا میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں، برا کرنے والوں کی برائی سے ہم کو کیا کام۔ ہم کو اپنا دل اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیے۔ مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا تو اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے جو لوگ برا کہنے والے ہیں۔ ان کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیے۔ اگر وہ برائی ہم میں ہے تو اس کو دور کرنے میں کوشش لازم ہے۔ اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ برائی ہم میں نہیں ہے۔"[14]

سر سید احمد خاں کے خطوط کی روشنی میں سر سید کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قوم کے لیے کیسا درد تھا کیسا جذبہ تھا۔ قوم کی خدمت کا جذبہ اس قدر تھا کہ لندن کی طلسماتی فضاؤں میں رہ کر بھی اپنے ملک کو نہ بھلا سکے۔ خطوط کے مطالعے سے قوم کا درد اور دکھے دل کی کراہ سنائی دیتی ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"قوم کا دکھڑا ہر جگہ روتے ہیں۔ یہ خیال ان کے دل سے کسی دن جدا نہیں ہوتا۔ اس کی حالت تپ کہنہ کی سی ہو گئی ہے جو ہڈیوں تک میں رچ گئی ہے۔"[15]

حالانکہ سر سید نے خطوط صرف مقصد یا ضرورت کے تحت لکھے ہیں لیکن جو خیال، جو بات ہر وقت سر سید کے ذہن پر طاری رہتی تھی اس کا ذکر فطرتاً اکثر و بیشتر خطوط میں کر دیتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے قوم کی بھلائی کا تذکرہ اپنے مکتوب الیہم سے جگہ جگہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین، تقریروں اور گفتگو میں ملت کی بھلائی کے لیے دردمندانہ انداز سے اظہار کیا ہے اس لیے خط و کتابت میں بھی یہ خیال آ جانا ایک فطری امر ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ مسلمان ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا

ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور گھر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت کم فاصلہ باقی ہے۔"[41]

سرسید کے سفرِ انگلستان کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک کالج قائم کرنے سے پہلے وہاں کے نظامِ تعلیم و تربیت کا خود مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ سرسید نے انگلستان میں جو کچھ دیکھا اسی انداز میں اپنے خطوط میں پیش کر دیا۔ اس سفر کو انھوں نے اپنے علمی مطالعے کا بھی ذریعہ بنایا۔ اس کی تفصیل انھوں نے خطوط میں قلم بند کی ہے۔ اجنبی ماحول، غیر ملکی احباب اور مغربی ادب ان سب نے انھیں متاثر کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک اور قوم کی حماقت اور بے جا تعصب و تنزل موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ ہوگیا ہے۔"[42]

سرسید احمد خاں لندن یونیورسٹی کو بالکل آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرح بنانا چاہتے تھے۔ سرسید احمد خاں یوروپ کی چیزیں، اہم واقعات اور مروجہ احوال اور اپنے منصوبوں سے متعلق باتیں اپنے احباب کو ارسال کرتے رہتے تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ محسن الملک کا نام لیا جاسکتا ہے۔ محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے نمونے پر کمیٹی کی خاص طور پر توجہ اور کوشش ہوگی کہ وہ مدرسۃ العلوم کے طلبا میں بھی وہی معیارِ تعلیم قائم کرلے جو ان انگریزی یونیورسٹیوں میں ہے۔ اگر کوئی نمایاں فرق ہو تو صرف اتنا کہ جہاں انگریزی یونیورسٹیوں میں عیسائی عقائد کی تعلیم ہوتی ہے۔ وہاں مدرسۃ العلوم میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جائے۔"[43]

سرسید احمد خاں کی شخصیت کے نمایاں اوصاف سادگی، معصومیت، خلوص، مستقل مزاجی اور محنت و ایثار کے ساتھ ان کے خطوط میں ان کے احباب کی جھلک بھی ملتی ہے اور سرسید احمد خاں کے بے تکلف اندازِ تخاطب کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ محمد عنایت اللہ کو لکھتے ہیں:

"تمہارا خط پہنچا۔ اس میں جو تم نے یہ فقرہ لکھا تھا کہ میں آج کل بہت مصروف

رہتا ہوں۔ اس سے مجھے بہت زیادہ خوشی اس خیال سے ہوئی کہ تمہاری طبیعت بہت اچھی ہے۔ اب ضرور تمہاری والدہ صاحبہ تمہارا بیاہ بھی کر دیں گی اور تم کو حیدرآباد بھی جانے کی اجازت دیں گی۔ لیکن جب بیاہ کا پیغام ہو تو کہہ دینا پہلے دکھادو، بے دیکھے نہیں کرسکتا۔"[44]

سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک جو علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہے۔ اس سے متعلق حالات پر متعدد خطوط ہیں جن میں تعلیم کے علاوہ سرسید احمد خاں کی اہلِ اسلام کی عام حالت سے خصوصی دلچسپی کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے دل پر اثر ہوتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ خطوط نہیں بلکہ لکھنے والے کے دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ خطوط سے ان کے جوشِ ایمان، حبِّ اسلام اور مذہبی عقائد کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایک خط میں سید علی حسن کے نام خط میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"نواب محسن الملک، مولوی مہدی علی خاں، غالباً اسبابِ تنزلِ مسلمانان پر لکچر دیں گے۔ ہمارے کالج کے ایک نہایت نیک اور عالم پروفیسر انگریز مسٹر آرنلڈ 'چین' اور 'جاوہ' میں اسلام کی ترقی اور وہاں مسلمانوں کی حالت پر لکچر دیں گے۔ وہ یہ ثابت کریں گے کہ بغیر کسی زورِ حکومت کے وہاں اسلام پھیلا ہے۔"[45]

مذہبی موضوعات پر سرسید احمد خاں کی متنازعہ تحریرات کے تعلق سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ساتھ علماء نے کشادہ قلبی اور رواداری میں احتیاط برتی، کیونکہ مشنری اسکولوں اور سرکاری کالجوں کے متعلق عام مسلمان بھی جانتے تھے کہ یہ عیسائی اپنے خاص مقصد اور مذہب کی تبلیغ کے لیے چلا رہے ہیں۔ جب سرسید احمد خاں کو یہ یقین ہوگیا کہ کالج کی مخالفت کی وجہ مذہبی موضوعات پر ان کے افکار اور دینی تحقیقات کے خلاف احتجاج ہے تو انھوں نے اپنے ذاتی مسائل مذہبی عقائد اور کالج کی تعلیم و ترقی کے معاملات کو الگ الگ رکھنے کی اپیل کی ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد اس لیے ڈالی ہے کہ مسلمان علومِ دینی اور دنیاوی اور مختلف زبانوں اور نئے نئے فنون اور ہنروں سے جو اس زمانے میں کارآمد

ہوں، واقف ہوں۔ علوم دینی کی نسبت مجھے کچھ پروا نہیں ہے کہ حنفی اصول پر پڑھایا جائے یا شافعی اصول پر یا اخباری اور اصول پر یا معتزلی و وہابی اصول پر یہ لوگ جائیں جن کے ہاتھ میں اس علوم کی تعلیم کا انتظام ہوگا۔" ۴۶

ان کے بعض عقاید اور خیالات سے اختلاف کرنا آسان ہے لیکن انھیں مذہب اسلام اور بانی اسلام سے جو محبت تھی، وہ ان کے اکثر خطوط سے ظاہر ہوتی ہے۔ نواب وقار الملک کا کسی افسر سے سابقہ پڑا جو کچہری کے اوقات میں نماز پڑھنے سے تعرض کرتا تھا۔ سرسید کو بھی اس کی اطلاع ملی انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے، جس طرح خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری نظر میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا حق میں ذرا نا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔" ۴۷

سرسید احمد خاں نے مختلف عنوانات پر اپنے افکار و نظریات کا اظہار کیا ہے۔ مختلف افراد کو اپنے مکتوبات میں مخاطب کیا ہے۔ کئی مسائل پر بے باک اور بے لاگ اظہار خیال کیا ہے۔ مکتوبات کے مطالعے سے جہاں سرسید احمد خاں کی بے خوفی، بے باکی، فکری گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں حمیت و غیرت کا بھی اظہار ہوتا۔ وہ جسے حق سمجھتے ہیں، اس کا برملا اعلان و اعتراف کرتے ہیں ایک خط میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے "والد" کے متعلق خیال فرماتے ہیں:

"ولادت حضرت مسیح کی بابت سب کچھ لکھ چکا ہوں میرے نزدیک قرآن مجید سے ان کا بے باپ ہونا ثابت نہیں اور... عیسائی و یہودی سب حضرت مسیح کو یوسف کا پسر جائز سمجھتے تھے۔ اس کی سندیں بھی نکال لی ہیں۔ پس میں نے بھی لکھا ہے کہ وہ حسب فطرت بشری پیدا ہوئے تھے اور یوسف ان کے والد تھے۔" ۴۸

دوسرے خط میں مولوی سید ممتاز علی کو لکھتے ہیں:

"ابن مریم (کے) مشہور ہونے کا سبب نہایت عمدہ صحیح مطابق واقعہ تحریر ہوا ہے۔ مجھ کو یہ خیال نہ تھا کہ یوسف کا انتقال ہو چکا ہے۔" ۴۹

سرسید احمد خاں کے مزاج میں جو شوخی اور طنز و ظرافت کا مادہ تھا اس کی متعدد مثالیں ان کے خطوط میں ملتی ہیں۔ سراج الدین صاحب کو لکھتے ہیں:

"جانے دو جس کا جو دل چاہے کہے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اگر ہمارے برا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے، خوش کر لینے دو۔ تم بھی ان کے برا کہنے پر خوش ہو۔ کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں، ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔" ۵۰

بغیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کے ذکر میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے تنگ آ گئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے۔ جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے۔ ایسا پیچھے پڑا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے نہ زمین پر چھوڑے۔ نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو الگ ہو۔ نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے اپنے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈرتا۔ میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں۔ نہ روایت شاذہ سے... والی مصر کے ساتھ علما مصر بھی تھے۔ انگریزوں کے ساتھ بغیر ذبح کیے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے۔" ۵۱

سرسید احمد خاں کے لیکچرز کے علاوہ ان کے خطوط کے مطالعہ سے بعض خطوط میں تعلیم نسواں کے موضوع پر بے لاگ تبصرہ ملتا ہے۔ لیکن تعلیم نسواں کے متعلق ان کا بیان بہت واضح طور پر نہیں ملتا۔ کیونکہ اس وقت کے زیر بحث آنے والے مسئلوں میں سے اس مسئلہ پر لکھتے ہوئے سرسید احمد خاں نے اکثر اجتناب کیا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں ان کے خواب کی تعبیر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے شاگرد شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج قائم کیا

جو "عبداللہ کالج" کے نام سے موسوم ہے۔

اردو کی حمایت میں سرسید احمد خاں نے کبھی کوتاہی نہیں برتی جب کبھی اردو پر آنچ آتی دیکھی تو اس کی حمایت کے لیے فوراً کمربستہ ہو گئے۔ اردو زبان سے سرسید کی محبت اور اس کی حمایت کا جذبہ بھی ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ خاص طور سے اردو کی حمایت کا جذبہ ان خطوں سے ظاہر ہوتا ہے جو بابو سرودا پرشاد سنڈل کے نام تحریر کیے ہیں۔

۱۸۶۷ء میں بعض ہندو اصحاب نے تمام سرکاری دفتروں، عدالتوں اور مدرسوں سے اردو زبان اور اردو رسم الخط کو خارج کرنے اور اس کے بجائے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط رائج کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ بابو سرودا پرشاد سنڈل اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ سرسید احمد خاں نے ان کو لکھا:

"ہندی یعنی موجود مخلوط زبان جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے، اضلاع شمال و مغرب کی عدالتوں میں رائج ہونی مناسب ہے، یا نہیں۔ اور یہ بھی آپ نے لکھا ہے کہ میں اپنی رائے کو مدلل لکھوں۔" ۴۲

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک اضلاع شمال و مغرب و صوبہ بہار کی عدالتوں میں وہی زبان رائج ہونی چاہیے جس کو آپ ہندی یعنی موجودہ مخلوط زبان کہتے ہیں۔ لیکن میں اس کو اردو کہنا پسند کرتا ہوں۔" ۴۳

ایک دوسرے خط میں سرودا پرشاد سنڈل کو لکھتے ہیں:

"آپ اپنی پہلی چٹھی میں یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ ہندی زبان سے آپ کی مراد اضلاع شمال و مغرب کی موجودہ مخلوط زبان ہے بس یہ مخلوط زبان سوائے اردو کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"جب آپ کے نزدیک ہندی زبان ان اضلاع کی موجودہ مخلوط زبان ہے تو پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس میں اور اردو میں کیا فرق ہے۔ بس جب ان دونوں

زبانوں میں امتیاز نہیں تو پھر تبدیلی کے کیا معنی اور ایک زبان کے بجائے دوسری زبان کیسے رائج ہوگی۔" ۴۴

سرسید احمد خاں کے خطوط کے مطالعے سے ان کے شعر و ادب سے متعلق تصورات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اردو شعرا کو مشورہ دیا کہ ہجر و وصال کی جھوٹی کہانیاں سنانے کے بجائے نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہوں۔ لاہور میں محمد حسین آزاد نے نظم جدید کی فروغ کے لیے 'انجمن پنجاب' کی داغ بیل ڈالی تو سرسید نے اسے اپنے خوابوں کی تعبیر بتایا۔ محمد حسین آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے بر آئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔"

اسی خط میں محمد حسین آزاد کو ان کی مثنوی 'خواب امن' پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھا کہ:

"درحقیقت شاعری اور سخن وری کی داد دی ہے اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضروری ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جائیں۔" ۴۵

مولانا حالی کا "مسدس مد و جزر اسلام" کو سرسید احمد خاں نے نئے طرز کی شاعری کا عمدہ نمونہ اور اپنی نجات کا ذریعہ تصور کیا۔ مسدس پڑھنے کے بعد جو خط انھوں نے مولانا حالی کو لکھا وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اس سے ان کے دل کی کیفیت اور جوش کا حال معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایہ ناز شعر و شاعری ہے بالکل مبرا ہے کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں

ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نظم میں ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انھیں الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ خدا پوچھے گا تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔"[۹۶]

سرسید احمد خاں اپنے زمانے میں آزادی رائے کے سب سے بڑے حامی و مبلغ تھے۔" بے خوف اور بے باک صحافت کی بنیاد انھوں نے ہی ڈالی۔" غالباً انھیں آزادی رائے اس قدر عزیز تھی کہ اس کے لیے وہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ لندن سے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے سیکریٹری راجہ جے کشن داس کو ایک خط میں تاکید کرتے ہیں:

"اے مائی ڈیر راجہ اپنی سوسائٹی اور اخبار کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت جانے دینا۔ سررشتہ تعلیم کی بھلائی اور برائی پر تمام ہندوستان کی زندگی اور موت منحصر ہے۔ ہمیشہ نہایت غور کی مگر منصفانہ نگاہ سے اس کو دیکھتے رہنا۔ صرف سچائی اور عوام کی بھلائی کو اپنا دوست جاننا۔"[۹۸]

اکثر خطوط میں مخالفوں پر صبر و تحمل اور عفو و درگزر کا اظہار ملتا ہے مگر کہیں کہیں مخالفوں کا جواب بھی تحریر فرماتے ہیں اور کئی خطوط کا لہجہ تند و تیز ہے۔

مولوی سمیع اللہ خاں ابتدا میں سرسید احمد خاں کے حامیوں میں تھے اور ان دونوں بزرگوں میں بہت محبت تھی۔ لیکن بعض وجوہ سے مولوی سمیع اللہ خاں سرسید احمد خاں سے الگ ہو گئے تھے اور اختلاف رائے نے مخالفت کی صورت اختیار کر لی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ سرسید احمد خاں کو "خطبات احمدیہ" چھپوانے کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی، نواب محسن الملک نے سرسید احمد خاں کو چندہ جمع کرنے کے لیے مولوی سمیع اللہ خاں کو بھی شریک کرنے کے لیے لکھا تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"مولوی س۔ خ کو اب بھی اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا۔ مگر وہ ملال جو کہ میرے دل میں ہوا۔ وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ گل جاوے وہ زبان جو وہ کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ پس آپ نے جو لکھا ہے کہ میں مولوی سمیع اللہ خاں کو ضرور خط شرکت لکھوں تو میں کیا لکھوں؟"[۹۷]

سرسید احمد خاں کے کردار سے متعلق شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"اگر سرسید احمد خاں کی "کھلی کھری" عادت کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیے، جن میں نہایت بے تکلفی سے اور بعض اوقات بڑے کڑے طریقے سے اس "ٹیم چڑھے وہابی" نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ ایک جگہ وقار الملک کو لکھتے ہیں: "آپ کی عادت ہمیشہ طول نویسی ہے۔" پھر انھیں کو کہتے ہیں: "میں اس بات کو ہرگز دل میں نہیں رکھنا چاہتا کہ بے شک آپ نے نہایت نامناسب طریقہ اختیار کیا۔ (چاہے) اس کا کوئی سبب ہو۔" نواب وقار الملک کو ہی لکھتے ہیں: "جن امور کو آپ تصور کرتے ہیں کہ قومی کالج کے لیے مبارک فال سمجھتے ہیں پس اس کا کوئی علاج نہیں۔ اور یہ یقین کرنا چاہیے کہ خدا کو جو منظور ہوگا، وہ ہوگا۔" ایک خط میں نواب محسن الملک کی نسبت لکھا ہے: "ان کا ایک خط میرے پاس بھی آیا ہے جن میں لفظ ہیں مگر ان میں اثر نہیں۔"

[۹۹]

سرسید احمد خاں کی زندگی میں پیش آنے والے بیشتر غیر معمولی واقعات ان کے خطوط کے لب و لہجہ پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی ذات سے متعلق ہر سانحہ خطوط کے انداز بیان پر غیر معمولی نقش بھی چھوڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کالج کے انتظام کے لیے جب ٹرسٹیوں کی کمیٹی قائم کرنے کی تجویز ہوئی تو سرسید احمد خاں نے سید محمود کو اپنا جانشین اور اس کمیٹی کا جوائنٹ سکریٹری مقرر کرنا چاہا۔ مولوی سمیع اللہ خاں اور بعض دیگر اصحاب نے ان کی مخالفت کی جن میں وقار

183 - 182

ملک بھی شامل تھے۔ وہ سرسید احمد خاں کے گہرے دوست تھے لیکن ان کی دوستی کی پروا نہ کی اس کا انداز وبھی خطوط کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ وقار الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اول مجھ کو یہ بات صاف صاف کہہ دینی چاہیے کہ جانشینی کا معاملہ اب اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس میں کچھ ترمیم ہو سکے۔ اب کسی طرح ملتوی نہیں رہ سکتا یا ادھر ہو گا یا ادھر اس میں فکر لا حاصل ہے۔ اس سے اختلاف کریں تو بلاشبہ افسوس ہو گا مگر آپ کی نسبت اور کوئی خیال بجز اس کے کہ آپ حق کی رائے تھی میں ہرگز نہیں کروں گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ جب ووٹ گنے جائیں گے آپ کا ووٹ بھی مخالف جانب رکھ دیا جائے گا۔ ذرا مجھ کو یہ بات سمجھا دو کہ سید محمود کا تقرر خواہ ضروری تھا یا نہ تھا یا قبل از وقت تھا۔ مولوی ا۔ ح کو اس قدر شورش کرنے کی کیا وجہ ہے؟" [41]

وقار الملک کو ہی دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ لا اخبار او نے چھاپا ہے کہ مولوی مشتاق حسین سید محمود کے تقرر کے برخلاف نہیں۔ کچھ آپ چاہتے ہیں قطع نظر اس کے کہ کالج کی بہتری اس میں نہیں ہے۔ عداوت اور پوری عداوت زیادہ کرنے والے ہیں اور ایک دن سن لیں گے کہ کیا ہوا۔" [42]

۱۸۹۵ء میں غبن کے مسئلہ پر سرسید احمد خاں کی پریشانیاں اور ذہنی خلفشار کا عکس اس دور کے خطوط میں ملتا ہے۔ غبن سے متعلق ایک خط میں وقار الملک سے اس طرح شکایت کرتے ہیں جس سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے:

"مدرسہ پر اس غبن کا ایسا سخت واقعہ ہوا ہے اور اس نے مجھ کو ایسا سخت صدمہ دیا ہے کہ جس کا بیان ہو نہیں سکتا۔ مجھ کو سب سے زیادہ تم سے توقع تھی کہ تم آتے اور ہمدردی کرتے۔ نہ صرف مدرسہ کے ساتھ بلکہ میرے ساتھ نہ تم آئے نہ کوئی دلاسا بات پوچھی اگرچہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اس کا علاج کچھ نہ تھا۔ مگر تم سے اس رنج میں شریک ہونے کی توقع تھی۔ اس بنا پر میں نے لکھا کہ آپ کو مدرسہ سے

ہمدردی مثل سابق نہیں رہی۔" [43]

خطوط کے تاریخ وار مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں کے نام تقریباً روز خطوط آتے تھے اور وہ ان کا جواب خود ہی لکھا کرتے تھے۔ بہت کم خط ایسے ہیں جو انھوں نے دوسروں سے لکھوائے ہیں۔ ان میں علی گڑھ تحریک کے علاوہ بھی ہر قسم کے موضوعات کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ انھیں اپنے تمام دوستوں، احباب، رشتہ داروں کھانے پینے سے لے کر شادی بیاہ تک کا ذکر سرسید احمد خاں کے خطوط میں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے مدرسہ کے طالب علموں کی پڑھائی کی فکر بھی کرتے تھے۔ ایک خط میں وقار الملک کو لکھتے ہیں:

"مجھ کو نہایت رنج ہے کہ محمد احمد پڑھنے پر دل نہیں لگاتا۔ کوئی بندوبست کیا جاوے جب وہ دل سے کام نہیں کرتا تو افسوس بدستور باقی رہتا ہے۔ مگر کیا کیا جاوے بغیر کیے کچھ بن بھی نہیں آتا۔" [44]

ایک دوسرے خط میں وقار الملک کو ہی لکھتے ہیں:

"نہایت افسوس ہے کہ تفاوت حسین جو ایک غریب بے سرمایہ طالب علم ہے اور نہایت محنت سے وہ ایف اے کے امتحان کو تیار ہوا تھا۔ دو دن پہلے تاریخ امتحان سے درد گردہ میں اس قدر علیل ہو گیا کہ پلنگ پر سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ عین عالت بیماری میں وہ بیماری کے لیے نہیں روتا تھا بلکہ امتحان میں نہ شریک ہو سکنے سے روتا تھا۔ اب آفت یہ ہو گئی ہے کہ اب ایف اے کا کورس بالکل بدل گیا ہے اور بغیر دو برس پڑھے امتحان نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ تعلیم جاری رکھے تو بہتر ہو گا۔" [45]

سرسید احمد خاں نے نہ تو کوئی آپ بیتی یا روزنامچہ مرتب کیا ہے اور نہ ہی اپنے ذاتی اور نجی حالات کے بارے میں وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ خطوط جو سرسید احمد خاں نے اپنے نواسے احمد الدین کو لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے ہر فرد کا خیال رکھتے تھے اور حسب مراتب ہر ایک کو اس کا جائز مقام دیا کرتے تھے۔ خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اہل خاندان کی آخری سانسوں تک مدد کی تھی۔ سرسید احمد خاں کے نجی اور ذاتی خطوط کی دریافت کے

بعد سرسید کا ایک نیا روپ سامنے آیا ہے۔ان کے خطوط میں زیادہ تر ہمشیرہ صاحبہ کا ذکر ہے۔ سرسید احمد خاں انھیں ہمشیرہ صاحبہ اور احمد الدین اور احمدی بیگم ان کو بوا کہتے تھے۔مولانا حالی نے اپنی کتاب "حیات جاوید" میں ان کی ایک بہن "صفیۃ النساء بیگم" کا ذکر کیا ہے۔سرسید کے نجی خطوط میں ان کی ایک اور بہن بچیۃ النساء بیگم کا ذکر ہے۔ایک مرتبہ وہ سخت بیمار ہوگئیں تو وہ بے چین ہوا تھے۔احمد الدین کو خط میں لکھتے ہیں:

> "ہمشیرہ بچیۃ النساء بیگم کی علالت طبع حد سے زیادہ ہوگئی ہے اس کا مجھ کو نہایت رنج ہے۔"۹۵

مکتوبات سرسید احمد خاں سے ان کی اہلیہ کے بارے میں جو معلومات فراہم ہوئی ہے اس کے مطابق ان کی بیگم کا نام پارسا بیگم عرف مبارک بیگم تھا۔وہ ان کی خالہ کی بیٹی اور خواجہ نقیب الاولیاء غلام علی کی بیٹی تھیں۹۶۔ان کے چھوٹے بیٹے سید محمود کے اخلاق و عادات خوبیاں اور خامیاں تو ان کے خطوط میں پوشیدہ ہیں اور ان کے مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بڑے بیٹے سید حامد سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔انگریزوں سے جھگڑا ہوا اور استعفیٰ دے دیا۔دہلی میں قیام پذیر ہے۔ایک خط میں احمد الدین کو لکھتے ہیں:

> "سو روپیہ کا منی آرڈر مرسل ہے اس کا روپیہ وصول کر کے سید حامد کی بیوی کو دے دو اور ان کو سمجھا دو کہ جب سید حامد رخصت پر ہیں اور جب تک اپنی نوکری پر نہیں جاتے پچاس روپیہ مہینہ میں ان کو گھر کے خرچ کے لیے بھیجتا رہوں گا۔"۹۷

سید حامد کے انتقال کے بعد بھی سرسید احمد خاں ان کے خاندان کی کفالت کرتے اور ان کے قرضوں کو چکانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔

دہلی میں تیراہا بیرام خاں پر واقع سرسید احمد خاں کا آبائی مکان کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سرسید اس کی طرف سے غافل ہو گئے تھے۔لیکن ان کے نجی خطوط میں مکان کی مرمت، دیکھ بھال وغیرہ کے احکامات درج ہیں مثلاً تعمیر غسل خانہ، کواڑوں کی مرمت وغیرہ۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "دو تخت نیچیاں اور دو اول بانات کے پردے آج تمہارے پاس روانہ کیے ہیں۔یہ دونوں دریاں اس کمرے کی ہیں جو سونے کے لیے بنایا گیا ہے۔"۹۸

> "دو پلنگ مع لکڑی پائے چھتری و ڈنڈوں کے جو اڑے سے بنے ہوئے ہیں روانہ کیے ہیں۔اس میں ایک کو واڑے سے بنا لو اور دوسرے کی بھی نواڑ ہمارے پاس ہے۔جب میں آؤں گا لیتا آؤں گا۔یہی اسباب کی طرف ہے۔"۹۹

سرسید احمد خاں کے خطوں سے ایک نئے دبستان کی شروعات ہوتی ہے۔ سرسید احمد خاں اور ان کے مشن کو ان کے خطوط کے مطالعے کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔تمام خطوط سادگی، بے تکلفی اور برجستگی کا نمونہ ہیں۔ان کی گفتگو روزمرہ کی بول چال ہے۔نثر کے اعتبار سے خطوط میں دبستان سرسید کی نثر کی جملہ خوبیاں موجود ہیں اور خطوط کے مطالعے سے ہم ایک بڑے مفکر، مصلح، ادیب اور ایک بڑے ماہر تعلیم کو بہت قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔



محمد حسین آزاد

سرسید احمد خاں کے مخصوص دور کے لکھنے والوں میں محمد حسین آزاد بنیادی طور پر تخلیقی فنکار تھے۔ وہ اپنے وقت کے مشہور ادیب اور سرسید احمد خاں کے ممتاز معاصرین میں سے تھے۔ ان کے مزاج میں تخلیقی رنگ و آہنگ کی جو خوشبو اور کشش ملتی ہے وہ ان کی تحریروں میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ محمد حسین آزاد کے انشائیے ہوں یا تنقیدی یا لسانی زاویے، ہر مقام پر تخلیق کا حسن موجود ہے۔ شاعرانہ رنگ آمیزی کے باعث ہر طرح کی تحریر سحر انگیز ہو جاتی ہے۔ زبان و بیان میں بھی ٹھیٹ پن کی چمک دمک موثر اور پرکشش ہے۔

محمد حسین آزاد ایک شاعر ہی نہیں بلکہ نقاد، مورخ اور انشاپرداز بھی تھے۔ نثر کے میدان میں انھوں نے ایسا انوکھا اسلوب اختیار کیا تھا جس کی پیروی کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ بقول تنظیم ثمینہ کشور و کرم:

"محمد حسین آزاد اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے، وہ نثر نگار اور شاعر ہی نہیں تھے، نقاد اور مورخ بھی تھے۔ انھوں نے علمی اور درسی کتابوں کے ذریعے ہی اردو کی گراں بہا خدمت انجام نہیں دی بلکہ جدید نظم نگاری کی تحریک میں بھی اہم رول ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں جدید رنگ کا بانی کہا جاتا ہے۔" ۵۲

محمد حسین آزاد کے خطوط کے درج ذیل مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں:

۱) مکتوبات آزاد مرتبہ سید جالب دہلوی، جنوری ۱۹۰۷ء
۲) "مکتوبات آزاد" مرغوب بک ایجنسی، طبع دوم، ۱۹۰۷ء ۵۱
۳) مکتوبات آزاد (ا) طاہر بک ڈپو، طبع دوم، ۱۹۲۰ء ۵۳
۴) مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد، ۱۹۲۳ء

۵) مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد، یکم فروری ۱۹۲۷ء
۶) مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، ۱۵/ جون ۱۹۶۶ء
۷) مکاتیب آزاد مرتبہ ساحل احمد، ۲۷/ نومبر ۱۹۹۷ء

مکتوبات آزاد: مرتبہ سید جالب دہلوی، جنوری ۱۹۰۷ء

کتاب کے آغاز میں نامور صحافی و ادیب سید جالب دہلوی کا تحریر کردہ ۷ صفحات پر مشتمل دیباچہ ہے۔ خطوط کی تعداد اٹھائیس ہے۔ سب سے قدیم خط ۲۸/ ستمبر ۱۸۸۲ء کا ہے۔ یہ خطوط شیخ عبدالقادر ۵۳ نے مشہور اخبار "مخزن" میں ۱۹۰۶ء میں شائع کیے تھے۔ بعد میں ۱۹۰۷ء میں کتابی شکل میں سامنے آئے۔ بقول تنظیم ثمینہ کشور و کرم:

"یہ مکتوبات سب سے پہلے ۱۹۰۶ء میں لاہور کے مشہور اخبار مخزن میں بالاقساط اشاعت پذیر ہوتے رہے پھر ۱۹۰۷ء میں انھیں کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ کتاب کے آغاز میں نامور صحافی اور ادیب سید جالب دہلوی کا تحریر کردہ دیباچہ ہے جو ان دنوں لاہور کے مشہور روزنامے "پیسہ اخبار" کی ادارت سے وابستہ تھے اور بعد ازاں لکھنؤ سے روزنامہ "ہمدم" نکالتے رہے۔" ۵۴

کتاب کے دیباچے کے آخر میں مبصر کی طرف سے آٹھ سطروں کا ایک نوٹ ہے۔ نوٹ کا خلاصہ اس طرح ہے: آزاد جن کا سلسلہ "مخزن" میں اپریل ۱۹۰۶ء سے شروع ہو کر کچھ سات مہینے تک برابر دلچسپی سے شروع رہا، دراصل یہ خطوط مولانا نے اپنے ایک عزیز میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی برادر عزیز نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے نام تحریر کیے ہیں۔ میجر صاحب انڈین میڈیکل سروس میں فوجی ڈاکٹر تھے۔ وہ بہ سلسلہ ملازمت امرتسر میں مقیم تھے۔ یہ خط و کتابت بھی انھیں دنوں کی ہے۔ ناظرین "مخزن" نے اس سلسلے کو بہت دلچسپ بنایا بلکہ اصرار کیا کہ ان منتشر تحریروں کو ایک مجموعی صورت میں محفوظ کر دیا جائے۔ ۵۵

"مکتوبات آزاد" میں تحریر سید جالب دہلوی کے دیباچے سے متعلق ساحل احمد لکھتے ہیں:

"سید جالب دہلوی کا یہ دیباچہ تحقیقی ہی نہیں تاریخی بھی ہے۔ اس دیباچے سے

آزاد کی حالات اور قلندرانہ زندگی کے کئی نئے گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔ بہت کم عرصے ہی اشغال و اذکار کو اپنا لازمۂ زندگی بنا لیا تھا۔ ''ذکر خفی و جلی اور وردو وظائف میں مشق بہم پہنچائی تھی۔'' آزاد نے اسی ضمن میں باسلسلۂ فکر و اعمال میں ہند اور بیرون کی سفر اختیار کیے تھے۔ ''سیر ایران'' ان کی ذکاوت باطنیہ کا آئینہ ہے۔ یہ ''دیباچہ'' امروآز پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔''۵۶

مکتوبات آزاد: مرغوب بک ایجنسی، طبع دوم ۱۹۰۷ء

یہ وہی خطوط کا مجموعہ ہے جو ۱۹۰۷ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ پہلا ایڈیشن کم عرصے میں ہی ختم ہو گیا تھا تو مرغوب ایجنسی لاہور نے باجازت شیخ عبدالقادر ان خطوط کو دوبارہ مارچ ۱۹۰۷ء میں شائع کر دیا جو اب کمیاب ہے۔

مکتوبات آزاد: طاہر بک ڈپو، طبع دوم ۱۹۲۰ء

سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے مجموعہ ''مکاتیب آزاد'' کے صفحہ نمبر بیس پر اس مجموعہ کا ذکر کیا ہے۔

مکتوبات آزاد: مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد، ۱۹۲۳ء

یہ مجموعہ کریمی پریس لاہور سے شائع ہوا۔ بہ سلسلۂ خاتمہ آخری صفحہ پر تاریخ ۳ر جنوری ۱۹۲۳ء درج ہے۔ یہ مجموعہ دو سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیباچہ خواجہ حسن نظامی کا تحریر کردہ ہے۔ صفحہ نمبر گیارہ سے چھتیس تک پیش لفظ درج ہے۔ ایک تحریر صفحہ نمبر تین سے دس تک ''بغیر عنوان (ہوالناصر)'' بھی موجود ہے۔ ایک خط ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام ہے۔ یہ خط اس خط کے جواب میں ہے جو ناصر نذیر نے انھیں شاگردی کی درخواست کے طور پر لکھا تھا۔ دو سو انتیس صفحہ پر ''گلدستۂ ادب'' کے عنوان سے ایک ضمیمہ درج ہے۔ ان میں دوسرے مشاہیر اردو ادب کے گیارہ نادر و اہم خطوط ہیں۔ مثلاً غالب، سرسید، حالی، علاء الدین لوہارو، غلام رسول ویران،

سید محمد حسین عفی عنہ وغیرہ۔ اس میں آغا محمد طاہر نے مکتوب نگاروں سے متعلق معلومات بھی فراہم کر دی ہے۔ صفحہ نمبر ایک پر محمد حسین آزاد کی تصویر ہے۔ اس سے پہلے صفحہ پر محمد حسین آزاد کے قلمی خط کا عکس بھی موجود ہے۔ صفحہ نمبر دو سو چودہ سے دو سو چھبیس تک ''مخلصانہ مکاتیب'' کے عنوان سے خطوط درج ہیں۔ شاگردوں کے نام خطوط کی تعداد چھتیس ہے۔

مکتوبات آزاد: مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد، طبع دوم یکم فروری ۱۹۲۷ء

خطوط آزاد کا یہ مجموعہ دوسری مرتبہ گیلانی پریس لاہور سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں خود مرتب آغا محمد طاہر نے دیباچہ لکھا ہے۔ خطوط کا آغاز صفحہ نمبر آٹھ سے شروع ہوتا ہے۔ شروع میں تمام خطوط سید حسین بلگرامی کے نام ہیں۔ اس کے بعد محمد دین، منشی ذکاء اللہ کے نام خطوط ہیں۔ صفحہ نمبر اکیانوے سے شاگردوں کے نام خطوط کی شروعات ہوتی ہے۔ جن میں لالہ دنی چند اور سجاد حسین کا نام درج ہے۔ صفحہ نمبر ایک سو دو سے ''مخلصانہ مکاتیب'' کے عنوان سے خطوط درج ہیں۔ صفحہ ایک سو اٹھارہ میں ''گلدستۂ ادب'' کے عنوان سے ایک ضمیمہ شامل ہے۔ اس میں دوسرے مشاہیر اردو ادب کے خطوط شامل ہیں۔ اور مکتوبات نگاروں سے متعلق معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں۔ صفحہ نمبر ایک سو اکتالیس سے ایک سو چالیس تک ''بچوں کو تحفے'' کے عنوان سے محمد حسین آزاد کی مختلف تصانیف کا ذکر اور ان سے متعلق دیگر معلومات ہے۔ مثلاً صفحات کی تعداد اور قیمت وغیرہ۔

مکتوبات آزاد: مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، ۱۵ر جون ۱۹۶۶ء

مجلس ترقی ادب لاہور سے مجموعہ ''مکاتیب آزاد'' شائع ہوا۔ یہ مجموعہ دو سو بہتر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سات خطوط فارسی، ایک انگریزی اور باقی اردو میں ہیں۔ اردو خطوط کی کل تعداد انتیس ہے۔ آخری خط منشی ذکاء اللہ کے نام ہے۔ ۱۸۹۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ صفحہ گیارہ سے پیش لفظ خود مرتب کا لکھا ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں فاضل مرتب نے سید جالب دہلوی کا دیباچہ بھی شامل کر لیا ہے۔ دیباچے سے متعلق مرتضیٰ حسین لکھتے ہیں:

"مکتوبات آزاد" (طبع اول و دوم) میں جناب سید جالب دہلوی نے ایک دیباچہ بھی لکھا تھا۔ انھوں نے غالب اور آزاد دونوں کو دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس لیے انھوں نے دونوں کے بارے میں بے حد کارآمد باتیں لکھی ہیں جن سے غالب و آزاد پر کام کرنے والوں میں اکثر حضرات باخبر نہیں ہیں۔ میرے خیال میں اس دیباچہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ جالب دہلوی نے دو مکاتیب نگاروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، معاصر صاحب قلم ہوتے اور براہ راست روایت کے نقطۂ نظر سے انتہائی وقیع ہے۔"[۵۷]

مجموعہ "مکاتیب آزاد" میں خطوط کی شروعات صفحہ نمبر پچیس سے ہوتی ہے۔ تمام خطوط تاریخ وار ترتیب دیے گئے ہیں جس سے مکتوب نگار اور مکاتیب کے بارے میں تدریجی حالات کا علم ہوتا ہے اور خطوط کا پس منظر بھی سامنے آتا ہے۔ اس مجموعہ میں شائع شدہ خطوط تو موجود ہیں ہی ان کے علاوہ تقریباً پینتیس تحریروں کا اضافہ ہوا ہے۔ ان خطوں میں رقعات عالمگیری، تحفۃ العوام، تفہیم حضوری، دیباچہ رومی، اخلاق جلالی، دیوان حافظ، برہان قاطع، نامہ خسروان، آب حیات، نیرنگ خیال، قند پارسی، سخن دان فارس، دیوان ذوق، دربار اکبری اور سوانح اکبری کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح امیر دہلوی، جلال لکھنوی، ڈاکٹر لائٹنر، قاسم چاند پوری، اکبر، ملا دو پیازہ، بیربل، نواب سعادت علی خاں، مرزا دبیر، گلبدن بیگم، ہمایوں، سلیمہ سلطان بیگم، زیب النساء، امام دین، چاند بی بی، سید مصطفیٰ بلگرامی، سرسالار جنگ وغیرہ کا ذکر مختلف نوعیتوں سے کیا گیا ہے۔ یہ خطوط زبان و بیان، فکر گری اور تاریخی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ مرتب نے مجموعہ کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے:

"۱۔ مکاتیب آزاد" میں ایک سو چھتیس تحریریں ہیں۔

۲۔ اس مجموعے کی ترتیب باعتبار تاریخ ہے۔

۳۔ اس مجموعے میں بہت سی نادر تحریریں اصل مسودوں سے سجائی گئی ہیں۔

۴۔ اس مجموعے میں مولانا آزاد کی زندگی، فکر اور نظریات سمجھنے کے لیے روشنی ملتی ہے۔

۵۔ آزاد کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔

۶۔ آزاد کے سفر و مقاصد حیات اور خدمت قوم و ملک، خلوص نیت اور استقلال طبع پر اس سے بہتر مواد ملنا مشکل ہے۔"[۵۸]

مکاتیب آزاد: مرتبہ ساحل احمد، دسمبر ۱۹۹۷ء

یہ مجموعہ تاج آفسیٹ الہ آباد سے شائع ہوا۔ مجموعہ ایک سو چھتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ خطوط کی کل تعداد اٹھائیس ہے۔ یہ خط سید حسن بلگرامی کے نام نامی سے منسوب ہیں۔ پیش لفظ خود مرتب ساحل احمد کا لکھا ہوا ہے۔ "تمہید طبع ثانی" کے عنوان سے صفحہ نمبر سولہ اور سترہ پر منیجر مرغوب ایجنسی لاہور کی جانب سے ایک تحریر بھی درج ہے۔ اس مجموعہ میں بھی سید جالب دہلوی کا دیباچہ شامل ہے۔ صفحہ نمبر تراسی سے حواشی اور تعارف کے عنوان سے مرتب نے محمد حسین آزاد کی مختلف تصانیف اور ان کی شخصیات سے متعلق تفصیل سے معلومات فراہم کردی ہے جن کا ذکر محمد حسین آزاد نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مرتب نے پیش لفظ تحریر کیا ہے جس کے خاتمہ پر تاریخ دسمبر ۱۹۹۷ء درج ہے۔ کتاب کا آخری صفحہ محمد حسین آزاد کی خوبصورت تصویر سے آراستہ ہے۔

اسی طرح محمد حسین آزاد کے خطوط سات (۷) مرتبہ چھپ کر کتابی شکل میں منظر عام پر آئے اور مختلف رسائل اور اخبارات میں بھی شائع ہوتے رہے۔

خطوط میں القاب و آداب مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ بعض خطوط بغیر القاب و آداب کے ہی شروع کردیتے ہیں۔ مکتوب الیہ کو جناب من، بندہ پرور، جناب عالی! مشفق من، عزیز من، عالی جانب جناب من، اقبال نشان من سے مخاطب کرتے ہیں۔ کسی کسی خط کو ہاں صاحب! الو صاحب! صاحب کیا کہوں! اجی آغا صاحب سے ہی شروع کردیتے ہیں۔ خطوط میں حفظ مراتب کا خاص خیال رکھا ہے۔ بعض خطوط میں چھوٹے یا بڑے عربی دعائیہ جملے بھی موجود ہیں۔ مثلاً دعا و التماس دعا، والتسلیم بالوف التکریم، ادام اللہ اقبالکم یا دضاعف اجلالکم۔ آخر میں اپنا نام صرف آزاد لکھتے ہیں کہیں کہیں پورا نام مع تخلص بھی لکھتے ہیں۔

خطوط آزاد کے مطالعے سے آزاد کی ایک منفرد اور جداگانہ شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے جس کی تشکیل میں اسلوب اور موضوعات دونوں کو دخل ہے۔ خطوط کی نثر میں تشبیہات و استعارات،

روزمرہ، محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال مناسب ہے اور ان سب کی موجودگی نے اسلوب کو دلکش و دل نشین بنا دیا ہے۔ سید حسن بلگرامی کو ایک خط میں اس طرح اپنے حالات سے مطلع کرتے ہیں:

"میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں نہ ساون ہرا نہ بھادوں سوکھا۔" ۲۹؎

محمد حسین آزاد اپنے مخصوص تشبیہاتی رنگ میں خطوط لکھتے ہیں۔ تمثیلات کا استعمال وہاں کچھ زیادہ محسوس ہوتا ہے جہاں مکتوب الیہ کو قلم سنبھال کر خط لکھنے کا احساس ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

جناب من!

تسلیم، آپ دیکھتے ہیں یہ علم کسی چڑیل (یونیورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہے۔ چند مہینے میں تن بیچے کا کر نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لیے ہم پکڑے جاتے ہیں فرسٹ آرٹ اور بی اے کورس عربی و فارسی کے باب میں رائے طلب ہوئی۔ اب بنانے کے لیے حکم ہے۔ جلدی دو۔" ۳۰؎

ذاتی نوعیت کے خطوط میں کچھ ایسے نکتے مل جاتے ہیں جو تحقیق کے میدان میں خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے خطوط کے مطالعے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ محاورے اور روزمرہ سے دلچسپی اور ان کی بعض تصانیف خاص طور سے دربار اکبری کے سلسلے میں ماخذ کی جستجو۔ ایک خط میں میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

"آپ کو معلوم ہے کہ ماثر الامرا اور سوانح اکبری کسی زمانے میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں، چند مطالعوں میں پرانی کتابوں کا پتہ لگایا تھا، چھ دن میں بھاگا گیا اور دوڑا دوڑا آیا، جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ ماثر الامرا ابھی مل گئی، شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے۔ وہ ماثر الامرا سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گزرنا کفر ہے، ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے اور اچھے مل گئے۔ سب

سے زیادہ وجہ ہے کہ اب جو "دربار اکبری" کا مشاہدہ کرے گا۔ یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو آثار ہاتھ نہیں آئی۔" ۳۱؎

اس خط سے محمد حسین آزاد کے ادبی ذوق مطالعہ کی جانب جھکاؤ، محویت، جانفشانی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی فطرت تحقیق و تنقید کے سلسلے میں بہت جستجو پسند نظر آتی ہے۔ انھیں پرانی کتابوں اور ذخائر کے مطالعہ اور تلاش کا شوق تھا۔ "بھاگا بھاگا" اور "دانہ دانہ قطرہ قطرہ" جیسے الفاظ بے تکلفی کا مظہر بن گئے ہیں۔

سید حسن بلگرامی کے نام لکھے گئے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں "دربار اکبری" لکھنے میں مصروف تھے اس کی ترتیب و مواد کا اہتمام کر رہے تھے۔ ساتھ میں ڈرامے پر بھی غور کر رہے تھے۔ لکھتے ہیں:

"آپ نے تصویروں کا کچھ بندوبست نہ فرمایا۔ مجھے اکبر کی ایک تصویر ہاتھ آئی کہ تین چار ترک عورتیں بیٹھی ہیں اور وہ دو تین برس کا بچہ کھیلتا پھرتا ہے۔ رات کا وقت ہے شمع روشن ہے، جھجکے وغیرہ سامنے پڑے ہیں۔ یہ اکبر کے ابتدائی حالات میں لگانی واجب ہے۔

ایک ایسی ہی پرانی تصویر اور ملا دوپیازہ کی ہاتھ آئی، بیربل کے ساتھ اسے بھی لگانا واجب ہے۔ اگرچہ کتاب سے ملا دوپیازہ کی اصل نہیں معلوم ہوتی، مگر مسخروں اور بھانڈوں نے اس کا شملہ دستار بیربل کے دم میں مضبوط باندھا ہے۔

راجہ مان سنگھ کی تصویر بھی سند ہے۔ سرکار اودھ سے منگوائی ہے۔" ۳۲؎

اس خط میں اس طرح منظر کشی کی ہے ایسا لگتا ہے کہ ہم قاری نہیں بلکہ سامع ہیں کیوں کہ خط پڑھتے وقت سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے گویا قاری خود اکبر کے دور میں پہنچ گیا ہے۔ یہ خط منظر کشی کی عمدہ مثال ہے۔

دوسرے خط میں "دربار اکبری" سے متعلق مصروفیات اس طرح بیان کرتے ہیں:

"دربار اکبری" کو لپیٹ رہا ہوں، مگر وہی دن جم کر بیٹھا تھا کہ رنگ بدلا اور

دماغ جواب دینے لگا۔ تیرہ دن میں نے ایک دن آرام دیا تخفیف معلوم ہوئی۔ اب
آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ تیرہ کام خدا کے فضل سے ہوگیا۔ مگر افسوس اس بات
کا ہے کہ بے وقت ہوا۔"[۹۳]

اسلوب سادہ سلیس رواں اور بے تکلف ہے۔ اسلوب کے مختلف رنگ خطوط میں اپنے انفرادی خدوخال کے ساتھ ابھرتے اور صورت پذیر ہوتے ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے کہیں مخصوص فضا کی تشکیل کے لیے مکتوب الیہ کی دریافت کے جواب میں جگہ جگہ اشعار یا پھر ان اشعار کی روح پیش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں محض ایک مصرعہ ہی لکھ کر جواب دیتے ہیں۔ ایک فارسی ڈرامہ "خان انگران" سید حسن بلگرامی کو روانہ کیا اور خود امرتسر نہیں گئے۔ ڈرامہ کی روانگی کے سلسلے میں مجبر سید حسن بلگرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اتوار، پیر، منگل چھٹی ہے۔ خیال آیا کہ تین دن جم کر بیٹھوں گا تو "نیرنگ الاسرار"
کا کام ختم ہو جائے گا۔ جاؤں گا تو ایک دن صرف ہوگا اور حاصل فقط باتیں۔ اس
لیے کتاب بھیج دینی چاہیے۔ کوئی امر ضروری ہوگا تو امرت سر ہے کتنی دور ایک
دن میں جاؤں گا اور پھر آ ؤں گا۔

ہائے قائم نے کیا خوب کہا ہے:

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے مے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں[۹۴]

محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" پر ان کے کچھ دوستوں اور بزرگوں نے ریویو لکھا۔ اسی ریویو سے متعلق محمد حسین آزاد کا لکھا شکریہ نامہ "مکتوبات آزاد" میں شامل ہے۔ اس شکریہ نامہ میں اپنی مصروفیات اور پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا۔ اس میں آرام نہ کرتا تھا۔ اپنی
معلومات کو اور جو اس سے خیال پیدا ہوتے تھے لکھتا تھا اور رکھتا جاتا تھا یا اوراق
پریشان نکالے۔ اور "آب حیات" کا جام بنا کر تمہاری ضیافت طبع کے لیے
حاضر کیا۔ اب افسوس ہے اور افسوس کے سوا کچھ چارا نہیں کہ میں تھک گیا اور

ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ دل و دماغ فرسودہ ہوگئے۔ اب مجھ سے کچھ نہیں
ہوسکتا۔ آخر کہاں تک۔ محنت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کئی کتابیں اور رسالے ہیں،
مگر مسودے دھرے ہیں، کئی ناتمام پڑے ہیں۔ بہت سے خیالات دل کے دل
ہی میں گرہ ہیں۔ اتنی طاقت نہیں کہ نکل سکیں۔"[۹۵]

محمد حسین آزاد ایک منفرد اسلوب تحریر کے مالک تھے۔ جدت اور دلکشی ان کی تحریر کا وصف خاص تھی جس سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل آزاد کی طبیعت میں شگفتگی، نازک خیالی، لطافت اور جدت طرازی قدرت کی عطا کردہ تھی اور فارسی زبان و ادب کے شوق مطالعہ نے اس جوہر کو مزید جلا بخشی۔ محمد حسین آزاد کے طرز تحریر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں کو تشبیہ واستعارہ کی برجستگی، الفاظ کی شیرینی و لطافت اور فقروں کی موسیقیت سے ایسی دلچسپ رواں اور منفرد عبارت بنا دیتے ہیں۔ اکثر بوجھل منطقی انداز کو بھی اپنے دلنشیں اسلوب کی بدولت انشائی حسن سے آراستہ کر دیتے ہیں ان کے طرز تحریر کی انھیں خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حامد حسین قادری لکھتے ہیں:

"آزاد باکمال "خدا ساز" ہستیوں میں تھے۔ ان کا ذہن زبان، محاورہ، الفاظ و
بندش کے انتخاب کے متعلق صحیح توازن و تناسب رکھتا تھا اور ان کی طبیعت میں
ندرت آفرینی و جدت طرازی اعلیٰ درجے کی تھی۔ زبان و بیان کی شیرینی و نرمی
میں کوئی ادیب ان کا شریک نہیں ہے۔"[۹۶]

ان خطوط میں "آب حیات" اور "دربار اکبری" کے علاوہ ان تصانیف کا ذکر ملتا ہے جو مشہور و معروف ہیں مثلاً نیرنگ خیال، سخن دان فارس، نگارستان فارس، قصص ہند وغیرہ کے وجود میں آنے کے محرکات، تصنیف و تالیف کے دوران کی مشکلات و پریشانیاں اور مصروفیات کا ذکر وضاحت کے ساتھ ملتا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں آج کل عجب مخمصے میں پڑ گیا۔۔۔ ادھر مجھے کورس وغیرہ کا مرض لگ گیا۔
ادھر کالج کا تردد کہ فقط معلوم ہوا آب حیات اور نیرنگ خیال امتحان یونیورسٹی
میں داخل ہوگئی ہیں اور امتحان آغاز مئی پر ہوگا۔ سب نے کہا کہ دونوں کو ضرور

پہنچا دیا چاہیے۔ تین چار سو طالب علم و طفل طلب گار ہوگا۔ مجھے بھی صبح نے لکھایا اور فوراً شروع کر دیا۔ اگر نہایت کوشش ہو اور کار گر بھی ہو اور کئی چھاپہ خانوں سے کام لیا جائے تو دو مہینے چاہئیں۔ خیر اب تو پھنس گیا...... دو دو ہزار چھپانے شروع کیے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ تنہا ہوں...... رفیق کوئی نہیں۔ استغفر اللہ یہ کیا کفر ہے۔ مولیٰ موجود ہے۔"۲۷

۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تھی اور نظام تعلیمات میں ردوبدل ہو رہا تھا۔ محمد حسین آزاد کو کالج بند ہونے اور اپنی نوکری جاتی رہنے کا اندیشہ تھا۔ اس زمانے میں عموماً اساتذہ کو پچاس روپے تنخواہ ملتی تھی اور آزاد کو ڈیڑھ سو روپے۔ ایک خط میں ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ میرا فیصلہ بھی اس پر منحصر ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی، خواہ سررشتۂ تعلیم میں خواہ سول لائن میں۔ اخیر درجہ پنشن کا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ایک سو پچاس روپے آتے تھے۔ اس گھر میں پچاس روپیہ آئیں گے تو صورت حال کیا ہوگی۔ لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو، کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدا کریم کارساز ہے یا وہ دینا چاہے تو اس کے ہزار ہاتھ ہیں، عہدے کے لیے کوشش نہ کروں۔ آپ کی کیا رائے ہے۔"۲۸

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے دل سے یہ اقرار کیا ہے کہ اگر سر رشتہ استعفیٰ دی تو اختیار کروں گا ورنہ پنشن لوں گا۔"۲۹

سالار جنگ جن کے نام سے آزاد اپنی کتاب "دربارِ اکبری" کا انتساب کرنا چاہتے تھے۔ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے لکھا ہے کہ شاید مولانا سرسالار جنگ کے یہاں وظیفے کی امید تھی۔ لیکن ۸ فروری ۱۸۸۳ء کو سرسالار جنگ کا یکایک انتقال ہوگیا۔ اور محمد حسین آزاد کی تجویز

پوری نہ ہو سکی۔ ایک خط میں افسوس اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

"ہائے افسوس صد ہزار افسوس! آسمان ٹوٹ پڑا، زمین تہ و بالا ہوگئی، خدا جانے کیا ہوا اور کیوں مر گئے۔ اچھا اب کیا ہو سکتا ہے۔ یا ارحم الراحمین رحم کر بحق محمد و آل محمد۔

اول ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرنی چاہیے بعد اس کے یہ سوچنا چاہیے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"۳۰

"فقیر آزاد سے اور کچھ نہ ہو سکا یہ کتاب ان کے نام پر لکھتا ہے کہ ان دنوں زیر قلم تھی:

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مزا تو اس کا جب تھا جب خود لے جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے ان کے سامنے پڑھتا اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر وہ کیا فرماتے ہیں۔ ہائے سرسالار جنگ سارے ارمان دل کے دل میں رہے۔"۳۱

محمد حسین آزاد کے خطوں میں کہیں کہیں مخصوص اسلوب نگارش ملتا ہے۔ اکثر خطوں میں کتابوں کی اشاعت و طباعت کا ذکر ملتا ہے۔ بعض خطوں میں ذاتی حالات ہیں۔ رشتہ داروں کا ذکر بھی ہے۔ کچھ خطوط کالج اور یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے خطوط کی زبان سادہ اور رنگی ہے۔ "مکتوبات آزاد" کی انھیں خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے وکرم (نند کشور) لکھتے ہیں:

"چونکہ یہ خطوط مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "غبار خاطر" کے خطوط کی طرح اشاعت کے لیے نہیں لکھے گئے۔ لہٰذا اس کتاب کے خطوط کی زبان سیدھی سادی ہے اور بے تکلفانہ طرز تحریر کا ایک عمدہ نمونہ ہیں جس میں بہت کم مقامات پر ان کے مخصوص ادبی اسلوب تحریر کی جھلک ملتی ہے۔"۳۲

محمد حسین آزاد کے خطوں سے ان کی ذاتی اور نجی حیثیت سامنے آتی ہے۔ ان خطوں میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی نقاب کشائی نہ تو ان کی تصانیف میں ممکن ہو سکی اور نہ ہی معاصرین دانشمندوں نے اس طرف کوئی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ محمد حسین آزاد کی خوش مزاجی، شگفتہ طبعی، ذاتی

199-198

شوخی، متانت، ظرافت کو ان کے خطوط میں جیتی جاگتی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے خطوط تخلیقی حسیت کا آئینہ دار ہیں۔

حکیم محمد دین ہے کے نام لکھے خطوط میں محمد حسین آزاد کی فراخ دلی، انسانیت اور رحم و خدا ترسی کا ایک قابل تقلید پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر افسانے کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ خطوط ان کے مزاج کی ایک بہترین تصویر پیش کرتے ہیں۔ حکیم محمد دین کے نام لکھے خطوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک صاحب ان کی کتاب غائب کر دیتے ہیں۔ محمد حسین آزاد اس کو واپس لینے کے سلسلے میں بہت پریشان ہیں۔ مجرم اقرار جرم کر لیتا ہے۔ عین اس وقت جب کتاب ملنے کو تھی محمد حسین آزاد اس کو معاف کر دیتے ہیں۔ اپنی کتاب کے سلسلے میں حکیم محمد دین کو لکھتے ہیں:

"آپ نے میاں غلام رسول صاحب سے "الف لیلہ" کے باب میں وصول کے لیے تحریک فرمائی اور ان سے وعدۂ حصول بھی حاصل کیا۔ لیکن ایک تفصیل کا پتہ اسی جو مجھے پہلے بھی جاتا ہے۔ اس کی معرفت آج انھوں نے مجھے پیغام بھیجا کہ وہ کتاب تو میرے پاس سے کھوئی گئی، کہو تو بمبئی سے اور منگوا دوں، یوں جو چاہو اس کی قیمت لے لو۔ اب آپ خیال فرمائیں کہ اس اشراف آدمی کی نیت کا کیا حال ہے؟" ۵ے

ایک دوسرے خط میں "الف لیلہ" کے معاملے کے انجام کا ذکر کرتے ہیں:

"آپ کو بھی تو کبھی ضرور خیال آتا ہوگا کہ منشی غلام نبی (کذا) کا اور کتاب "الف لیلہ" کے معاملے کا کیا انجام ہوا ہوگا۔ اس کا حال یہ ہے کہ الٰہی بخش کتب فروش اس شہر میں ایک معقول شخص ہے۔ اس نے اول مجھے خبر دی کہ کتاب مذکور منشی صاحب نے درحقیقت اسی کو دی تھی۔ اور مبادلے میں ایک قرآن شریف لیا تھا۔ چنانچہ کتب فروش مذکور نے چار روپے آٹھ آنے کو وہ کتاب بیچ بھی ڈالی۔

اب تین دن کا ذکر ہے اس نے مجھ سے کہا کہ آج منشی صاحب مذکور نے انیس روپیہ مجھے دیے ہیں اور کہا ہے کہ بمبئی سے کتاب منگا دو۔ جس پیرایہ میں اس

نے یہ ذکر کیا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ انیس روپے کا داغ نہایت تکلیف دینے والا ہے۔ خصوصاً آج کے زمانے میں وہ بھی ۳۰،۲۵ روپے کے نوکر کو۔

اس تقریر نے میرے دل پر بھی درد اثر پیدا کیا۔ اور میں نے کہہ دیا کہ یہ روپے تم انھیں واپس کر دو۔ اور کہہ دو کہ بس کتاب مجھے پہنچ گئی۔" ۶ے

اس خط سے محمد حسین آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد حسین آزاد کتنے مخلص، دریا دل، نیک فطرت اور کس قدر بلند حوصلہ انسان تھے۔ دوسروں کی مجبوری اور بے کسی کو کس طرح محسوس کرتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے خطوط ان کے نفسیات اور انداز زندگی، شوق کتب اور انسان دوستی کا ثبوت ہیں۔

شاگردوں کے نام لکھے خطوط کے مطالعہ سے شاگردوں کے لیے ان کی محبت، شاگرد کی ترقی کے لیے دعائیں اور کوششوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر لالہ دنی چند کے نام لکھے خطوط کے مطالعے سے مرزا غالب اور ان کے شاگرد ہرگوپال تفتہ یاد آنے لگتے ہیں حالانکہ دنی چند اور ہرگوپال تفتہ دونوں میں فرق ہے۔ لیکن ہرگوپال تفتہ بے اختیار ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد لالہ دنی چند کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"امتحان کی خوش اسلوبی سے کمال خوشی ہوئی، خدا تمہاری کوششوں کو ہمیشہ کامیاب اور مثمر خیر و برکات رکھے۔" ۷ے

ان کے شاگرد اصلاح کے لیے اپنا کلام بھی ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ متعدد خطوط ایسے ہیں جن میں محمد حسین آزاد نے اپنے شاگردوں کو اصلاحیں بھی دی ہیں۔ لالہ دنی چند وکالت کا امتحان دینا چاہتے ہیں تو محمد حسین آزاد اپنے شاگرد کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نواب صاحب یہاں تبدیل ہو کر انبالہ سے آگئے ہیں، ان سے مل کر یوں گا شاید کوئی راستہ نکل آئے۔ اگرچہ یہ بھی نہ ہو تو میرے نزدیک اس پر لعنت کرنی چاہیے اور تم الٰہ آباد میں جا کر امتحان دے دو، ماسٹر وہاب الدین بھی تیرہ کو روانہ ہوں گے، تین مہینے وہاں رہ کر یاد کریں گے اور پھر امتحان دیں گے۔" ۸ے

سید ناصر ۹یے نذیر فراق دہلوی نے اپنی تصنیف سات طلاقتوں کی کہانی اصلاح کے لیے بھیجی۔ محمد حسین آزاد اصلاح کے بعد واپس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تمہاری 'سات طلاقتوں' کے قصے پڑھ کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ خدا کی پناہ! کس بلا کی پھوہڑ اور گیگلی تھیں۔ میں دیکھتا ہوں تمہاری نثر تمہاری نظم سے زیادہ مزے دار ہو چلی ہے۔ خدا رکھے دلی کے رہنے والے اور خواجہ میر درد کے نواسے! تم سلیس اردو نہ لکھو گے تو اور کون لکھے گا۔ تمہارا یہ رسالہ اس قابل ہے کہ چھپوا دیا جائے اور لڑکیوں کو پڑھایا جائے۔ میں نے جا بجا اصلاح دے دی ہے۔ غور سے دیکھ لینا۔" ۸۰

خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب بھی انھیں فرصت ملتی کتابوں کی تلاش میں شہر شہر، قریہ قریہ کا سفر کرتے تھے۔ دوستوں اور طالب علموں سے دریافت کرتے تھے کہ کہاں کہاں اور کس کس کے پاس پرانی کتابیں ہیں۔ میجر سید حسن بلگرامی کے نام لکھے گئے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن بلگرامی نے ان عورتوں سے متعلق مواد یا معلومات فراہم کرنی چاہی جو صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تصنیف بھی ہوں۔ محمد حسین آزاد نے اپنے خطوط میں ایسی عورتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر عورتوں سے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"عورتوں کا تذکرہ جو آپ فرماتے ہیں، ایسی کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گزری، نہ مجھے ایشیائی مصنفوں سے امید ہے کہ کسی نے لکھی ہو۔ بھوپال سے بھی ایک صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ ان مضامین کا کچھ سایہ مجھے دو، مگر وہ فقط شاعرہ عورتوں کے باب میں لکھنا چاہتے تھے... اب جو میں خیال کرتا ہوں تو البتہ یہ ممکن ہے کہ ان عورتوں کے ناموں کو بے تکلف پھیلا دیا جائے کہ جن کے کئی کئی شعر تذکروں میں مذکور ہیں۔ لیکن اصل مقصد آپ کا یہ ہے کہ ایسی عورتوں کے حالات ہوں جو صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تصنیف ہوں۔ یہ بات نہایت مشکل معلوم ہوتی ہے۔ فقط ایک گلبدن بیگم ہمایوں کی

بہن تھی کہ اس نے "ہمایوں نامہ" لکھا۔ وہ نسخہ بھی اب میرے پاس نہیں۔ دلی میں بڑی کوشش سے بہم پہنچایا تھا۔ اس نے ورق پر چند عورتوں کے حال اور بھی کسی نے لکھ دیے تھے وہ بھی شاعرانہ طور سے اور شاعری کے سلسلے میں۔" ۸۱

اس کے علاوہ محمد حسین آزاد نے دیگر عورتوں مثلاً سلیمہ سلطان بیگم جو ہمایوں کی پھوپھی زاد بہن تھی، زیب النساء وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے خط میں چاندنی بی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

"'تذکرۃ الصورات' کا حال جو آپ نے پہلے مرحمت نامے میں لکھا تھا۔ معلوم نہیں کہ اس میں چاندنی بی کا بھی تذکرہ ہے یا نہیں؟ یہ بھی بڑی با لیاقت اور صاحب ہمت بی بی دکن میں ہوئی ہے۔ اسے "نادرۃ الزمانی" کہتے تھے۔ آپ وہاں سے اس کے حالات دریافت فرمائیں اور مجھے بھی عنایت کریں۔ انشاء اللہ کبھی کام آئیں گے۔ اس طرح مصالح اکٹھا ہوا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ عمارت تیار ہو جاتی ہے۔" ۸۲

محمد حسین آزاد کے خطوط کے مطالعے سے بہت سی ایسی اسکیمیں اور منصوبے سامنے آتے ہیں جن کی تکمیل ان سے نہ ہو سکی یا ان پر عمل کرنے کے لیے وقت اور حالات سازگار نہ ہوئے۔ ان کی مصروفیات، مشاغل، سفر کے بارے میں یہ خطوط راست ماخذ کا کام دیتے ہیں۔ کیوں کہ محمد حسین آزاد نے اپنے نامہ و پیام کو ذاتی باتوں کا وسیلہ تصور کیا تھا۔ غیر ارادی طور پر خطوط میں اپنے عہد کی جھلکیاں بھی پیش کر دیتے ہیں۔ خطوط میں رشتوں کی پاسداری بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مختصر ہی سہی لیکن اپنے خطوط میں محمد حسین آزاد نے رشتہ داروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لالہ دنی چند کے نام لکھے خط میں اپنے صاحب زادے کی بیماری کا ذکر کرتے ہیں:

"تمہارے پیارے ملا۸۳ کا بڑا پتلا حال ہو رہا ہے۔ بارہ دن سے ہادی کا بخار آتا ہے۔ زرد ہو گیا جیسے ہلدی، کھانسی دم نہیں لینے دیتی، اور ناک بند ہے۔ سانس نہیں لینے دیتی۔

ارے میاں ملا کے لیے دعا کرو کہ خدا اسے شفا دے اور عمر دراز پر علم و اقبال عطا

کرے! مجھے اس کا بڑا خیال رہتا ہے۔ والد مرحوم کے نام پر اس کا نام رکھا ہے۔"۸۴

ایک دوسرے خط کے آخری حصے میں لکھتے ہیں:

"ابراور خلیفہ ۸۵ آپ کو آداب کہتے ہیں۔"۸۶

سید حسین بلگرامی سے اپنی بچی اور نواسے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"'' آپ کے جوہری تصدیق سے نورچشم ۸۷ شیر خدا نے فضل کیا کہ ڈھائی مہینے ہوا اسے بیاہ لے روانہ کردیا۔ مگر جس دن آپ کا مرحمت نامہ پہنچا۔ دوسرے دن اس کا خط آیا کہ بڑ کا ۸۸ اس کا بہت علیل ہو گیا۔ میں بہت پریشان ہوا اور یہاں سے ارسال ادویات کی فکر میں مصروف رہا۔"۸۹

خطوط میں جا بجا عربی الفاظ، فارسی اشعار و الفاظ کا استعمال تو کیا ہی ہے ساتھ میں انگریزی لفظوں کا استعمال بے تکلفی سے کیا ہے مثلاً سوشلا ئرز، ڈیڈیکیشن، ورکمپلیر ی، پالیسی، ڈائیلاگز وغیرہ۔ مختلف شہروں جیسے کپورتھلہ، لاہور، امرتسر، بھوپال، رڑکی، حیدرآباد، جموں کا ذکر بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر، پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور کے نام لکھے خطوط کے مطالعے سے ایک انگریز اور اس کے معاملے میں ایک غیرت دار و خود اعتماد انسان کا کردار نظر آتا ہے۔ ان خطوں میں نوک جھونک، نتاتی، چُٹکیلی اور چٹپٹی ظرافت، کشمکش اور محمد حسین آزاد کی پریشانیوں کے دوررس نتائج کی نشاندہی ہے۔ ابتدا میں محمد حسین آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر کے تعلقات بڑے گہرے دوستانہ تھے۔ لیکن بعد میں بہت ہی نقصان دہ اور مخالفانہ ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اپنی "سنین الاسلام" نامی کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد سے بہت امداد حاصل کی تھی۔ مگر جلد اول کی اشاعت کے بعد وہ نہ صرف اس بات سے انکار کرنے لگے بلکہ کوشش کرنے لگے کہ محمد حسین آزاد کسی طرح کالج سے برطرف اور گورنمنٹ کی نظر میں معتوب قرار پائیں۔ ڈاکٹر لائٹنر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہ امر بھی عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں۔ میں اس تحریر سے آپ کا منت ضائع نہ کرتا۔ مگر کئی دن سے سنتا ہوں کہ "سنین الاسلام" میں کسی نے بہت

غلطیاں نکالی ہیں اور دوسرے نے تصدیق کی۔ میں نے بہ موجب اپنے عہد کے اس کی بھی تفصیل نہ چاہی مگر آج ایک نئی بات سنی کہ "سنین الاسلام" کی ترکیب ہی غلط ہے۔ مجھ میں ضبط کی طاقت نہ رہی۔"۹۰

مولانا ذکاء اللہ اور مولوی ممتاز علی کے نام جو خطوط ہیں وہ زیادہ تر عالم دیوانگی میں تحریر کیے ہیں مگر عبارت پڑھنے کے قابل ہے۔ وکرم (منشی نولکشور) مجموعہ "مکتوبات آزاد" کی اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں:

"یہ ایک بڑا اہم مجموعہ خطوط ہے جو اگر شائع نہ ہوتا تو ان کی زندگی کے کئی گوشے ہماری نظروں سے اوجھل رہ جاتے۔"۹۱

محمد حسین آزاد کے خطوط کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کو تحقیق سے خصوصی شغف تھا جس نے ان کے تنقیدی شعور کو جلا بخشی۔ مغربی ادبیات کے اثرات اور دلی کالج کے فکر آفریں ماحول نے تخیل کی جولانی، فکر کی روانی اور فن کی گہرائی عطا کی۔ خطوط کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ کی صحبتوں سے انھوں نے اکتسابِ فیض حاصل کیا۔ علم و یقین کی اقداری صفات نے ان خطوط کو خزینہ خاص کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ محمد حسین آزاد کے خطوط آج بھی تازہ و شاداب ہیں ان خطوط کی اہمیت سے متعلق سید جالب دہلوی "مکتوبات آزاد" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"دفتر مخزن نے جو مولانا آزاد کے یہ تھوڑے سے خطوط کتابی شکل میں شائع کیے ہیں ان کو ہم آپ کا ایک قابل قدر تبرک سمجھتے ہیں۔ اور ملک و زبان کے حق میں ایک احسان عظیم سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مکتوبات کے ذریعے سے رسالہ 'مخزن' نے نہ صرف مولانا کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک دل آویز نمونہ شائقین اردو کو دکھایا ہے بلکہ بالواسطہ ان کی پرحوادث مگر قیمتی زندگی کے حالات کا وہ دلچسپ حصہ ہم پہنچایا ہے جس کا مہیا ہونا خود مولانا آزاد سے بھی نظر بہ حالات موجودہ سخت دشوار تھا۔"۹۲

■❖■

مولوی نذیر احمد

مولوی نذیر احمد سرسید احمد خاں کے قریبی رفقا میں شامل تھے۔ وہ اپنے زمانہ ملازمت میں سرسید احمد خاں سے متعارف ہوئے اور تعلقات کا سلسلہ آخری دم تک قائم رہا۔ علی گڑھ تحریک کے زبردست حامی تھے۔ حیدرآباد سے پنشن لینے کے بعد وہ علی گڑھ تحریک کے تعلیمی اور ادبی محاذوں پر سرگرم رکن کی طرح ڈٹے رہے۔ جزوی اختلافات کے علاوہ وہ سرسید احمد خاں کے زبردست موید تھے اور ان کی تحریک کو قومی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کو صرف علی گڑھ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ جس تحریک کا بیج سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں بویا تھا اس کو شمالی ہندوستان میں پھیلایا۔ مولوی نذیر احمد نے سرسید کی تحریک کو تقویت پہنچانے میں پوری تگ و دو کی اور وقار الملک کے اس خیال کی پیروی کی کہ:

"جس تحریک کو علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ جو کچھ ہو علی گڑھ کی زمین میں ہو۔ بلکہ علی گڑھ کی تحریک میں ہر وہ کام شامل ہے جو حقیقی و کامل و اکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں مفید ہو۔ خواہ کسی صوبے کے مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔" ۹۳

ڈپٹی نذیر احمد زبردست انشاء پرداز اور زبردست خطیب تھے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اپنے بچوں کی تعلیم کی غرض سے شروع کیا اور پہلی تین کتابیں انھیں کے لیے لکھیں۔ اس کے بعد جو بھی کتابیں لکھیں تعلیم کا مقصد ان میں بدستور پیش نظر رہا۔ وہ ایک معلم کا دماغ اور ادیب کا قلم رکھتے تھے۔

نذیر احمد کے خطوط کا مجموعہ "موعظہ حسنہ" کے عنوان سے پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۸۸۷ء میں

شائع ہوا۔ چوتھی بار ۱۹۱۹ء میں برقی پریس دہلی سے عبدالغفور شہباز نے حسب اجازت مولوی بشیر الدین مرتب کیا۔ معین الدین عقیل نے "موعظہ حسنہ" کی اشاعت سے متعلق لکھا ہے:

"اس دور میں ان کے خطوط کے مجموعہ "موعظہ حسنہ" کی چھ اشاعتیں ہوئیں۔ پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۸۸۷ء میں اور چوتھی مرتبہ دہلی سے شائع ہوا۔" ۹۴

ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی نے اپنی کتاب میں نذیر احمد کی تصانیف کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست سے نذیر احمد کے خطوط کے مجموعہ "موعظہ حسنہ" کی آٹھ بار اشاعت کا علم ہوتا ہے۔

فہرست اس طرح ہے:

نمبر شمار	تصانیف مع تراجم مع سال تصنیف	مرتب یا مہتم	مطبع مع سال اشاعت
		مجلس ترقی ادب لاہور	مطبع کا نام نہیں ہے۔
۲	•	منذر احمد نبیرہ نذیر احمد	دلی پرنٹنگ ورکس دہلی آٹھواں اڈیشن
۳	•	منذر احمد نبیرہ نذیر احمد	مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) ۹۵

اس طرح "موعظہ حسنہ" کی آٹھ اشاعتوں کا پتہ چلتا ہے۔

میرے پیش نظر خطوط کا جو مجموعہ ہے وہ ۱۹۱۹ء میں چوتھی مرتبہ شائع ہوا۔ اس کے مرتب عبدالغفور شہباز ہیں۔ "موعظہ حسنہ" کی اشاعت کے سلسلے میں بشیر الدین نے لکھا ہے:

"چونکہ سب خطوں کو میں نے جان کے برابر لگا رکھا تھا۔ لکھنے کا محمود ان کے حوالے کیا۔ اور انھوں ۹۶ نے ہی ان خطوں کو کتاب کی شکل میں مدون کر کے ۱۸۸۷ء میں بلا کسی قسم کے ترمیم و تبدیل کے اصلی حالت میں قومی پریس لکھنؤ سے چھپوایا۔ دوسرے اڈیشن کا مجھے خبر نہیں کہ کب چھپا اور کہاں چھپا۔" ۹۷

تیسرے اڈیشن سے متعلق لکھتے ہیں:

"معلوم ہوا کہ ۱۳۲۱ھ میں تیسرا ایڈیشن نذیر حسین صاحب تاجر کتب کے اہتمام سے نکلا۔ لیکن پھر بھی لکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ کیونکہ ایسے خط جن کے

مضامین بیچنے سے میرے دل پر کاگھر تھے اور جنھیں میں نے حرزِ جان بنا رکھا تھا۔ اب مجھے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔"۹۸

نذیر احمد نے تو والد کے خطوط چھپنے کے بعد بھی نہیں پڑھے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ "موعظہ حسنہ" کی مانگ کثرت سے ہے اور بازار میں کتاب ملتی ہی نہیں۔ تو انھوں نے اسے اپنے اہتمام سے چھپوانے کا قصد کیا اور انھوں نے کاتب کو کتاب لکھنے کے لیے دی۔ جب اس کی کاپیاں تصحیح کو آنے لگیں تو ان خطوط کو چالیس چالیس برس کے بعد پڑھنا پڑا۔ نذیر حسین جو ایک کتب فروش تھے انھوں نے تجارت کی غرض سے اس کتاب کو چھپوایا۔ جب مولوی بشیر الدین نے کاپیاں دیکھیں تو وہ سرتاپا غلطیوں سے بھری پڑی تھیں۔ چوتھی مرتبہ شائع ہونے کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ چوتھا ایڈیشن بالکل اغلاط سے پاک ہے۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ تیسرے ایڈیشن سے پچھتر فی صدی غلطیاں تو اس میں ضرور کم ہیں۔"۹۹

"موعظہ حسنہ" کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۱۹ء کل ایک سو اسی صفحات پر مشتمل ہے۔ خطوط کی تعداد ایک سو چھ ہے۔ پہلا خط ۵ جنوری ۱۸۷۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ زیادہ تر خطوط ۱۸۷۶ء سے ۱۸۷۷ء کے درمیانی عرصہ پر محیط ہیں۔ آخر کے بیشتر خطوط پر سنہ و تاریخ درج نہیں ہے۔ بقول عبدالغفور شہباز:

"مولوی بشیر الدین احمد کے پاس اپنے والد کے بہت سے خطوط ہیں۔ جن میں علمی مباحث ہیں۔ یہ تمام بڑی قدر کی چیزیں ہیں مگر خطوط سب نکال ڈالے۔ صرف نمونے کے طور پر آسان آسان مختار چند ہیں۔"۱۰۰

مجموعہ کے سرورق کے بعد صفحہ نمبر ایک پر دیباچہ ثانی کے عنوان سے عبدالغفور شہباز کا لکھا دیباچہ درج ہے۔ صفحہ نمبر دو سے نو تک تقریظات اور محمد حسین آزاد کا لکھا ہوا ریویو درج ہے۔ صفحہ نو سے گیارہ تک عبدالغفور شہباز کا تحریر کردہ دیباچہ درج ہے۔ خطوط کی شروعات صفحہ نمبر بارہ سے ہوتی ہے۔ عبدالغفور شہباز نے دیباچہ میں لکھا ہے:

"مولوی بشیر الدین احمد صاحب، اپنے والد کے خطوط مجھ کو دکھایا کرتے تھے اور میں ان کو نقل کر لیتا۔ خطوط میں اکثر خانگی حالات تھے اور بہت میں مباحث علمی جو جناب مولوی نذیر احمد خاں صاحب سچا سچا لکھ لکھ کر بھیجتے تھے۔ حذف واستقاط ضروری کے بعد جو کچھ بچا وہ یہ کتاب ہے۔ جو پیش کش ناظرین کی جاتی ہے۔ اس کو چھپوانے سے لوگوں کو یہ دکھانا منظور ہے کہ ایک لائق باپ اپنے لاڈلے بیٹے کو کس طرح پر تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ شفقت تو اس درجے کا ہے کہ سوتے جاگتے سفر میں حضر میں، فرصت میں، اشتغال میں ہر حال میں بیٹے کا تصور نصب العین ہے۔ گویا دنیا عبارت ہے اسی ایک وجود سے مگر تعلیم میں بھی اس بلا کا اہتمام ہے کہ علم ایک لقمہ بنا کر کھلا دیں یا تعویذ بنا کر گھول پلا دیں۔ میں ناظرین کتاب کو جناب مولوی نذیر احمد خاں صاحب کا نمونہ دکھلا کر اولاً حسن تعلیم اور ثانیاً اس خاص طرح کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس کا زمانہ حال متقاضی ہے۔ مقصد اصلی تو یہ ہے اور اگر کوئی طرزِ تحریر اور طریقہ ادائے مطلب سے استفادہ کرے تو روکتی میں۔"۱۰۱

مجموعہ خطوط کے آخر میں صفحہ نمبر ایک سو اکیاسی سے ایک سو تراسی تک خاتمۃ الطبع کے عنوان سے مولوی بشیر الدین کی تحریر درج ہے۔ اس کے مطالعہ سے "موعظہ حسنہ" اور اس کی اشاعت سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔

جیسا کہ مجموعہ کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں پند و نصائح کا عنصر نمایاں ہے۔ ان مکتوبات کے ذریعہ مولوی نذیر احمد اپنے بیٹے کی تربیت چاہتے تھے اور یوں بھی ان کو مواعظ اور اخلاقی تلقین سے گہری دلچسپی تھی۔ ان خطوط کے ذریعہ انھوں نے اخلاق، مذہب اور تعلیم و تربیت کے عمدہ اصولوں کی تلقین کی ہے۔ نذیر احمد کو وعظ کہنے اور تلقین کرنے کا بہت شوق تھا اس لیے ان کے ناولوں کی طرح ان کے خطوط میں بھی مقصدیت کا عنصر نمایاں ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ "موعظہ حسنہ" کے تمام خطوط کے مکتوب الیہ نذیر احمد کے فرزند بشیر الدین ہی ہیں۔ حامد حسن قادری "داستانِ تاریخ اردو" میں لکھتے ہیں:

"ان کا ایک مجموعہ "موعظۂ حسنہ" جو انھوں نے اپنے صاحب زادہ مولوی بشیر الدین کو ان کی تعلیم کے زمانے میں لکھے ہیں۔ ان خطوط میں تعلیمی و مصلحانہ رنگ غالب ہے۔" ۲؎

موعظۂ حسنہ کے علاوہ سات خطوط نقوش کے مکاتیب نمبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئے۔ پہلے دو خطوط نواب سید علی حسین خان بہادر کے نام ہیں۔ خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط انھوں نے انگریز سرکار کی نوکری سے سبکدوشی کے بعد لکھے ہیں۔ پہلا خط کلام انگریزی سے سفارش سے متعلق ہے۔ دوسرا خط نذیر احمد کے قرآن شریف کے ترجمہ کی اشاعت سے متعلق ہے۔ چار خطوط خان بہادر بشیر الدین احمد (اٹاوہ) کے نام ہیں۔ پہلے تین خطوط نہایت مختصر ہیں۔ صرف دو دو سطروں میں لکھے ہوئے ہیں۔ پہلا خط ۲۰ مارچ ۱۹۰۲ء کا ہے۔ دوسرا ۱۰ اپریل ۱۹۰۲ء کا جھانسی سے لکھا ہوا ہے۔ تیسرا خط دلی سے ۲۱ مئی ۱۹۰۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ چوتھا خط ۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں کسی کانفرنس کا ذکر اور اخبار میں چھپے ہوئے ایسے مضامین کی مذمت کرتے ہیں جن سے اسلام کو نقصان پہنچے۔ چاروں خطوط جواہر میوزیم (اسلامیہ کالج اٹاوہ) میں موجود ہے۔ ۳؎

ساتواں خط نذیر احمد نے غالباً نواب محسن الملک کے نام لکھا ہے۔ اس زمانے میں محسن الملک حیدر آباد میں ریونیو سکریٹری تھے۔ ۴؎

معین الدین عقیل نذیر احمد کے خطوط کی انفرادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولوی نذیر احمد کے خطوط کی انفرادیت یہ تھی کہ انھوں نے اسے نصیحت اور ہدایت کا ذریعہ بنایا تھا۔ یہ خطوط انھوں نے اعظم گڑھ، حیدر آباد اور دلی سے اپنے بیٹے بشیر الدین احمد خاں کو لکھے تھے۔ ان کا مقصد بیٹے کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ہدایت تھا۔ بیشتر خطوط درسی مسائل اور تعمیر و اصلاح کردار سے متعلق ہیں اور کچھ اپنے مشاغل، مقامی سیاست کی الجھنوں، اور خانگی زندگی کے

پیچیدہ مسئلوں پر بھی ہیں۔ بعض خط میں قومی زندگی کے اہم مسائل زیر بحث آئے ہیں اور چند خطوط میں انگریزی زبان اور انگریزی تمدن کی تمام خوبیوں اور خامیوں کا ذکر ہے۔" ۵؎

ایسا نہیں ہے کہ "موعظۂ حسنہ" میں شامل خطوط کے مکتوب الیہ صرف بشیر الدین احمد ہی ہیں بلکہ کچھ خطوط نذیر احمد کی زوجہ اور خدمت گار کے نام بھی ہیں۔

مجموعہ "موعظۂ حسنہ" کے خطوط میں اصلاح زبان، شاعری اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق جو تلقین کی گئی ہے اس سے آج کل کے نوجوانوں کی تربیت میں روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ بقول محمد حسین آزاد:

"باپ اپنی اولاد کی اصلاح خیالات و عقائد و خصائل کا بہت بڑا جواب دہ معلم اور اتالیق ہے اور اپنی خدمت سے کبھی پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ باوجود کثرت مشاغل اور اپنی تصانیف بلند و مشکل کے صاحب موعظۂ حسنہ کو اس کی فرصت ملی تھی کہ اپنے پیارے بیٹے کو ایسے مراسلات بھیجا کرتے کیونکہ ان کو اپنی یہ جواب دہی اور اپنے کلام کی قوت تاثیر بخوبی معلوم تھی۔ یہ کتاب لڑکیوں اور بوڑھوں کے پڑھنے کے لائق ہے اور سوائے فائدے کے اس سے کسی طرح کے ضرر کا گمان نہیں ہے۔ یہ مکتوبات گو ایک خاص لڑکے کے لیے لکھے گئے تھے، مگر خدا جانے کتنے ہزار نوجوان اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور کتنوں کے یہ کام آئیں گے۔" ۶؎

ڈپٹی نذیر احمد کا قیام ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۰ء تک ملازمت کے سلسلے میں اعظم گڑھ اور حیدر آباد میں رہا جس کی وجہ سے وہ اپنے خاندان سے علاحدہ رہے۔ اہل خانہ سے دوری کے زمانے کی یہ تحریریں پند و نصیحت کے علاوہ اخلاص و محبت کا نمونہ بھی پیش کرتی ہیں۔ ان کے خیالات و نظریات، جذبات و احساسات کی گرمی بھی ان کے خطوط میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ مجموعہ "موعظۂ حسنہ" میں درد مندانہ، آزادانہ اور حکیمانہ پیرایہ میں مختلف امور کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ بقول محمد حسین آزاد:

"یہ ایک فاضل سن رسیدہ مصنف کے خط ہیں۔ جس نے کاروبار زمانہ کو ہر حال میں دیکھا اور سمجھ کر دیکھا۔ برتا اور سمجھ کر برتا۔ ان میں عبارت آرائی یا ترتیب انشاء کے لیے فرضی مطالب کو فقروں میں نہیں ڈھالا۔ اصلی خط ہیں کہ پیارے باپ نے پیارے فرزند کو سچی ضرورتوں اور واقعی مواقع پر بے تکلف عبارت میں کھلے دل سے تحریر کیے ہیں جو کہ وقت بوقت اور روز بروز خانہ تفنوان میں ہر شریف خدائی کو پیش آتے ہیں۔ اس واسطے تو تیز جوانوں کے لیے نسخہ بے تفرقہ دماغ، پرورش عقل اور ورزش فکر کا۔" [107]

"موعظہ حسنہ" کے خطوط ایسے ہیں جو ایک مشفق باپ نے اپنے بیٹے کو نہایت دل سوزی سے تحریر کیے ہیں۔ فقرے فقرے سے لفظ لفظ سے محبت اور شفقت کی خوشبو ٹپکتی ہے۔ خطوط کیا ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پدرانہ شفقت و کرمت، ہمت افزائی، حوصلہ مندی، فیض و فیضان، تعلیم و تربیت کے غیر معمولی جوش کا ابال ہیں۔ نصیحت آمیز پند و نصائح اور تلقین کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ادب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بشیر الدین احمد کے نام ایک خط میں نذیر احمد لکھتے ہیں:

"علم تو سب طرح کے ہیں اور طالب علم کو لازم ہے کہ سب کی طرف برابر توجہ کرے۔ لیکن سب پر مقدم ادب ہے جس کو انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں۔ یعنی زبان دانی، کمال زبان دانی یہ ہے کہ تم کو اہل زبان کی سی قدرت حاصل ہو۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ زبان دانوں کی عبارتیں یاد ہوں۔ جس طرح کے خیال اور مضمون کو جس پیرایہ میں اہل زبان نے ادا کیا ہے اس کی تعلیم اور اس کی نقل کرنی چاہیے۔ غرض زبان دانی کے لیے یادداشت شرط ہے۔ محاورات اور امثال و حکایات اور علت اور صلوں کا استعمال جن کو تم پوزیشن کہتے ہو سب پیش نظر رہیں۔" [108]

نذیر احمد کے خطوط میں بعض جگہ تعلیمی مسائل پر اظہار خیال ملتا ہے۔ بعض جگہ بیٹے کو یہ سمجھایا ہے کہ انگریزی کس طرح بولنی چاہیے۔ بعض خطوط سبق کے طور پر لکھے گئے ہیں اور ان کا مقصد عربی زبان و ادب کی تدریس ہے۔ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں پر خط لکھنے کے لیے زور دیتے

ہوئے نذیر احمد لکھتے ہیں:

"تم مجھ کو انگریزی میں خط لکھا کرو مگر بالالتزام اس میں کسی سے اصلاح لے کر بھیجا کرو کوئی خاص بات رازکی ہو تو اس کو البتہ عبارت اصلاحی سے خارج رکھو میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ عربی عبارت کی شرح بھی کبھی کبھی لکھ بھیجا کرو کہ مجھ کو معلوم ہو کہ تم کچھ کرتے ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم نے متعلق کے لیے انتظام مناسب کر لیا ہوگا۔" [109]

مولوی نذیر احمد نے انگریزی زبان ملازمت کے دوران سیکھی تھی اور اس پر انھیں فخر تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہو اور دوسرے ضروری علوم کے ساتھ انگریزی زبان میں بھی مہارت حاصل کرے۔ بشیر الدین احمد کے نام ایک خط میں انگریزی زبان پر بحث کی ہے جس سے نذیر احمد کی انگریزی سے واقفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہر انگریزی تلفظ کی صحیح پر تم کو خود توجہ دینی ہوگی اور اس میں شک نہیں کہ جس قدر تم نے مجھ سے پڑھا ہے وہ قابل اطمینان نہیں۔ تم ہی نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ تلفظ میں چنداں اختلافات نہیں نکلتے تاہم جب تک سبق ہوا جب تک تمہارے ماسٹر گفتگو کریں ان کے الفاظ کو کامل غور کے ساتھ سنتے رہو اور خوب خیال رکھو کہ کس لفظ کو کیوں کر ادا کیا ہے۔

انگریزی میں ایکسنٹ بھی ایک بڑی ضروری چیز ہے جس کی طرف تم نے ابھی تک مطلق توجہ نہیں کی اس معنی میں زور دینا یا دبانا۔ مثلاً لبرٹی ایک لفظ ہے اس میں آر پر زور ہے اس کو پکار کر اور مخاطب کو سنا کر اور زور دے کر بولنا ہوتا ہے۔ اس طرح کل الفاظ مرکب ہیں کسی حرف پر ایکسنٹ ضرور ہوتا ہے۔" [110]

خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نذیر احمد اپنے بیٹے کو کن کن مضامین میں معیاری تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مذہبی طبقہ میں انگریزی تعلیم کی شدید مخالفت کی جاتی تھی۔ ان حالات میں ایک ایسا شخص جو مذہبی انسان ہو، مذہبی اصولوں کی ترویج اور مقبولیت کے لیے جس

نے اپنی ساری ادبی زندگی صرف کردی ہو لیکن تعلیم کے معاملے میں انگریزی پر اس قدر زور دے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقت کے تقاضوں اور حالات پر گہری نظر رکھتا ہے۔

بشیر الدین احمد نے اپنے والد نذیر احمد کو انگریزی میں خط تحریر کیا۔ اس خط کی اغلاط پہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں انگریزی داں نہیں ہوں نہ مجھ کو انگریزی کا شوق نہ خدا کے فضل سے انگریزی کی ضرورت۔ لیکن جب ایسی فاش غلطیاں دیکھوں تو کیوں کر صبر کروں۔ تمہارا یہی حال رہا تو میری برسوں کی محنت دلی میں ضائع کر دو گے۔ میں نے تم سے بار بار کہا کہ خطوط کی اصلاح ضروری ہے کسی کو دکھا لیا کرو اور جو اصلاح دے اس کو خیال میں رکھو۔"[۱۱۱]

دہلی کالج کی تعلیم نے نذیر احمد کو مغرب کا رسیا بنا دیا۔ لیکن مغربی تہذیب سے وہ کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ انگریزی کی تعلیم پر ضرور زور دیتے رہے۔ انھوں نے خود انگریزی سیکھی اور علی گڑھ تحریک کی ابتدا سے پہلے ہی، ترجموں کی مہم میں شریک ہوئے تھے۔ ایک خط میں ابتدائی لیاقت کے متعلق لکھتے ہیں:

"مطالعے کی برکت تم کو اس سے ظاہر ہو جائے گی کہ مجھ کو ریڈ صاحب نے تعزیرات ہند کے ترجمے میں شریک کیا تو میری انگریزی استعداد اس قدر ناقص تھی کہ میں پنل کوڈ کی ایک سطر بھی بے مدد ڈکشنری نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور ڈکشنری بھی ویبسٹر کی نہیں بلکہ رومن اسکول ڈکشنری۔ مگر بات کیا تھی کہ طالب علمی کے مطالعے نے فکر کو ایسا فائز بنا دیا تھا کہ الفاظ کی جامعیت و معقولیت پر نظر خوب دوڑتی تھی۔"[۱۱۲]

اس کا مطلب یہ نہیں کہ نذیر احمد انگریز پرست تھے۔ خطوط کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ انگریزی علوم اور انگریزی شاعری کو ضرور پسند کرتے تھے۔ لیکن انگریزی رہن سہن یا طرز تمدن کو بالکل ناپسند کرتے تھے۔ حیدر آباد سے لکھے خطوط سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ انگریز پرست نہیں بلکہ وطن پرست تھے۔ ایک خط میں اپنے بیٹے کو نرا انگریز نہ بننے کی ترغیب دیتے

ہیں۔ لکھتے ہیں:

"بشیر! افسوس اگر تم نے عربی نہ پڑھی۔ یہ عجب چیز ہے۔ نرے انگریزی داں جہاں دیکھے ہے بے تمیز اور صورت سے نا اہل یہ شکل اور نہ دوسروں کی سمجھیں۔"[۱۱۳]

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"انگریزی خوانوں میں بڑا بہت بڑا بہت ہی بڑا نقصان یہ دیکھنے میں آیا کہ ان لوگوں میں مطالعے کا دستور نہیں اور چونکہ طبیعت پر غور و خوض کا بوجھ نہیں ڈالتے ہیں میں نے جہاں تک دیکھا استنباط مطلب میں اکثر خطا کرتے ہیں۔"[۱۱۴]

اچھے مکتوبات کی بنیادی شان یہ بھی ہے کہ ان میں مکتوب نگار کے علاوہ مکتوب الیہ کی سیرت، شخصیت، شعور اور ذوق و شوق کا عکس جھلکتا ہو۔ خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بشیر الدین احمد نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی، کن کن مراحل سے گزرے۔ ان کے نظریات شخصیت کی نمایاں خوبیاں یا بعض شخصی خامیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بشیر الدین احمد کی زبان میں لکنت تھی اس کے متعلق بشیر الدین نے اپنے والد کو خط لکھا تو نذیر احمد نے جس ذہانت اور خوبصورتی کے ساتھ بیٹے کی احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ انداز بیان اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اس میں شوخی و ظرافت کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ مثلاً:

"تم کو معلوم ہے کہ ہمارے خاندان میں لکنت متوارث ہے۔ ہر نسل میں ایک نہ ایک آدمی ضرور ہکلا ہوتا آیا ہے۔ پس یہ لکنت جو تم میں ہے تقاضائے شرافت خاندانی ہے۔ تمہاری لکنت خلقی نہیں ہے۔ گود کھیلو میں تم کو آب سے دور مثلی دکھ ہوا۔ جب تک ڈاکٹر صاحب پہنچیں عورتوں نے اضطرار میں پیاز کے عرق کی جگہ منہ میں پانی نچوڑ دیا۔ بیماری سے اٹھے تو ہکلاتے اٹھے۔ بچوں کی بھی حرکتیں دل کش ہوتی ہے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ تمہارا ان دنوں کا ہکلانا سب کو بھلا معلوم ہوتا تھا۔"[۱۱۵]

خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کے اندر مختلف متضاد رنگ اور قوتیں کام کر رہی تھیں۔ ان کی ذات میں شوخی و ظرافت، طنز و مزاح اور نکتہ بینی کی شیریں اور نرم

لہریں پرسکون انداز میں بہتی محسوس ہوتی ہیں۔ بیٹے کے بچپن کی باتیں کس مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

"ایک دن میں نے تم سے کہا میاں بشیر تم نوکروں میں رو کر گالیاں بکنی یا قسم کھانی یا جھوٹ بولنا سیکھو گے تو ابھی تمہارا منہ سڑ جائے گا۔ اور میں تم کو اپنے ساتھ نہیں سلاؤں گا۔ بچے معصوم تم کو میرے کہنے کا یقین ہو گیا۔ ایک دن تمہاری زبان سے بے ساختہ کوئی بے ہودہ بات نکل اور تم کو فوراً میرا مقولہ یاد آیا تو تم بھاگے ہوئے اپنی والدہ کے پاس گئے کہ اماں بی ذرا میرا منہ سونگھنا۔ ان کو میری نصیحت کا حال معلوم تھا سمجھ گئیں اور بولیں سونگھ کر کیا کروں گی۔ گالیوں کی بساہند چلی آرہی ہے۔ یہ سن کر تم بہت گھبرائے۔ آخر کار انھوں نے استغفار پڑھوا کر لا بچی کے دانے چبوا دیے تب تم کو تسلی ہوئی۔ مگر بہت دنوں تک تم کو اس بد بو کے ڈر سے احتیاط کرتے رہے اور شکر ہے کہ تمہاری زبان گالی سے آشنا نہیں ہوئی۔" ۱۱۶

نذیر احمد کی دیگر تصانیف کی طرح خطوط بھی وعظ و نصیحت سے بھرے پڑے ہیں۔ طویل خطوط اکثر واعظ اور خطیب کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ نذیر احمد کا اصل مقصد مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح تھا اور خطوط کے ذریعہ وہ اپنے بیٹے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ والد اور فرزند کے باہمی تعلقات کی نوعیت جس محبت اور احترام کی متقاضی ہوتی ہے اس کا لحاظ اکثر دونوں کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرتا ہے اور درمیانی دیوار رعب، خوف اور شرم حیا جیسے عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔ نذیر احمد کے خطوط ایک اعلیٰ انسانی وصف کی جانب اشارہ کرتے ہیں جہاں وہ والد بزرگوار کے ساتھ ایک طرح سے یار غم گسار بھی بن جاتے ہیں۔ اور یہ انسانی ہمدردی ایک خوشگوار فضا پیدا کر دیتی ہے۔ جس کے زیر اثر ان کا لہجہ، تخاطب نیز القاب و آداب بے تکلفی کی نقش گری کرتے ہیں۔ مثلاً بشیر اللہ اس مختصر گول "ہ" کے قاعدے کو صاف کر ڈالیں، بشیر الدین کی نسبت سے متعلق نذیر احمد لکھتے ہیں:

"تمہاری سمجھ کے بھروسے میں تم کو یہ خط لکھتا ہوں۔ شرم و حیا شرط ادب و جوہر

شرافت ہے۔ لیکن شرم تین قسم کی ہے۔ شرعی۔ عقلی۔ عرفی۔ شادی بیاہ کے بارے میں جو شرم لوگ کیا کرتے ہیں وہ نہ شرعی ہے نہ عقلی بلکہ محض عرفی رو د رسم دنیا کی پابندی ہے۔ تم کپڑا اور کتاب اور کھانا یہاں تک کہ ٹوپی اور جوتی یعنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں میں ہمیشہ اپنی ذاتی رائے کامل آزادی اور بے باکی کے ساتھ ظاہر کیا کرتے ہو۔ بس کوئی وجہ نہیں کہ ایسے امر اہم کی نسبت جس پر تمہاری دین و دنیا کا بننا بگاڑ منحصر ہے۔ تم سے رائے طلب نہ کی جائے تم شاید یہ حیلہ کرو گے کہ یہ معاملہ مشکل ہے اور مجھ سے ایسے امور عظیمہ کی نسبت رائے دینے کی قابلیت نہیں۔" ۱۱۷

"موعظۂ حسنہ" میں کچھ خطوط جو نذیر احمد نے اپنی بیگم کے نام لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیگم کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ انھوں نے ان کو فارسی میں بھی خط لکھے ہیں۔ خطوط میں اپنی بیگم کو بیوی صاحب ۱۱۸ کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بیوی صاحب کو سلام کے بعد معلوم ہو۔ صاحب کے خط کا ملفوف ہے جس قدر متعلق مطلب نہ تھا۔ اس کو میں نے سرخی سے قلم زد کر دیا ہے۔ خط کی عبارت فارسی ایسی ہے کہ اس کو با آسانی سمجھو گی۔" ۱۱۹

خطوط کے ذریعہ نذیر احمد بے شک بشیر الدین کی اصلاح اور تربیت چاہتے تھے۔ لیکن خطوط سے خط نگار کی سیرت و شخصیت، شعر و ادب سے اس کا لگاؤ نیز اس کے نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایک خط میں انھوں نے اپنے بائبل پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ اپنے بیٹے کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بشیر اب میں بھی سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملا ہوں میں نے پادری صاحب سے بائبل پڑھنا شروع کی ہے۔ افسوس کہ ان کو ہفتے میں دو دن فرصت ہوتی ہے۔ وہ بھی صرف ایک گھنٹے۔" ۱۲۰

مولوی نذیر احمد کو سر سید احمد خاں کے ذاتی عقائد سے اگرچہ اختلاف تھا مگر ان کی تحریک سے نہ صرف وہ دلچسپی رکھتے تھے بلکہ اس میں دل و جان سے شریک بھی تھے۔ نذیر احمد کی مخالف

تصانیف کی طرح خطوط میں بھی ذہنی خیالات اور مذہبی بحثیں پائی جاتی ہیں۔ خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سر سید احمد خاں کے معتقدات سے پورے طور پر متفق نظر نہیں آتے۔

نذیر احمد ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جس طرح کا برتاؤ میں نے سید احمد خاں صاحب کے ساتھ رکھا ہے۔ تم کو اس میں میری رائے کا مستحفظ کر لینا بکھ نہ تھا۔ میں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس بنوایا۔ دو کوئے ہیں دونوں کو چندہ دیا۔ اپنے سارے خاندان کی جالیاں احاطہ مدرسہ میں نصب کرائیں یعنی مدرسۃ العلوم کو مسلمانوں کے لیے مفید اور اس کی تائید کو داخل مثوبات سمجھا اس وقت تک سید احمد خاں صاحب کے اخبار یا تفسیر یا سوانح یا تحریرات کا ایک پرچہ بھی مول نہیں لیا۔ یعنی مجھ کو ان کے معتقدات باسرہا تسلیم نہیں۔ سید احمد خاں صاحب کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر دیوان حافظ کی شرح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔"[۱۲۱]

مذہب سے متعلق ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"میری رائے یہ ہے کہ دنیا میں جتنے دین و مذہب ہیں سب انسان کی اصلاح کی غرض سے جاری ہوئے ہیں۔ اور خصائص وقتی و ملکی کے لحاظ سے سب میں نیکی کے اصول کی رعایت کی گئی ہے۔"[۱۲۲]

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"میں نے برسوں غور کرنے کے بعد اپنے نزدیک اسلام کو ایسا ہی سمجھا ہے جیسا دو اور دو چار اور مدت سے میرا ارادہ ہے کہ اپنے خیالات مذہبی کو مقید بالکتابہ کروں مگر اس وقت تم سے مجھ کو اسی قدر کہنا منظور تھا کہ مذہب کی بابت بری یا بھلی کوئی رائے قائم کرنے میں ہرگز جلدی مت کرنا۔"[۱۲۳]

خط نمبر ۸۵۰ سے کالج کے لیے ایک بورڈنگ ہاؤس، دو کنویں اور خاندان کے نام کی جالیاں بنوانے کا ذکر آیا ہے۔ نذیر احمد کا بنوایا ہوا کمرہ سر سید ہال میں موجود ہے۔ اس طرح

سر سید احمد خاں اور نذیر احمد کے تعلقات کی نوعیت کا تعین ہو سکتا ہے۔ ایک خط میں مدرسے کے قیام کا ذکر کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں نے سید احمد خاں کے کالج کے کاغذات بھی تم کو بھیجے تھے۔ اب سید احمد خاں سے پنشن لی اور بہ نفس نفیس علی گڑھ میں گے ضرور ہے کہ اب مدرسے کا انتظام بہ انحاء احسن ہوتا جائے سید احمد خاں کو اسکالرشپ بہت مل گئی ہے اور یہ جلب رغبات کا اچھا ذریعہ ہے۔"[۱۲۴]

خطوط کے مجموعہ "مواعظ حسنہ" سے سائنٹفک سوسائٹی کے لیے نذیر احمد کے براہ راست کام کرنے کی تو کوئی مثال نہیں ملتی لیکن ان کے ۱۱ رجولائی ۱۸۶۴ء کے ایک غیر مطبوعہ خط کے ذریعہ سر سید احمد خاں کے لیے ترجمہ کا کام کرنے کا پتہ لگتا ہے۔ ایک غیر مطبوعہ خط میں نذیر احمد لکھتے ہیں:

"میری درخواست یہ ہے کہ ۲۰۰ روپیہ کے عوض مجھ سے کوئی خدمت ترجمہ تالیف یا انتخاب۔ اور یہ خدمت اس ترجمہ کے علاوہ ہوگی جس کا میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔"[۱۲۵]

نذیر احمد انگریز پرست نہیں تھے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کی ترقیوں کا اپنے لکچروں میں جہاں فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے وہیں خطوط کے مطالعہ سے ان کے کرب کا احساس ہوتا ہے۔ حیدرآباد سے لکھے گئے خطوط جن میں خودداری اور معاشرت کے متعلق بیانات ملتے ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کی آزادی کے لیے کس قدر بے چین رہتے تھے۔ ان خطوط میں اس وقت کا نقشہ بعض جزئیات کے ساتھ ان مکتوبات میں مل جاتا ہے۔ حیدرآباد کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے علاوہ اپنی ملازمت سے متعلق نشیب و فراز کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ حیدرآباد شہر کی تہذیبی مرقع کشی اور تاریخی کوائف کا ذکر بھی خطوط میں آیا ہے۔ غیر شعوری طور پر ہی سہی اپنے عہد کی جھلکیاں اپنے خطوط میں پیش کر دیتے ہیں لکھتے ہیں:

"جہاں اب ہوں حقیقت میں ایک نئی دنیا ہے۔ حیدرآباد میں ۷ اپریل کو پہنچ گیا تھا۔ دوسرے روز ہز ایکسیلنسی نواب سر سالار جنگ بہادر سے ملا۔ مدار المہام

219-218

اور مختار الملک اور نواب صاحب اور سرکار عبارت ہے نواب سرسالار جنگ بہادر سے اور حضور اور بندگان عالی حضور نظام سے۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے ساز و سامان اور تزک و احتشام دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ دلی اور لکھنؤ عروج میں اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا۔ شہر میں جا کر دیکھو تو سارے ہجوم کے تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں اور پھر ہجوم بھی نقل مزدوروں بھیک مانگنے والوں کا نہیں بلکہ نوابوں اور سرکاروں کا جن کی اردلی میں پلٹنیں اور رسالے اور ہاتھی دوڑ آتے ہیں۔ سرکار کے محلوں میں جا کر یک سا ہو جاتا ہوں۔" ۱۲۷

حیدرآباد کی زندگی کی یہ مرقع کشی اس جاگیردارانہ نظام کے بہترین دور کی یادگار ہے۔ نذیر احمد نے اس پر تفصیل سے تو نہیں لکھا لیکن خطوط کے مطالعہ سے جاگیردارانہ نظام سے واقفیت ضرور ہوتی ہے:

"جاگیرداروں میں سب سے بڑے جاگیردار امیر کبیر ہیں جن کے خاندان میں حضور کی صاحب زادیاں بیاہی جاتی ہیں۔ ان کی جاگیر کو لوگ ساٹھ لاکھ روپیہ سال کی بیان کرتے ہیں۔ ان سے اتر کر اکثر مسلمان اور بعض ہندو اور بہت جاگیردار ہیں۔ صرف خاص اور جاگیرات نکل کر جو ملک بچا وہ دیوانی کہلاتا ہے یعنی متعلق بہ دیوان وزیر۔" ۱۲۸

نذیر احمد کا ذوق علم آخری وقت تک قائم رہا۔ دوسروں کو سکھانے کے ساتھ ساتھ خود بھی سیکھتے رہے۔ خطوط ان کے علمی مزاج اور ادبی معیار پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ انشا پردازی کے معاملے میں نذیر احمد کے خیالات اور سرسید کے لسانی و ادبی طرز فکر کا جیتا جاگتا عکس پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ہم خیالی مضمون کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور آخر تک سوائے چکنی چپڑی باتیں بنانے اور جھوٹے آداب، جھوٹے اشتیاق، جھوٹی تشبیہات، جھوٹے استعارات، ہمارا علم انشا ہے۔ شاعری جو کمال انشا ہے اس میں معشوق دو فرض کیے گئے ہیں جن کے کر نہیں۔ منہ نہیں۔ جن کی زلفیں سلسلہ مشتاق سے زیادہ

دراز۔ جن کے سرین پہاڑ۔ اگر ایسے معشوق کہیں نظر پڑ جائیں تو لوگ ان کو بلا اور بھوت سمجھیں۔ انگریزی شاعری کو دیکھو بالکل نیچر کے مطابق۔ مبالغے اور جھوٹ کا نام نہیں۔ جس چیز کے حالات سے کسی علم میں بحث کرتے ہیں اس کو اس علم کا موضوع لہ کہتے ہیں۔" ۱۲۹

حالی، آزاد اور سرسید کی تحریروں میں نذیر احمد کے ان خیالات کی پرچھائی دیکھی جا سکتی ہے۔ حقیقت پسندی کے مقابلے میں مبالغہ آرائی سے اختلاف اپنے طور پر کوئی بری بات نہیں ہے لیکن مبالغہ تو ہر اچھے آرٹ کا لازمی حصہ ہے۔ مبالغہ کو اگر فنکارانہ سلیقے اور خوبصورت طریقے سے استعمال کیا جائے تو مبالغہ کوئی بری چیز نہیں۔ مبالغہ کے ذریعے جو تصویر پیش کی جاتی ہے اس میں نمایاں خد و خال کے بجائے حسین تصورات کا عکس ہوتا ہے۔ نذیر احمد نے اپنے خط میں جو کچھ کہا اس کے ذریعہ ہم ان کے ذہن کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور ان کے زمانے کے فنی اور فکری نقطۂ نظر کو بھی۔

سرسید احمد خاں اور نذیر احمد کے تعلقات میں گہرائی "مراۃ العروس" کی اشاعت کے بعد ہوئی اور ایک دوسرے سے خاص وابستگی کالج کے قیام کے سلسلے میں ہوئی۔ محسن الملک (مہدی علی خاں) سے بھی ان کے تعلقات مخلصانہ اور برادرانہ تھے۔ ابتدا میں جب نذیر احمد کی ملاقات محسن الملک سے ہوئی تو محسن الملک سے ایک قابل اعتراض فعل سرزد ہو گیا۔ اس کو نذیر احمد نے خاموشی کے ساتھ برداشت کیا لیکن دل کی بے قراری اور کرب کا اظہار اپنے بیٹے سے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

"شاید سرسالار جنگ بہادر وزیر حیدرآباد نے سید صاحب سے پانچ چھ آدمی طلب کیے۔ انھوں نے ان کو بھیج دیا۔ وہاں جا کر مولوی مہدی علی صاحب کی شاید ہزار روپیہ تنخواہ ہوئی اب سنا ہے کہ معتمد مال الہام مقرر ہوئے ہیں۔ میں نے مولوی مہدی علی صاحب کو اپنی عمر میں صرف ایک بار آگرہ میں دیکھا جن دنوں مجھ کو "مراۃ العروس" کا انعام آگرہ میں ملنے والا تھا۔ مولوی مہدی علی صاحب ڈیوک آف اڈنبرا کو لینے گئے تھے۔ وہیں سے مجھ کو بلا تعارف بڑے تپاک کا خط لکھا اور بہت اصرار کیا کہ آگرہ میں میرے مکان پر ٹھیرنا۔ چنانچہ

جوں ہی ریل سے اترا مولوی مہدی صاحب کے رشتہ مند مجھ کو کشاں کشاں اپنے گھر لے گئے۔ اور بہت مدارت کی مگر مولوی مہدی علی صاحب وہاں نہ تھے۔ لیکن نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو آگرہ سے واپس کیا۔ اور آگرے کے دربار میں بلایا۔ وہاں منشی غلام غوث صاحب میر منشی لفٹنٹ کے یہاں میں نے مولوی مہدی صاحب کو دیکھا ایک جوان تیکھا بانکا نہ "مراۃ العروس" کی قلعی اڑا رہے ہیں۔ جو میں خیمے میں پہنچا منشی غلام غوث صاحب نے کہا لیجئے حضرت "مراۃ العروس" کے مصنف بھی تشریف لائے۔ منشی غلام غوث صاحب کی تقریب سے ہم دونوں ملے تو مولوی مہدی علی صاحب خفیف سے رہے۔ شاید قلعی اڑانے سے کچھ پچھتے ہوں۔ مجھ کو حیرت ہوئی الحاصلین یہ وہی مہدی علی ہیں جنھوں نے خود مجھ کو کس تپاک سے اپنے گھر ٹھیرایا تھا کہ اب اشتاق میری کتاب کی تفضیح کر رہے ہیں۔"۱۳۰

مولوی نذیر احمد اعظم گڑھ کی ملازمت سے دو سال کی رخصت لے کر پہلی اپریل ۱۸۷۷ء کو حیدر آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ۲۷ اپریل کو حیدر آباد پہنچ کر نواب محسن الملک کی کوٹھی پر قیام کیا۔ ان کے ہمراہ ان کے داماد احمد حسین اور بہنوئی رفیع الدین بھی تھے۔ ان دونوں کو بھی ملازمتیں دی گئیں۔ مولوی نذیر احمد کی درخواست پر سالار جنگ نے محسن الملک کو ہدایت کی کہ ان کے بیٹے مولوی بشیر الدین اور دوسرے عزیزوں کو مناسب ملازمتوں پر نامزد کیا جائے۔ اسی تعلق سے ایک خط میں مہدی علی خاں کے احسان مند نظر آتے ہیں:

"ہر ملک کے سیکڑوں ہزاروں بڑے بڑے لائق برسوں سے پڑے مارتے پھرتے ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں اور چونکہ یہ ایک بہت بڑی ہے۔ خلق خدا ہر چہار طرف سے ٹوٹ پڑی ہے۔ پھر یہاں کی کل فرمائے قیامت ہے۔ وعدہ اور حکم کوئی چیز نہیں۔ یہ بھی نواب صاحب کی قدر دانی اور مولوی مہدی علی صاحب کی مہربانی تھی کہ اور فی الاصل مجھ پر احسان کرنا منظور تھا کہ میرے عزیزوں کو عہدوں پر نامزد کر دیا ورنہ یہاں کون پوچھتا تھا۔"۱۳۱

اس طرح ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے متضاد بیانات ملتے ہیں اور کسی خاص نتیجے پر پہنچنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت میں پیچیدگی نظر آتی ہے۔ کسی خط میں عربی پڑھنے پر زور دیتے ہیں تو کسی میں انگریزی، کسی میں فارسی زبان کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ کہیں انگریزی رہن سہن کو اور ان کی ترقیوں سے مرعوب نظر آتے ہیں تو کہیں ہندوستانی تہذیب کو فوقیت دیتے ہیں۔ کسی خط میں عورتوں پر مردوں کو برتری دیتے تو کہیں خاندان کی عورتوں کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ بقول سید ضمیر حسن دہلوی:

"وہ بیک وقت قدامت پسند اور جدت پسند دونوں تھے۔ ان کا مرکب مزاج ان کی مرکب زبان میں ظاہر ہوا۔"۱۳۲

نذیر احمد کے خطوط کے اسلوب میں بھی ان کے دیگر تصانیف کی طرح پھیلاؤ ملتا ہے۔ طویل خطوط کی تعداد مختصر خطوط کے مقابلے زیادہ ہے "موعظہ حسنہ" میں مختصر خطوط بھی شامل ہیں لیکن بیشتر خطوط اتنے طویل ہیں کہ خطبے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ نذیر احمد نے اپنی شگفتگی اور زندہ دلی سے اس پھیلاؤ یا طوالت کو بے کیف نہیں ہونے دیتے۔ خطیبانہ انداز ان کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ سید ضمیر احمد دہلوی لکھتے ہیں۔

"خطابت نذیر احمد کی شخصیت کا جوہر تھا۔ اور خطیبانہ گھن گرج نذیر احمد کے اسلوب کی بھی خصوصیت ہے۔ ایک فقرے کے بعد دوسرا فقرہ، پھر تیسرا فقرہ، پھر چوتھا فقرہ، بات کی وضاحت، مقصد کے حصول اور دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے پے در پے مسلسل پر زور اور پر جوش فقروں سے ایک ہی مطلب کو پیش کرنا خطیب اور انشاپرداز نذیر احمد کی تقریر و تحریر دونوں کا جوہر ہے۔"۱۳۳

خطوط میں القاب و آداب بہت ہی مختصر ہیں اکثر خطوط بغیر القاب کے ہی شروع کر دیتے ہیں۔ حفظ مراتب کا خیال بھی رکھا ہے۔ نذیر احمد کے اسلوب کی بنیادی ساخت سادہ نہیں ہے۔ ان کے خطوط کا انداز تحریر نہ سادہ اور سلیس ہے اور نہ ہی مشکل ہے۔ مولوی نذیر احمد کو محاوروں کے استعمال کا بہت شوق تھا۔ بے تکلف مراسلت کا راز نہ صرف ابتدا، خاتمہ اور رسمی انداز نگارش میں ہی

پنہاں ہے بلکہ سادگی اور پرکاری سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ باہمی گفتگو کا انداز اور اس میں بافصیح محاورے ایسی تحریروں کو حسین بنانے میں خصوصیت سے حصہ لیتے ہیں۔

> ''نذیر احمد نے محاوروں کے استعمال سے بہت فائدے اٹھائے ہیں ان کی مدد سے زندگی کی عمدہ تصویریں، اجتماعی مناظر کے نقش ظرافت کے، رچے ہوئے انداز تلقین وعظ کے خلاق ڈھنگ، قہر وعتاب، ڈانٹ ڈپٹ، غرض لہجے کی پوری پوری ترجمانی کی ہے۔''[۱۴۳]

محاورات کے علاوہ نذیر احمد نے خطوط میں انگریزی، عربی وفارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ کبھی کبھی آدھی انگریزی اور آدھی اردو میں خط لکھے ہیں۔ سارا خط فارسی میں بھی لکھا ہے۔

نذیر احمد نے اپنے خطوط میں فقہی اصلاحات، عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال کیا جس سے تحریروں میں غرابت اور اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو طبقے ان کے مخاطب ہیں یا خطوط کے قارئین کے لیے نا قابل فہم نہ سہی لیکن نامانوس ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کے استعمال کی طرف تو ہم اس وقت کے اکثر ادیبوں کو مائل پاتے ہیں۔ یہ انگریزی علوم کے وسیلے سے حاصل شدہ معلومات کا ہی نتیجہ ہے اور اس میں مرعوبیت کو بھی دخل ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نذیر احمد کا قیام مشرقی یوپی میں رہا اس لیے وہاں کی بولی ٹھولی کا اثر ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

بظاہر ''موعظہ حسنہ'' کے تمام خطوط ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ ان کا موضوع بھی کسی نہ کسی طور پر 'مواعظ حسنہ' کے تحت آتا ہے۔ اگرچہ نذیر احمد نے خطوط کو تحریر کرتے وقت اپنے اور اپنے بیٹے کے ذہنی کوائف کی نیز اپنے ماحول کی تصویر کشی بڑی چابک دستی سے کی ہے۔ خطوط میں نذیر احمد کے تنقیدی ذہن کی جھلکیاں جگہ جگہ مل جاتی ہیں۔ خطوط میں پند ونصائح کے علاوہ مختلف رشتوں کی پہلوداری بھی موجود ہے۔ بیوی کے نام خطوط میں فنی خوبیوں کے ساتھ فکری خوبیاں بھی نمایاں ہیں۔ ان خطوط میں اپنے دیگر بیٹوں کا ذکر، مرحوم بچوں کا ذکر، بیٹے بشیر الدین احمد کی شادی کی فکر اور شادی جلدی کرانے پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد اتنی کفایت شعاری سے

کام لیتے تھے کہ بخیل مشہور ہو گئے تھے اس بات کا ذکر بھی ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ اس گھڑی کا ذکر جو ان کو I.P.C. کے ترجمہ کے سلسلے میں انعام کے طور پر ملی تھی۔ سفر کا شہروں کا، ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنی بدلی کا، موسم کا، بارش نہ ہونے سے قحط کا، اخباروں کا، سمندر کا اور اپنے دوستوں کا ذکر خطوط میں کرتے ہیں۔ اس طرح موضوعات کا تنوع ان کے خطوط کو یکسانیت کی فضا سے باہر لے آیا ہے اور خطوط میں مختلف رنگ پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ رنگ نذیر احمد کی گوناگوں دلچسپیوں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

''موعظہ حسنہ'' کے خطوط سے اگر ثقیل محاورات کا استعمال اور بھاری بھرکم عربی وفارسی کی شمولیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ خطوط سرسید احمد خاں کے عہد کے مکتوباتی ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ ان کی زندگی میں تین جہتیں تھیں۔ ایک وہ جس کا تعلق ان کی معاشرتی زندگی اور روایات سے تھا۔ انھوں نے محاورے اور دہلی کی ٹکسالی زبان کو بار بار استعمال کیا۔ ان کی علمی زندگی کی دوسری جہت ان کے ترجمہ قرآن اور مذہبی تحریروں میں ملتی ہے۔ تیسری جہت ان کے مواعظ اور مذہبی لیکچروں کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ انھیں تینوں جہتوں کے اثرات ان کے خطوط پر بھی مرتب ہوئے۔



نواب محسن الملک

(سید مہدی علی خاں)

نواب محسن الملک سرسید احمد خاں کے ایسے مقلد اور ہم خیال تھے جنھیں سرسید نے محب و محبوب کے لقب سے ممتاز کیا۔ محسن الملک نے نہ صرف سیاسی امور میں بلکہ علمی کاموں میں بھی سرسید احمد خاں کی مدد کی۔ سائنٹفک سوسائٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لیا "خطبات احمدیہ" کی تالیف میں ہاتھ بٹایا اور "تہذیب الاخلاق" میں سرسید احمد خاں کے بعد سب سے زیادہ مضامین لکھے۔ وہ سرسید کے مشن کے ایک اہم رکن، موثر مبلغ اور مؤید تھے۔ سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ بقول سید محمد ہاشم:

> "سرسید کے انتقال کے بعد محسن الملک کی سرپرستی ختم ہوگئی تھی اور یوں تو انفرادی طور پر اس وقت تک انھوں نے ہزاروں کام کیے تھے لیکن سرسید کی مرکزیت کا خیال ہر وقت دل میں جاں گزیں رہتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد بھی انجمن میں تھے۔ لیکن خود کو تنہا محسوس کرتے تھے۔ سکریٹری کی حیثیت سے سرسید کی جانشینی تو سید محمود نے کی لیکن چند ماہ بعد ہی یہ ذمہ داری محسن الملک کے سر آگئی۔ انھوں نے ہمت ہارنے کے بجائے نئے عزم اور حوصلے سے کام کیا۔"[۳۵]

نواب محسن الملک نوابوں کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ کوئی امیر و کبیر تھے۔ وہ ایک معمولی آدمی تھے۔ اپنی محنت اور قابلیت کی بنا پر ترقی کر کے شہرت کے درجۂ کمال تک پہنچے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو ہر ذاتی سے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی زندگی دس

روپیہ ماہانہ سے شروع ہوئی اور تین ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ تک پہنچی۔

نواب محسن الملک نے کثرت سے کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ زمانۂ تحصیل داری کے دو کتابچے "قانون مال" اور "قانون فوج داری" ہیں۔ ایک ابتدائی دور کی تصنیف "میلاد نامہ" ہے۔ اس کے علاوہ تقلید بالحدیث، کتاب الحب والشوق (غزالی) مسلمانوں کی تہذیب، آیات بینات، مضامین تہذیب الاخلاق، مکمل مجموعہ لکچرز، مکاتیب اور ان کی "باقیات الصالحات" ہیں۔ بقول سید عبداللہ:

> "سرسید کے احباب میں محسن الملک نے کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ مگر انھوں نے تاریخ اور مطالعہ تاریخ سے دلچسپی ضرور لی۔ اس کا ثبوت ان کے مضامین میں موجود ہے۔ انھوں نے "مقدمہ ابن خلدون پر ریویو لکھے جن میں مقدمہ کے ان اصولوں کو نمایاں کیا جن میں تاریخ اور عقل و فطرت کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔"[۳۶]

عہد سرسید احمد خاں کے مکتوب نگاروں میں محسن الملک کے جو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

محسن الملک اور وقار الملک کے مکاتیب مرتبہ محمد امین زبیری۔

مجموعہ "مکاتیب" یہ مجموعہ شمسی پریس آگرہ سے باہتمام منشی محمد نثر الدین خاں طبع ہوا۔ یہ مجموعہ مکاتیب ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول کے مکاتیب محسن الملک کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے سرورق پر درج ہے کہ یہ خطوط بنام وقار الملک ہیں۔ لیکن مجموعے کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقار الملک کے علاوہ دیگر احباب کے نام بھی خطوط لکھے گئے ہیں۔ مثلاً: مولوی سید حسن بلگرامی، عماد الملک، مولوی عبداللہ جان صاحب وکیل سہارن پور، ایڈیٹر البشیر اٹاوہ، مولوی بشیر الدین صاحب، شجاعت علی بیگ صاحب کلکتہ، انوار احمد صاحب زبیری مارہروی، ابوالحسن، مولوی انظام الدین، منشی سید منصب علی صاحب، حاجی محمد موسیٰ خاں اور آخری تین خطوط بنام طلبائے مدرسۃ العلوم ہیں۔

حصہ اول کے خطوط کی تعداد ایک سو دس ہے جو زمانی اعتبار سے ۱۵ر اگست ۱۸۸۳ء تا

۱۵ راگست ۱۹۰۷ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ صفحہ اول پر نواب محسن الملک کی تصویر اور خط کا عکس بھی موجود ہے۔

مجموعہ "مکاتیب" حصہ دوم کے خطوط وقار الملک کے لکھے ہوئے ہیں۔ ابتدا میں درج ہے کہ خطوط کے مکتوب الیہ سرسید احمد خاں ہیں۔ خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خطوط کے مکتوب الیہم سرسید کے علاوہ دیگر حضرات بھی ہیں۔ حصہ دوم کے صفحہ اول پر وقار الملک کے خط کا عکس اور تصویر بھی موجود ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ خطوط ۵ راگست ۱۸۸۲ء سے ۱۳ رجنوری ۱۹۱۳ء کے درمیانی عرصہ میں لکھے گئے ہیں:

مکاتیب الخلان فی التفسیر علوم قرآن

مکاتیب کے اس مجموعہ میں سرسید احمد خاں اور محسن الملک کے اصول التفسیر اور علوم القرآن سے متعلق گیارہ خطوط شامل ہیں۔ تفسیر القرآن سے متعلق خطوط کا یہ مجموعہ محمد عثمان مقبول نے مطبع محمدی علی گڑھ سے یکم فروری ۱۹۱۵ء میں چھپوایا۔ بقول ثریا حسین:

> "رسالہ تحریر فی اصول التفسیر، مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی ۱۸۹۲ء میں طبع ہوا۔ ابتدا میں سید احمد خاں نے رسالہ مذکور کا تعارف دیا ہے۔ پھر محسن الملک کے تفسیر سے متعلق دو خط مورخہ ۹ راگست اور ۱۹ رستمبر ۱۸۹۲ء شامل ہیں جن کے جواب میں سید احمد خاں نے اپنے اصول تفسیر بیان کیے ہیں۔ آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:
>
> "میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے اور آپ سے مکاتبات ہوں صرف متعلق تفسیر اور وہ بطور رسالے کے جمع کیے جاویں اور اس کا نام "مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن" رکھا جاوے۔" ۳۷

نواب محسن الملک نے نئے انداز نظر یا نئے طریق کار کی اہمیت بھی جتائی ہے۔ کئی امور میں سرسید احمد خاں کی تائید کی ہے تو بعض امور میں اختلاف بھی کیا ہے اور یہ اختلاف خط کتابت کی شکل میں کافی دیر تک جاری رہا۔ یہی مراسلت "مکاتیب الخلان" کے نام سے مرتب شدہ موجود

ہیں۔ ان میں محسن الملک سرسید احمد خاں کے مقابلے میں قدیم روایت کے زیادہ قریب ہیں اور جدیدیت سے قدرے ہٹے ہوئے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے محسن الملک کے حدیث، فقہ، تفسیر، علم الکلام اور دیگر کتابوں پر علمی وادبی عمق کا پتہ چلتا ہے۔ خطوط سے ان کے ذوق اور تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نواب محسن الملک کے تینتیس خطوط نقوش کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوئے۔ یہ خطوط زمانی اعتبار سے ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۷ کے درمیان میں لکھے گئے۔ ان کے مکتوب الیہم منشی ذکاء اللہ، انتصار الملک بہادر، مولوی بشیر الدین، نواب سید علی حسین، مولوی نظام الدین حسن، نواب افسر الدولہ بہادر، وقار الملک، منشی منصب علی خاں وغیرہ ہیں۔ سب سے زیادہ خطوط مولوی بشیر الدین کے نام لکھے ہیں جن کی تعداد بارہ ہے۔

اسلوب کے اعتبار سے ان خطوط میں سادہ بے تکلف اور محاوراتی رنگ موجود ہے۔ خطوط میں محاوراتی رنگ یا روزمرہ محاورات کا استعمال اپنے فطری انداز میں موجود ہے۔ خطوط میں ادبیت کی چاشنی یا فن کا جادو جگانے کی کوشش نہیں ملتی بلکہ تمام خطوط مقصد کی ترسیل کے لیے لکھے گئے ہیں۔

نواب محسن الملک نے خطوط کیوں کہ ضرورتاً لکھے ہیں اس لیے القاب وآداب مختصر ہیں۔ مثلاً مخدوم، مخدومنا، بندہ، جناب من وغیرہ۔ مکتوب الیہ کے مرتبے اور علمی لیاقت کے علاوہ شخصیت کے پیش نظر القاب وآداب لکھے ہیں۔ دو جملوں میں موضوع کو قید کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ لیکن کچھ خطوط طویل بھی ہیں۔ الفاظ خوش نما اور طرز تخاطب شیریں ہے۔ خطوط میں اردو کے علاوہ فارسی اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

مجموعہ "مکاتیب" میں ابتدائی دور کے خطوط حیدرآباد سے لکھے گئے ہیں۔ خطوط کا مطالعہ اس دور کی حیدرآبادی فضا اور دیگر معاصرانہ احوال وکوائف کے نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ معاصرین کے فکر وکردار کی جھلکیاں اور دیگر افراد سے ان کے تعلقات کا اندازہ خطوط کے مطالعے سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

حیدرآباد سے لکھے شروع کے خطوط کا لب ولہجہ شکوہ آمیز ہے۔ وقار الملک کے نام لکھے ایک

خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت مجھے لوگوں نے بے انتہا رنج پہنچائے اور نہایت درجے کی تکلیفیں دیں اور میری عزت لینی چاہی مگر مجھے کسی سے رنج نہیں ہے اور نہ میں نے کسی سے شکایت کی۔ کوئی ذات کا پاجی تھا کوئی بدنفس تھا کوئی کمینہ تھا اور میں اپنا ذاتی دوست کسی کو نہ جانتا تھا اگر ایسے پاجیوں نے وقت پا کر اپنے طبع کی طرف خیال کیا تو وہ کیا جو دنیا داروں کو کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے لیے ان سے رنج ہوا پھر جاتا رہا۔ کیونکہ شکایت "شکایت رابود شرطے آشنائی" نہ میں نے کسی سے شکایت کی اور نہ ان کے روبرو ان کو گلہ کیا، مجھے حق کیا تھا جو کرتا۔ مجھ کیا کہ وہ دوست نہیں تھے۔ ملاقاتی تھے، اپنی ضرورت کے وقت ملے، جدا ہو گئے۔ مگر مولوی مشتاق حسین تم اس برس ایک طور پر رہے ہم کو ہر حال اور ہر وقت میں اپنا پایا اور مددگار پایا۔"[۱۳۸]

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"جو کارروائی آپ نے اخیر کو کی اس نے میرا دل توڑ دیا۔"[۱۳۹]

نواب محسن الملک انگریزوں کی مداخلت پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے برعکس نواب وقار الملک انگریزوں کی دخل اندازی کو ناپسند کرتے تھے۔ خطوط کے مطالعے سے اس بات کا علم ہوتا کہ محسن الملک کہتے تھے کہ میں انگریزوں کی مداخلت ناپسند کرتا ہوں لیکن ہمیشہ اس مداخلت کو دعوت دیتے رہے۔ اس کی مثال ایک خط کے ذریعے دی جا سکتی ہے جس میں وقار الملک کو لکھتے ہیں:

"بہر حال حالات حیدرآباد کے اب ایسے ہو گئے ہیں کہ میں اب جدا ہونا ہی پسند کرتا ہوں۔ مسٹر فلز پیٹرک ریزیڈنٹ تشریف لائے ایک ملاقات مجھ سے بھی ہوئی۔ تین گھنٹے برابر گفتگو ہوئی۔ میں نے ایک طور سے اپنے ارادے کا ذکر کر دیا۔ مگر اس پر میں نے زیادہ زور نہیں دیا۔ اس لیے کہ میں ایسے معاملات میں ریزیڈنٹ صاحب کو تکلیف دینا نہیں چاہتا میں صرف اپنی گورنمنٹ ہی سے تعلق رکھنا چاہتا ہوں۔"[۱۴۰]

محسن الملک کی اس عادت کی وجہ سے وقار الملک ان سے بدظن رہتے تھے۔ ان کی اس عادت سے متعلق ایک خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشتاق احمد لکھتے ہیں:

"اس کی بہترین مثال ان کا خط نمبر ۱۲۹ ہے جس میں ایک طرف تو وقار الملک کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ میں موجودہ حالات سے مجبور ہو کر ملازمت سے دست کشی کا ارادہ کر رہا ہوں اور اس کے بارے میں ریذیڈنسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ مگر دوسری طرف وہ ایک ایسے ریذیڈنٹ سے کہ جو نیا نیا یہاں آیا ہے شاید پہلی ہی ملاقات میں اسی مسئلہ کو لے بیٹھتے ہیں۔"[۱۴۱]

خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بزرگوں میں اختلافات رہتے تھے مگر سیاسی امور سے متعلق اختلافات کے باوجود دونوں بزرگ ایک دوسرے کے گرویدہ بھی نظر آتے ہیں۔ ایک خط میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے وقار الملک سے شکوہ کرتے ہیں لیکن بعد میں معافی بھی مانگ لیتے ہیں:

"جو بگمان واقعات سے میں سمجھا میری غلط فہمی تھی تو میں پھر آپ کے دو لفظوں کو کہ "تم غلط سمجھے" قبول کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ اور اس کے بعد میرے دل میں خیال نہ رہے گا اور میں سمجھوں گا کہ جیسے آپ میرے دوست تھے ویسے ہی ہیں اور جو کچھ میں سمجھا تھا وہ میری غلطی تھی اور چونکہ میں نے روبرو آپ سے کہا اور جسے آپ بھی یقیناً وجہ کمال کی محبت کا نتیجہ سمجھے ہوں گے۔ اس کی معافی چاہتا ہوں آپ ہی کا مقولہ ہے کہ ہزار غلطیاں اور سو گناہ دشمنوں کے آدمی معاف کر دیتا ہے۔ کیا دوست کا ایک گناہ بھی معاف نہ کیا جاوے آپ مجھے معاف کیجیے۔"[۱۴۲]

محسن الملک کے خطوط میں مختلف شہروں اور ممالک کے سفر اور قیام کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً شملہ، اٹاوہ، علی گڑھ، مدراس، بمبئی اور بیرون ممالک میں پیرس، لندن وغیرہ۔ محسن الملک کے حیدرآباد میں قیام کے دوران انگلستان کی ایک چالاک جماعت نے ایک کمپنی تشکیل کر کے مملکت نظام کی معدنیات کا ٹھیکہ ایسی شرائط اور معاہدہ پر حاصل کر لیا جو بدنیتی اور چالاکی پر مبنی تھیں۔ محسن الملک

نے ان سب چالاکیوں اور بدنیتوں کا انکشاف کیا۔اس انکشاف سے انگلستان میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور پارلیمنٹ میں سوالات کیے گئے۔آخرکار اس کی تحقیقات کے لیے ایک پارلیمنٹری کمیٹی کا انعقاد ہوا اور سرکار نظام کی طرف سے نواب محسن الملک مع چند مشیر کے کئی مہینے کے لیے لندن بھیجے گئے وہاں سے لکھے خطوط مجموعہ ''مکاتیب'' میں شامل ہیں۔لندن سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''انڈیا آفس میں اب تک کوئی برخیال تو سرکار کی اس کارروائی کی نسبت پایا نہیں جاتا۔مگر کمیٹی کے تقرر میں ان کو اپنے مصالح کے لحاظ سے کچھ تردد ہو۔۔۔ ہم کو معلوم نہیں،صرف قیاس سے اس کا احتمال ہو سکتا ہے۔'' [۱۴۳]

اسی خط میں حیدرآباد کے نواب سر آسمان جاہ کی نسبت لکھتے ہیں:

''نواب صاحب کی نسبت یہاں عمدہ خیالات ہیں،یہاں عموماً لوگ ان کو پسند کرتے ہیں اور ان کے اخلاق مزاج کے بہت مداح ہیں۔'' [۱۴۴]

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

''ہمارے حضور پرنور کی نسبت یہاں اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی رائے ہے کہ حضرت لندن میں تشریف لاویں،حضرت کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ ان کے ذہن اور ذکاوت کے بڑے مداح ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت کو یورپ کے سفر سے بہت فائدہ ہوگا۔میری بھی یہی رائے ہے کہ اگر حضرت کا یہاں آنا ہو تو آپ یقین کریں کہ یہاں کے لوگ بڑی محبت سے پیش آئیں گے۔اور عام لوگ تو پرستش کرنے لگیں گے۔'' [۱۴۵]

''مجموعہ مکاتیب'' کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ نواب محسن الملک نے لندن میں قیام کے دوران مختلف سوسائٹیوں اور جلسوں میں شرکت کی۔اعلیٰ طبقوں کی دعوتوں میں مدعو کیے گئے اور کئی تقریریں بھی کیں۔تعلیم گاہوں کو دیکھا،کیمبرج کنووکیشن میں شرکت کی۔مختلف مقامات کی سیر و تفریح کی۔ہندوستان کے سابق حاکموں کے ساتھ دوستانہ ملاقاتیں کیں۔لندن سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرے ساتھ سب لوگ اچھی طرح پیش آتے ہیں۔مگر میں خود کم آتا جاتا ہوں۔ جناب سر جان گاسٹ صاحب تشریف لائے تھے اور سر ٹامس ڈائل اور سر جان اسٹریچی اور ان کے ساتھ بعض ذی وقعت لوگ بھی تشریف لا چکے ہیں۔ یہ آنا ان کی خوشی سے ہوا نہ میں نے کوئی آرزو ان کے سامنے پیش کی تھی۔میں کیمبرج گیا تھا اور محمد احمد کو بہت اچھی طرح پایا۔درحقیقت انھوں نے اپنی لیاقت کو بڑھایا ہے اور استعداد میں ترقی کی ہے اور اچھی طرح رہتے ہیں۔'' [۱۴۶]

خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب محسن الملک نے پیرس کا سفر بھی کیا۔پیرس سے اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب! آپ میری بیوی کو خوب سمجھا دینا۔اور خود جا کر ان کی تسلی کر دینا کہ ڈاکٹروں نے اس مرض کو لاعلاج نہیں کہا،بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ابتدائی حالت ہے اور امید ہے کہ دوا کی ہوا فائدہ کرے گی۔ یہ جگہ گرم ہے اور پارہ ۳۰ درجہ پر ہے بہ نسبت لندن کے یہاں میرا مزاج درست ہے۔اور غالباً ایک ہفتہ میں اور درست ہو جاوے۔مگر وہم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ صحت سے بالکل مایوس ہو گئی ہے۔اور یہ بات دل میں جم گئی ہے کہ چھ مہینے کے اندر مر جاؤں گا۔'' [۱۴۷]

لندن میں چھ مہینے کے قیام کے بعد محسن الملک وطن واپس آئے اور جس مشن پر گئے تھے اس میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے سر ولیم ڈیوڈ فارن سکریٹری نے محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

''ہر شخص کو اس سے اتفاق ہے کہ آپ نے انگلستان میں اپنا کام نہایت قابل تعریف اور دور اندیشی اور دانش مندی کے ساتھ انجام دیا ہے۔اور جو کچھ آپ پر اعتماد کیا گیا تھا آپ نے پوری طرح اس کو نباہا۔'' [۱۴۸]

نواب وقار الملک کے نام لکھے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں ریاستی امور میں علی گڑھ میں کالج کے معاملات میں دونوں میں اختلاف رہتا تھا لیکن دونوں کے ذاتی تعلقات نہایت خوشگوار

رہتے تھے۔ پیرس سے لکھے ایک خط میں نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب سچ جانو تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم سے زیادہ کسی کو بھی حیدر آباد میں اپنا دوست نہیں سمجھتا۔ تم نے شروع سے اب تک جو کچھ محبت اور دوستی میرے ساتھ کی ہے اس کا میں شکر گزار ہوں۔ خدا کے سامنے اس کی تعریف کروں گا۔ اور جو کچھ سرکاری کام میں کبھی اختلاف لائے ہوا وہ درست تھا۔ ہم دونوں نیک نیتی سے سرکاری کام اور سرکاری فائدہ کے لیے لڑتے جھگڑتے تھے اور اگر زندہ رہے تو آئندہ بھی لڑیں گے اور جھگڑیں گے۔''۱۴۹

خطوط مکتوب نگار کی سیرت اور شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اچھے خط کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس سے مکتوب الیہ کی سیرت اور شخصیت پر بھی روشنی پڑے۔ لندن سے بیماری کے دوران لکھے خطوط کے مطالعے سے محسن الملک کو نواب وقار الملک سے جو محبت اور اعتماد تھا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی وقار الملک کی سیرت اور شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وقار الملک کے نام محسن الملک ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگر میں مرجاؤں تو میں اپنے سارے خاندان کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اتنا یقین ہے کہ کوئی حقیقی بھائی بھی میرے ساتھ اور میرے خاندان والوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے گا جیسا کہ تم کرو گے ہم دونوں کی غلطی کچھ ہی ہو اور سرکاری کام میں کیسی ہی لڑائی جھگڑا ہو جاوے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ آپ اشراف ہیں اور مجھ سے دلی محبت رکھتے ہیں اور حیدر آباد کی دنیا میں کوئی دوست تم سے بڑھ کر نہیں ہے۔''۱۵۰

حیدر آباد میں ریاستی امور میں اختلاف کے علاوہ علی گڑھ میں بھی کالج کے معاملات میں دونوں کے درمیان اختلافات رہتے تھے۔ ایک خط میں آپسی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے محسن الملک لکھتے ہیں:

''جہاں تک میرا اور آپ کی ذات کا تعلق ہے ہم دونوں میں کالج کے معاملات میں کسی بڑے اختلاف کا ہونا شاذ اور نادر ہے۔''۱۵۱

انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۸۹۳ء تک نواب محسن الملک حیدر آباد میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے لیکن بدقسمتی سے امیر اور عہدہ داروں کی رقابتیں جو کچھ عرصے پہلے دبی ہوئی تھیں، ابھرنے لگیں۔ اس سے پہلے اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نظام الملک جو والیِ ریاست تھے، ان کے تعلقات وزیر عماد السلطنت سالار جنگ ثانی سے کشیدہ ہو گئے۔ ریذیڈنٹ جو عملی اعتبار سے اعلیٰ حضرت کا نگراں بھی تھا، اس کی شہ پر عماد الملک کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے جب انھیں وزارت سے برطرف کرنا چاہا تو ریذیڈنسی نے کھل کر اعتماد الملک کی حمایت کا اعلان کیا۔ محسن الملک دونوں کے ملازم تھے۔ اس وقت محسن الملک نے دونوں فریقوں کے درمیان مفاہمت کرا کے جھگڑا ختم کرا دیا تھا۔ لیکن یہ رقابتیں دوسری مرتبہ پوری قوت کے ساتھ ابھریں اور خطرناک صورت اختیار کرلی۔ نواب محسن الملک اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے اور انھیں مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میری حالت سب سے زیادہ ذلت اور خواری کی ہے۔ اور میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر میں نوکر ہوں نہ غلام جو آزاد نہ ہو سکے۔
میں نہیں چاہتا کہ نواب صاحب مہربان ہوں اعتماد کریں اور مجھے کام دیں، میں چاہتا ہوں وہ جو ہر نوکر استحقاقاً مانگ سکتا ہے۔ اس سے انکار اگر برو اخلاق و مروت ہے تو اس کی معافی ہو چکی اگر وہ مہربانی و عنایت ہے وہ در حقیقت ہے نہیں۔''۱۵۲

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

''اگر مجرم ہوں تو سزا دیجیے، اگر گناہ کیا تو قید کر دیجیے۔ بہر حال کچھ تو کیجیے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ زخم کے اندر پیپ ہو اور اندر سے سڑ کر گلا جائے اور اوپر ریشم کا کپڑا مرہم کے نام سے رکھا جاوے اور بیمار زخم کے درد کو اس ریشمی کپڑے کے رکھنے سے بھول جاوے۔''۱۵۳

حیدر آباد میں نواب محسن الملک کا وظیفہ منظور کر لیا گیا اور آٹھ سو روپیہ ماہوار کی پنشن عطا کی گئی۔ ایک خط میں اپنے لیے وظیفہ کی کوشش کرنے کی درخواست کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ ایسی کوشش کریں کہ آپ میرا وظیفہ قبول کرادیں اور اسی کی سعی کریں۔"۱۵۴

حیدرآباد سے نواب محسن الملک ۱۸۹۳ء میں مستقل طور پر علی گڑھ آ گئے اور سرسید احمد خاں کی سرپرستی میں علی گڑھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے توسط سے قومی خدمات انجام دیتے رہے۔ خطوط کے مطالعے سے ان کی خدمات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

نواب محسن الملک کے تعلقات سرسید احمد خاں سے ۱۸۶۳ء میں اس وقت قائم ہوئے جب وہ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر بنے۔ اس وقت سے آخری وقت تک محبت اور عقیدت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ لیکن مذہبی معاملات میں بحث و تکرار بھی ہوتی تھی۔ لیکن سرسید احمد خاں کی عقلیت اور نیچر کے صحیح ترجمان اور اصل شارح اور سرسیدؒ مشن کے اصلی نمائندہ کی حیثیت سے ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرسید احمد خاں کی تحریروں سے پیدا ہوئے مغالطے اور ابہامات کو محسن الملک نے اپنے واضح نقطۂ نظر اور صاف ستھرے، شگفتہ و دلنشیں طرزِ تحریر سے دور کرنے کی کوشش کی۔ سرسید کے اندازِ فکر سے اختلاف رکھتے تھے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ سے زیادہ سرسید کا جاننے والا ان کی عزت کرنے والا، ان کی خوبیوں کا سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں، لیکن ۱۸۶۳ء سے ان کے آخری دم تک میرے اور مرحوم کے درمیان بحث و تکرار قائم رہی۔ چنانچہ ان کی زندگی کے آخری دور میں بھی ایک مضامین کا سلسلہ عرصہ دراز تک بطور خط و کتابت کے جاری رہا۔"۱۵۵

سرسید احمد خاں اور محسن الملک کے درمیان تعلقات کا اندازہ سرسید احمد خاں کے قیامِ انگلستان کے زمانے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ انگلستان میں بیٹھ کر "خطبات احمدیہ" لکھتے وقت سرسید احمد خاں کو جن اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا محسن الملک کی بدولت ان پر قابو پایا جا سکا۔ اس کام میں انھوں نے زبردست اعانت کی۔ احادیث و تفاسیر کے اقتباسات بھیجے اور اہم مسائل میں مشورے دیے۔ سرسید احمد خاں نے جو خطوط محسن الملک کو لکھے ہیں۔ ان سے سرسید احمد خاں کے جذبے اور اعتماد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط مجموعہ "خطوط سرسید" میں شائع ہو چکے ہیں۔

علی گڑھ آنے کے بعد بیشتر خطوط میں مدرسۃ العلوم کی تعمیر اس کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کے دل میں قوم کی خدمت کے جذبے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لیے خود مالی امداد کی اور دوسرے لوگوں سے بھی چندہ جمع کیا۔ چندہ جمع کرنے کے لیے انھوں نے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ رنگون جانے کا ذکر کرتے ہوئے انوار احمد زبیری مارہروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اودھ کی تمام امیدوں کو ترک کر کے صرف تمہارے بلانے اور اصرار کرنے سے محض اس لیے کہ تم نے اپنے دورہ از مقام پہنچ کر کالج کی بہبودی کے لیے کوشش کی ہے۔ رنگون آتا ہوں۔ میرے ساتھ ایک ڈاکٹر مولوی شاہ سلیمان پھلواری والے اور مولوی بشیر الدین بھی ہوں گے۔ خدمت گار علاحدہ۔ روانگی کی اطلاع تار کے ذریعے سے دوبارہ دوں گا۔ اب دیکھتا ہوں وہاں سے کیا ملے گا۔ اگر تین ہزار بھی نہ ملے تو ہم جہاز کے کھانے میں رہیں گے۔"۱۵۶

محسن الملک کے مجموعہ لیکچرز کے علاوہ ان کے خطوط کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے خطیب اور مقرر تھے۔ بقول سید محمد ہاشم:

"ان کی تقاریر مخصوص امتیاز اور احساس کی حامل ہیں۔ خطابت کا جوش ادبی نیرنگیوں کے شانِ کمال کے ساتھ سامعہ و باصرہ کو بیک وقت معطر کرتا تھا۔ کوئی دلخراش موضوع زیرِ بحث آ جاتا تو موجیں مارتے ہوئے دریا اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح تلاطم خیزی آ جاتی تھی۔"۱۵۷

"مجموعہ مکاتیب" میں شامل ایک خط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ وقار الملک سے اپنی اسپیچ کے لیے مشورہ یا اصلاح لیا کرتے تھے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں اپنی اسپیچ بھیجتا ہوں۔ میں خود اسے آپ کے پاس بھیجنے کے لیے ارادہ کر رہا تھا، مگر خوب ہوا کہ آپ نے دیکھنے کے لیے مانگ لی۔ اگر آپ میری اسپیچ میں کچھ کم و بیش کرنا چاہیں تو خوشی سے کر دیجیے۔ یہ بات کہ جو کچھ کہا جاوے وہ بجنسہ لکھا بھی جاوے مجھ سے آدمی کے لیے بہت مشکل ہے۔

اسپیچ میں آپ کو استادی کا پورا حق دیتا ہوں۔ اصلاح کر دیجیے گا۔" ۱۵۸

نواب محسن الملک کے خطوط میں ان کی سیرت اور شخصیت کو صاف طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے مخصوص اور مدلل انداز، رنگ طبیعت اور سرسیدیت کا بھرپور اثر ان کے خطوط میں نمایاں ہے۔ نواب محسن الملک نے ۱۰ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو بمبئی سے ایک خط لکھا، جس میں ایجوکیشنل کانفرنس کی اصلاح و ترقی کے لیے اچھی آرا پیش کی ہیں۔

ایک خط میں کانفرنس یا مجلس کی ترقی کے لیے پریشان ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس مجلس کا ترقی نہ کرنا، بلکہ روز بروز اس میں تنزل ہونا ایک حیرت انگیز معاملہ ہے۔ مگر میرے نزدیک کوئی اور بڑا قوی سبب اس کا سوائے اس کے نہیں ہے کہ وقت سے پیشتر مجلس کے مقام اور مجلس کی کارروائی سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جب بہت ہی تھوڑا وقت رہ جاتا ہے تب لوگوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں مقام پر اس کا اجلاس ہوگا۔ اور چونکہ دوسرے لوگ اس کی اشاعت میں اور اس میں شریک ہونے کے لیے ترغیب دینے کی تدبیریں نہیں کرتے اس لیے چند پرانے ارکان اور چند مدرسے کے طلبا اور چند وزیٹر کے علاوہ باہر سے نئے لوگ نہیں آتے اور یہی اس کے کہ رزولیشن بہت کم پیش کیے جاتے ہیں۔" ۱۵۹

اس کے خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب محسن الملک کو سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک سے بہت محبت تھی۔ ۱۸۸۶ء میں جب سرسید احمد خاں نے کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی تو نواب محسن الملک نے اس تحریک کو دل سے خوش آمدید کہا۔ سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد بھی کانفرنس کے جلسوں میں شرکت کرتے رہے اور دیگر افراد کو بھی شرکت کی دعوت دیتے رہے۔ سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد پہلا اجلاس لاہور میں دسمبر ۱۸۹۸ء میں منعقد ہوا۔ اسی کانفرنس سے متعلق ایک خط میں وقار الملک کو لکھتے ہیں:

"مسودہ پے بنک بنگال حیدرآباد سے آئے تھے۔ وہ اسی روز میں نے بیرسٹر صاحب کے پاس جمع کرا دیے۔ میں ۲۲ دسمبر کو لاہور جانا چاہتا ہوں۔ آپ کا

کیا ارادہ ہے۔ کانفرنس میں شریک ہونا آپ کا ممکن ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکے تو ضرور شریک ہو جیے گا۔" ۱۶۰

"مکاتیب" میں شامل بیشتر خطوط میں مدرسۃ العلوم کی فلاح و بہبودی، کانفرنس کے جلسوں کے لیے چندہ جمع کرنا، کانفرنس کے جلسوں میں اپنے رفقا کو شرکت کی دعوت دینا اور اس کی کامیابی کے لیے کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کے خیالات کو ایک مرکز پر لانے کا ذریعہ وہ اسی کانفرنس کو سمجھتے تھے۔

محسن الملک جس وقت مدرسۃ العلوم کے معتمد تھے، اسی درمیان طلبا نے اسٹرائک کر دی۔ اسٹرائک کا محسن الملک کو سخت صدمہ ہوا کہ اس سے کبھی عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ اسٹرائک کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے محبوب عالم لکھتے ہیں:

"نواب صاحب کے زمانے ہی میں نمائش کے موقع پر طلبا اور پولیس میں تصادم ہو گیا۔ طلبا کا دعویٰ تھا کہ اس میں قصور سراسر پولیس کا تھا۔ اور ان پر خواہ مخواہ زیادتی ہوئی ہے۔ ادھر پولیس جو انگریز سپرنٹنڈنٹ کے ماتحت تھی۔ طلبا کو سزاوارِ الزام ٹھہراتی تھی۔ آرچبولڈ پرنسپل تھے۔ وہ پولیس کے حامی ہوں یا نہ ہوں لیکن انگریزی سپرنٹنڈنٹ کے ہم نوا ضرور تھے اور ان کے خیال میں زیادتی طلبا کی تھی۔ اگر وہ درمیان میں نہ ہوتے تو یہ تنازعہ نواب صاحب کی عقل رسا کی بدولت خوش اسلوبی سے طے ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ لڑکوں کا یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ پولیس کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملنی چاہیے۔ تاکہ وہ آئندہ لڑکوں پر دست درازی نہ کرے۔ نواب صاحب اس زمانے میں سخت پریشان تھے۔ طلبا کو بہت سمجھایا۔ ان کے والدین اور سرپرستوں کو بہت پُر درد خطوط لکھے لیکن وہ کسی طرح ہموار نہ ہوئے۔" ۱۶۱

امین زبیری اسٹرائک کے تعلق سے اس طرح رقمطراز ہیں:

"پیچیدگیوں اور مشکلات میں بجائے کمی ہونے کے اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اور اسٹاف کے تعلق سے انتہائی خرابی آ گئی۔ باہمی اعتماد، ہمدردی اور شفقت و ادب

زائل ہو گیا اور اس کا نتیجہ طلبا کی ایک خطرناک اسٹرائک کی صورت ہی نکلا۔" ۱۹۲

طلبا کی اسٹرائک کے واقعہ نے نواب محسن الملک کو بہت صدمہ پہنچایا۔ انھوں نے طلبا کے بڑھتے ہوئے ہیجان کو اپنے دلکش اور موثر خطوط سے روکا۔ طلبا کو نہایت شفقت اور ہمدردی کے ساتھ ان کی غلطیاں سمجھائیں۔ اطاعت اور ادب پر مائل کیا۔ طلبا کے نام خطوط مجموعہ "مکاتیب" میں شامل ہیں لکھتے ہیں:

"میرے پیارے عزیز طالب علمان مدرسۃ العلوم اگرچہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اور جو کچھ مجھے اور ٹرسٹیوں کو ضابطہ کرنا تھا وہ کر دیا۔ اب کوئی موقع نصیحت اور ہدایت کا باقی نہیں رہا۔ جتنے لڑکے باہر سے آئے تھے وہ جہاں تک ان سے ممکن تھا۔ اپنا فرض ادا کر گئے اور جو کچھ ان کو سمجھانا تھا وہ سمجھا کر مایوس اور شکستہ خاطر واپس چلے گئے اور آخری فیصلہ جس میں ذرا بھی ترمیم نہیں ہو سکتی لکھ کر تمہاری اطلاع کے لیے بھیج دیا گیا۔ اب تم کو سمجھانا اور سکھانا مناسب ہے اور نہ مفید نہ اس کی ضرورت ہے۔ مگر میرا کمبخت دل نہیں مانتا۔ اور جو مصیبت تمہارے اوپر آنے والی ہے اور جسے دو روز کے بعد تم سمجھو گے۔ اس کے خیال سے میری طبیعت نہیں مانتی کہ آخری الوداع کرتے ہوئے تم کو تمہاری غلطیوں پر متنبہ کروں اور جس آگ میں تم گر رہے ہو اس میں گرنے سے نہ روکوں۔" ۱۹۳

طلبا کے نام خطوط بہت طویل ہیں اور ان خطوط میں وہ ایک خطیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور اس واقعہ سے ان کو جو رنج و غم پہنچا اس کا اندازہ ان کے ان درد بھرے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ خطوط پر درد ہونے کے ساتھ ان سے شفقت، محبت، غصہ، عاجزی و انکساری اور افسوس کا عکس نظر آتا ہے۔ جملوں میں تکلف اور بے تکلفی کا امتزاج ہے۔

نواب محسن الملک کا دل محبت اور نیکی کا سرچشمہ تھا۔ آخرکار طلبا نے ان کے سامنے ایک تحریر کے ذریعہ معذرت اور ندامت کا اظہار کیا اور طلبا نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس

موقع پر طلبا کے نام لکھے خط میں طلبا کو جس انداز سے مخاطب کیا ہے اس سے ان کے دلی لگاؤ کا پتا چلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"کیا یہ تحریر طالب علموں کی ہے یا جعلی ہے۔ اگر طالب علموں کی لکھی ہے تو میں ہزار ہزار لاکھ لاکھ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آخر ان کی فطری اور اصلی سعادت مندی نے اپنا اثر کیا۔ اور کچھ غلطی کر کے پھر سنبھل گئے۔ اللہ ایسی غلطیوں کو معاف کرتا ہے ہم بھی معاف کرتے ہیں۔ میں اپنے عزیز طالب علموں کو ملامت نہیں کرتا کہ ان کے اصلی خیالات سعادت مندی کے جاتے رہے اور وہ مثل لوگوں کے اپنی اصلی پالیسی چھوڑ بیٹھے، کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی کچھ ظاہر ہوا مگر آخر اصلی جوہر نے اپنا ظہور کیا اور سعادت مندی اور شریفانہ فیصلے نے اپنا اثر کیا۔ اس خط نے مجھے نہایت خوش کیا اور میری چار روز کی تکلیف کو دور کیا۔ خدا میرے عزیز طالب علموں کی عمر دراز کرے۔" ۱۹۴

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"مجھے پہلے سے بڑھ کر اپنا مددگار سمجھو اور آئندہ کے لیے ذرا خوف و اندیشہ نہ کرو۔ میں تمہارا حامی اور تمہارا سرپرست ہوں۔ اور خدا گواہ ہے کہ میں تمہاری عزت تمہاری بہبودی تمہاری فلاح ویسی ہی چاہتا ہوں جیسے کوئی اپنے بچوں اور اپنے بیٹوں کی چاہتا ہے۔ مجھے اس چار روز میں بہت رنج پہنچا۔ تم نے میری بیماری کی خوب دوا کی تم نے میری محنتوں اور محبت کی خوب قدر کی مگر میں سب بھول گیا، تمہاری اس آخر شریفانہ کارروائی نے میری سب تکلیفات دور کر دیں۔" ۱۹۵

سرسید احمد خاں کے وہ خطوط جو انھوں نے لندن سے نواب محسن الملک کے نام لکھے ان سے محسن الملک کے سیاسی شعور یا سیاست میں ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد مسلمانوں کی ایک تنظیم کی ضرورت بڑھتی جا رہی تھی اور خاموش رہنے کی پالیسی کو خطرناک سمجھا جانے لگا۔ نواب وقار الملک نے اس سمت میں پیش قدمی کی اور مسلمانوں کا ایک

241-240

جلسہ ۳۱،۳۰ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ بالآخر سہارنپور میں ہوئے عام اجلاس میں جولائی ۱۹۰۳ء میں "محمڈن پولیٹیکل ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا۔ محسن الملک اس کے صرف ممبر تھے، وقار الملک کے نام خط میں پولیٹکل ایسوسی ایشن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بہت جلد آپ پولیٹکل ایسوسی ایشن کا کام شروع کرنے والے ہیں۔"۱۹۷

"دیگر مسلمان لیڈروں نے بھی محسن الملک سے اس بات کے لیے رجوع کیا کہ وہ وائسرائے ہند کو مسلمانوں کے خیالات سے آگاہ کریں۔"۱۹۸

اس کے بعد نواب محسن الملک نے کالج کے پرنسپل کے نام ایک خط لکھا، جو شملہ میں گرمی کی چھٹیاں گزار رہے تھے۔ ۳ راگست ۱۹۰۶ء کو لکھے اس خط میں محسن الملک لکھتے ہیں:

"آپ اس امر سے باخبر ہیں کہ مسلمان پہلے ہی سے ذرا مایوسی محسوس کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوان تعلیم یافتہ مسلمانوں میں "کانگریس" سے ہمدردی پائی جاتی ہے۔"

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"مجھے کئی خطوط ملے ہیں جو میری توجہ کو خصوصی طور پر لیجسلیٹو کونسلوں میں منتخب نمائندوں کی نئی تجویز کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ قاعدے کے تحت مسلمانوں کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ اور کوئی بھی مسلمان کونسلوں میں الیکشن کے ذریعے شامل نہیں ہوسکتا... اگر نئے قاعدے کے مطابق... زیادہ وسیع پیمانے پر الیکشن کرائے گئے تو مسلمانوں کو بڑی مشکل سے ایک جگہ ملے گی اور کوئی مسلمان الیکشن کے ذریعے کونسلوں میں شامل نہیں ہوسکے گا۔"۱۹۹

محسن الملک نے پرنسپل آرچبولڈ سے معلوم کیا کہ مسلمانوں کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ وائسرائے ہند سے اس بات کی اجازت حاصل کرلیں کہ مسلمانوں کا ایک وفد اس مسئلے کو لے کر لارڈ منٹو سے ملنا چاہتا ہے۔ محسن الملک کو اس بات کی اجازت مل گئی اور یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو دن کے گیارہ بجے شملہ میں ملنا طے پایا۔ وفد میں شرکت کی غرض سے ممبران کے انتخاب کی ذمہ داری نواب

محسن الملک کو سونپی گئی۔ اسی سلسلہ کا ایک خط ملاحظہ کیجیے:

"جن مسلمانوں سے اس کام میں شرکت کی درخواست کی گئی ہے اور جن کے پاس میں نے خط بھیجے ہیں، ان کی فہرست کل بھیجی جائیں گی اور جن کو آپ مناسب سمجھیں بھیج دیں۔ اور میں نے اپنے نام سے بھجوا بھیج دیے ہیں۔ کیوں کہ جو جواب آئیں گے، وہ سب سکریٹری پولیٹکل ایسوسی ایشن کے دفتر میں دیے جائیں گے، اور ان لوگوں کی فہرست تیار کرلی جاوے گی جنھوں نے شرکت منظور کی ہے۔ اب یہ باتیں تصفیہ طلب ہیں۔"۲۰۰

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو نواب محسن الملک نے شملہ میں ایک وفد کے ساتھ لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور ان کے سامنے ایک ایڈریس پیش کیا۔ جس میں مسلمانوں کے تمام قومی مطالبات کو دلائل کے ساتھ درج کیا تھا۔ محسن الملک کے اس کارنامے کی کامیابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مظہر حسین لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ڈیپوٹیشن نے ایک طرف گورنمنٹ سے مسلمانوں کے حقوق تسلیم کرائے اور دوسری طرف مسلمان پبلک میں اپنے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کا احساس پیدا ہوا۔ غرض نواب صاحب کا یہ کارنامہ مسلمانوں کی پولیٹکل تاریخ میں روشن اور ضیا بار رہے گا۔"۲۰۱

۱۸ راپریل ۱۹۰۰ء کو پنڈت مدن موہن مالویہ کی قیادت میں ہندو تعلیم یافتہ طبقہ امرا کے ہندی آندولن کاریوں نے اودھ اور شمال مغربی صوبے کے لیفٹنٹ گورنر انتونی پیٹرک میکڈانل سے مل کر ہندی کو بھی سرکاری کاروباری زبان تسلیم کرالیا۔ اس سے اردو کے حامیوں میں غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ نواب محسن الملک بھی اردو کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔ اس سلسلے میں محسن الملک کے مکان پر ۱۲ رمئی ۱۹۰۰ء کو تعلیم یافتہ طبقہ کا چھوٹا سا اجلاس ہوا۔ اس جلسے میں نواب محسن الملک کو مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجلاس طلب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کے لیے "اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" قائم ہوئی۔ نواب محسن الملک کے خطوط میں اردو سے محبت کا اظہار ملتا ہے کالج کے حساب کی نسبت لکھتے ہیں:

"حساب کی نسبت اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ اب وہ بہت صاف اور باقاعدہ ہے۔
مگر صرف انگریزی میں ہونا اس کا کافی نہیں ہے۔ صرف انگریزی میں ہونے
کے یہ معنی ہیں کہ اگر کوئی ٹرسٹی اردو داں اس کو دیکھنا اور سمجھنا چاہے تو نہ دیکھ سکے
اور نہ سمجھ سکے۔ اس لیے اردو میں اس کا رہنا ہر حال میں ضروری ہے۔ میں اس
بجٹ کے اوپر رائے لکھتے وقت اس رائے کو ظاہر کروں گا۔ اور نہ صرف اسی قدر
بلکہ یہ بھی ٹرسٹیوں کے اجلاس میں جو رائے یا تجویز یا کیفیت پیش کی جاوے وہ
صرف انگریزی میں نہ ہو بلکہ اس کا ترجمہ بھی اردو میں پیش کیا جاوے۔"[24]

نواب محسن الملک کے خطوط کے ذریعے اس دور کے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور خاص طور سے سرسید احمد خاں کی تحریک کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ یہ ایک حساس مکتوب نگار کے خطوط ہیں جو ایک طرف تو اس کی شخصیت کے تہاں خانے میں خاموشی سے اپنے اسرار و رموز کی جلوہ گری کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کے عہد اور ماحول کی، اپنے بہت سے چھوٹے بڑے حادثوں اور ہنگاموں کے عمل اور رد عمل کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ان خطوط میں عام بول چال کی زبان کا رنگ و آہنگ ہے۔ ان کے توسط سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے ذاتی تعلقات نیز ایک دوسرے کے تئیں اس تعلق کی نوعیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ نواب محسن الملک کے ان خطوط میں ایسے سوانحی اشارے بھی ملتے ہیں جس سے ان کی سوانح مرتب کرنے میں کافی مدد ملے گی۔ یہ خطوط ایسا مصدقہ ریکارڈ ہیں جن سے اخذ و استفادہ کر کے ان کی سیرت و شخصیت کی سچی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔



الطاف حسین حالؔی

الطاف حسین حالی اور سرسید احمد خاں انیسویں صدی کی وہ بلند تر ہستیاں ہیں جنھوں نے عمر بھر ملک و قوم، علم و ادب، دین و مذہب کی جو غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں، ان کے ذکر کے لیے ضخیم کتابیں بھی ناکافی ہیں۔

حالی کی ذات صلاحیتوں کا مجموعہ تھی۔ وہ شاعر، ادیب، نثر نگار، مصلح، ناقد، سوانح نگار سب کچھ تھے۔ اور انھوں نے ہر جگہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ ایک طرف تو قرآن پاک ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ دوسری طرف مشرقی شاعری بالخصوص فارسی اور اردو شعرا کے کلام کے بہترین نمونے ذہن میں گردش کرتے رہتے تھے۔

الطاف حسین حالی کا شاعری، تنقید، سوانح نگاری کے میدان میں جو مقام ہے اس سے سب واقف ہیں لیکن حالی کی مکتوب نگاری پر کوئی سیر حاصل تبصرہ نہیں ہوا ہے۔ حالی کے خطوط اپنی سادگی اور پر خلوص انداز کی وجہ سے خاص کشش رکھتے ہیں۔ حالی اپنی تحریروں میں اگر روتے ہوئے نظر آتے ہیں تو صرف آنکھیں نم کرنے کی حد تک اور ہنستے ہیں تو زیر لب مسکرانے تک۔ حالی اپنے خطوط میں ایک سیدھے سچے انسان کی حیات کا عکس نظر آتے ہیں۔ خطوط میں نہ علمیت کی نمائش ہے اور نہ انداز بیان کے جادو جگانے کی خواہش نظر آتی ہے۔ خطوط میں جو بات کہی گئی ہے نہایت سادگی اور خلوص کے ساتھ۔ فن خطوط نگاری کی یہی وہ اہم خصوصیت ہے جس کے باعث ایک ایک خط ادبی شہ پارے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ کیونکہ سادگی کی وجہ سے مکتوبات اور دیگر اصناف ادب میں فرق قائم ہو جاتا ہے۔

خطوط حالؔی کے تین مجموعے دستیاب ہیں:

۱۔ مکتوباتِ حالی (حصہ اول) مرتبہ سجاد حسین

۲۔ مکتوباتِ حالی (حصہ دوم) مرتبہ سجاد حسین

مکتوباتِ حالی: مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مکتوباتِ حالی (حصہ اول) مرتبہ سجاد حسین۔ اس مجموعہ میں دو سو بیس مکتوبات درج ہیں۔ یہ خطوط زمانی اعتبار سے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۴ء کے عرصہ پر محیط ہیں۔ یہ تمام خطوط نواب وقار الملک انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین کے نام ہیں۔ مقدمہ مولوی عبد الحق نے لکھا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

مکتوباتِ حالی (جلد دوم) اس مجموعہ میں پانچ سو بائیس خطوط ہیں۔ مجموعہ چار سو ستاون پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں حالی کے بھتیجے تصدق حسین کے نام اکیاسی اور حالی کے چھوٹے فرزند سجاد حسین کے نام چار سو اکتالیس خطوط درج ہیں۔ خطوط ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۳ء کے عرصہ پر محیط ہیں۔ دونوں جلدوں کا کاغذ ہلکے بادامی رنگ کا ہے۔ صالحہ عابد حسین ان کے خطوط کے مجموعوں "مکتوباتِ حالی" کے متعلق لکھتی ہیں:

"حالی کے خطوط کے دو مجموعے مکتوباتِ حالی کے نام سے ۱۹۲۵ء میں حالی پریس پانی پت نے شائع کیے تھے۔ جو اب دستیاب نہیں ہے۔ اب تو یہ مجموعہ جیسا بھی چھپا تھا نایاب ہے۔" ۲۳

خوش بختی سے یہ دونوں مجموعے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی ذاکر حسین لائبریری اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہیں۔

مکاتیبِ حالی، مرتبہ اسماعیل پانی پتی

یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں اردو کے ترپن خطوط ہیں۔ جو کہ صفحہ پندرہ سے ایک سو گیارہ تک درج ہیں۔ پہلے تین خط محمد حسین آزاد دہلوی کے نام اور آخری خط وجاہت حسین جھنجھانوی کے نام ہے۔ اردو خطوط کے کل مکتوب الیہم کی تعداد اڑتیس ہے۔ حصہ دوم میں فارسی کے خطوط درج ہیں۔ ان کی تعداد آٹھ ہے اور مکتوب الیہم کی تعداد چھ ہے۔ پہلا خط نواب کلب علی خاں بہادر اور آخری خط نواب صاحب کے نام درج ہے۔ سوم حصہ سات عربی مکتوبات

پر مشتمل ہے جو پانچ مکتوب الیہم کے نام ہیں۔ اس مجموعہ میں کوئی خط سرسید کے نام نہیں ہے۔ غالب کے نام صرف ایک خط فارسی میں ملتا ہے۔ حصہ عربی کے پہلے حصہ پر حالی کے نام حضرت شاہ عبد الغنی کے عربی خط کا عکس موجود ہے۔ عربی خطوط کا اردو ترجمہ بھی درج ہے۔

اس مجموعہ کا پیش لفظ اسماعیل پانی پتی نے لکھا ہے۔ اس پیش لفظ سے ایک اہم نکتے کی وضاحت ہوتی ہے کہ ۱۹۲۳ء میں مولانا حالی کے بیٹے سجاد حسین کی فرمائش پر اسماعیل پانی پتی نے حالی کے خطوط دو جلدوں میں مرتب کیے۔ لیکن "مکتوباتِ حالی" کی دونوں جلدوں میں اسماعیل پانی پتی کا کہیں نام نہیں ملتا۔ اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

"۱۹۲۴ء میں میں نے مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب (فرزند ارجمند مولانا حالی مرحوم) کے ارشاد کے ماتحت ان کے محترم والد کے خطوط کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جو دو جلدوں میں "حالی پریس" سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت تک مختلف ذرائع سے جس قدر خطوط مہیا ہو سکے تھے وہ ان دونوں حصوں میں جمع کر دیے گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے مزید کوشش حضرت مولانا مرحوم کے دیگر خطوط فراہم کرنے کی شروع کی۔ اس بات کو آج ۲۶ برس ہو چکے ہیں۔" ۲۴

اردو میں تنقید اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ حالی سے شروع ہوتی ہے۔ نقادوں نے "مقدمۂ شعر و شاعری" کو اردو تنقید کا حرفِ اول اور حرفِ آخر کہا ہے۔ جب مولانا حالی کو اپنا دیوان شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا تو ساتھ ہی اس پر ایک مقدمہ کے ذریعہ شاعری کی ماہیت پر بحث کرنے کا خیال بھی پیدا ہوا۔ اس قسم کے ارادے کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھنا چاہتا ہوں جس میں زمانہ جاہلیت سے لے کر آج تک ان کی شاعری کی حقیقت لکھی جائے گی۔ اور عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی شاعری پر بحث کی جائے گی۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اردو کی شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہو گئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بتائے جائیں اور ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور ملک کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔" ۲۵

حالی کے خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خیالات جو کبھی متفرق اشعار میں 'مسدس' میں اور 'حیاتِ سعدی' میں شیخ سعدی کی غزلیات سے متعلق بیان کیے گئے ہیں حالی ان خیالات سے باقاعدہ مروجہ شاعری کے اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ "مکتوباتِ حالی" میں وقتاً فوقتاً مصروف نظر آتے ہیں۔ لندن کے عربی رسالہ "تحفۃ ادیبہ" جلال الدین سیوطی کی کتاب "المزہر" کی تلاش میں علی گڑھ اور ٹامن کا سفر بھی اس غرض سے کیا۔ مقدمہ کے اشاعت کے سلسلے میں اخراجات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس دیوان کی لاگت میرے تخمینہ سے بہت بڑھ گئی ہے۔ گیارہ سو روپیہ مطبع انصاری میں صرف ہوا اور کچھ اوپر دو سو روپیہ کانپور میں لوح کے چھپانے اور کتابوں کو بھیجنے وغیرہ میں لگا ہے اور چالیس روپیہ مہینہ جو علی گڑھ میں پانچ مہینہ تک میرا صرف ہوا ہے اور ڈیڑھ سو روپے جو ٹامن کے سفر میں خرچ ہوا تھا وہ بھی محض مقدمہ لکھنے کی غرض سے صرف ہوا ہے۔"۶؎

مقدمہ کی اشاعت کے ذکر کے علاوہ مولانا حالی نے اکثر خطوط میں قدیم شاعری کے انداز کو ناپسند کیا ہے اور مغربی خیالات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ یقین جانیے کہ میں اس زمانے کی لٹریری ترقی کے آگے ایسی تحریرات کو جو میری طرح محض اردو فارسی کے مرد میدان ہیں، لاشئے محض جانتا ہوں۔ ہم لوگ بیٹنگ کنا کر چھڑوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ ورنہ پرانے خیالات کا اثر ہمارے دل سے بالکل نہیں گیا۔"۷؎

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات حالی کی افتادِ ذہنی کی آئینہ دار ہیں۔ مسدس میں جن خیالات کا اظہار ملتا ہے وہ اب اور زیادہ واضح ہونے لگا ہے۔ اس میں سرسید اور نذیر احمد کی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں اور دیگر تحریروں میں بھی جا بجا قدیم شاعری سے بے زاری کا اظہار ملتا ہے۔

الطاف حسین حالی شاعری کے جمالیاتی پہلو کے مخالف نہیں تھے لیکن مبالغہ کے خلاف تھے۔ اس لیے مقدمہ میں جھوٹ اور مبالغہ سے اختلاف کرتے ہوئے بھی شاعری کو جادوگری مانتے ہیں۔

مقدمہ کے اشاعت کے بعد جب قومی نظموں کا سلسلہ شروع ہوا تو حالی اس سے مطمئن نہیں تھے۔ ظفر علی خاں کی نظم جو "رود موسیٰ" پر لکھی گئی تھی، پڑھ کر ظفر علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جنوری کا دکن ریویو سامنے رکھا ہوا تھا جس کو تفصیلی نظر سے اب تک نہ دیکھا تھا۔ سرسری آپ کی نظم جو "رود موسیٰ" پر لکھی گئی تھی نظر پڑی۔ اول سے آخر تک بہت غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔ میرا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ پرانی طرز کی نظمیں تو (الا ماشاء اللہ) اس لیے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ان میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئے طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے اور جس کو "جادو" کے سوا کسی اور لفظ کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کہیں نظر نہیں آتی لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہو گیا۔"

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر بھی کچھ طبع آزمائی کرتا۔"۸؎

حالی کے خطوط میں موضوعات کا تنوع اور اسلوب کا حسن دونوں ملتے ہیں۔ لب و لہجہ پر خلوص اور سلجھا ہوا ہے۔ خطوط حالی کی اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہیں۔ خانگی اور ذاتی موضوعات کے علاوہ مدرسۃ العلوم سے متعلق اور وطنی نیز علمی مباحث کا احاطہ کرتے ہیں۔ خطوط میں ان کے نظریات و عقائد سے بھی پردہ اٹھتا ہے۔ ان کے متین، بردبار، پرخلوص اور منکسر المزاج سیرت اور شخصیت کے مختلف پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ حالی کے خطوط کی تعریف کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ ان خطوں میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہے جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح

قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑوں پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ کہ اس کے دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم اس دل کی زیارت کرنا چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔" ۱۷۹

خط کو کیوں کی "نصف ملاقات" کہا جاتا ہے تو اس "نصف ملاقات" کی ابتدا یا گفتگو میں مخاطب کے الفاظ کو 'القاب' کہتے ہیں۔ ہر دور کے مکتوب نگار نے جب بھی اس "نصف ملاقات" کا لطف لینا چاہا تو اس نے اپنی طبیعت کی موزونی اور برجستگی کے پیش نظر مکتوب الیہ کو ایک نئے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ کسی خط نویس نے پرانے مروجہ انداز کو موثر مانا اور کسی کو ندرت اور انفرادیت میں مراسلہ نگاری کا حسن نظر آیا۔ الطاف حسین حالی کیونکہ اخلاص و مروت کے مرقع تھے۔ اس لیے ان تجربات میں پڑنے کے بجائے سیدھی سی بات کہہ دیتے ہیں ان کے خطوط میں القاب سادے اور مختصر ہیں مثلاً مکرمی، برخوردار، مائی ڈیئر، مولانا، جناب نواب صاحب، جناب من وغیرہ۔ القاب و آداب کی بے پروائی اور بے نیازی نے ان کے خطوط کو ایک دلکشی اور انفرادی رنگ عطا کر دیا ہے۔

"مکتوبات حالی" میں زیادہ تر خطوط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں روز مرہ کی معمولی باتیں آئے دن کے آلام و افکار اپنی اور دوسروں کی بیماری و مصیبت کا ذکر ہے۔ حالی ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر تھے۔ اس کے باوجود ان کے مزاج میں بے حد انکساری اور فروتنی تھی۔ یہ خوبیاں دلوں میں گھر کر لیتی ہیں اور ان کی طرف سے دل میں محبت پیدا کر دیتے ہیں۔ حالی کے پاک دل کی تراوش کا اندازہ ان کے اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنی پوتی ۱۸۰ کو لکھا تھا:

"تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اس کو پڑھ کر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا اور تمہاری پھوپھی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بڑھا دی ہے۔ تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت و سلامتی کی دعا کرتی رہتی ہیں۔" ۱۸۱

اسی خط میں اپنی پوتی کو اخلاقی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ان کی پوتی ایک بزرگ خاندان سے ملنے نہیں گئیں۔ ان کو شکایت ہو سکتی تھی۔ مولانا رفع شکایت کی صورت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک خط بھائی فیاض حسین کے مکان کے پتے سے دولی کے نام بھی بھیجا اور اس میں یہ لکھنا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہے۔ روانگی کے دن میرا ارادہ آپ کے پاس آنے کا تھا مگر مجھے اتنی فرصت کسی نے نہ لینے دی۔" ۱۸۲

مولانا الطاف حسین حالی کا ایک نواسہ عبدالولی تھا جو ایک لا علاج مرض میں مبتلا تھا۔ مولانا اس کی بہت ناز برداری کرتے تھے۔ دنیا بھر کا کوئی علاج ایسا تھا جو انھوں نے نہ کیا ہو۔ اس کی وجہ سے مولانا کی زندگی تلخ تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے اپنے ایک نوجوان نواسے کی بیماری نے جو صرع اور کسی قدر جنون میں مبتلا ہے بالکل پاگل بنا دیا ہے۔"

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"زندگی وبال ہو گئی ہے۔" ۱۸۳

ایک مرتبہ ان کا نواسہ عبدالولی اپنے چچا کے پاس گیا تو انھوں نے اس کو بہت ہی نصیحت آمیز خط لکھا۔ یہ خط بہت ہی طویل ہے۔ اس میں حالی نے عبدالولی کو سمجھایا کہ اسے وہاں کس طرح رہنا چاہیے۔ ددھیال اور ننھیال والوں کے برتاؤ کا فرق بتایا ہے۔ خط بہت ہی سادہ، صاف ستھری زبان میں لکھا ہوا ہے کہ بچہ پڑھ کر سمجھے اور اثر قبول کرلے۔ حالانکہ خط میں ساری باتیں معمولی ہیں لیکن اس خط سے انشاپردازی کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اپنے نواسہ عبدالولی کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے کو تحمل اور بردبار بنائے تا کہ رنج اور راحت دونوں حالتوں میں ہمیشہ خوش رہے جو طریقہ ددھیال کی تربیت کا ہے یہ طریقہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ برتتا ہے۔ کبھی پیار کرتا ہے کبھی تندرست کرتا ہے۔ کبھی افلاس بھیجتا ہے۔ کبھی آسودگی دیتا ہے تا کہ دنیا کے ہر ایک مزے سے واقف ہوں اور ہمیشہ خوش رہتے رہیے ان کے مزاج میں فرعونیت

پیدا نہ ہونے پاوے۔"۱۸۴

اچھے خطوط کی خوبی جہاں بے ریائی و سادگی ہے، وہیں خطوط مکتوب نگار کی شخصیت کی مکمل عکاسی بھی کرتے ہیں۔ وہ خطوط جن میں سیرت و شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ادب کی جان کہے جا سکتے ہیں۔

حالی کے خطوط ان کی مکمل سیرت و شخصیت کا آئینہ ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تکلف اور تصنع سے پاک ہیں۔ خطوط میں وہ انسان نظر آتا ہے جو خانگی جھگڑوں میں الجھا ہوا ہر کسی سے جھک کر اور کھلے دل سے ملتا ہے۔ قوم کی سفارش کرتا ہوا ہر جگہ نظر آتا ہے۔ حالی کے خطوط سے متعلق سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"عام طور پر حالی کے خطوط کو بھی سرسید کے ضمن میں جگہ دی جاتی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دونوں مصلحین ایک جان دو قالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے یہاں دردمندی ہے، قوم کی غمگساری ہے اور ملکی و ملی مسائل سے والہانہ وابستگی ہے۔ ان کی یہی پرائیویٹ زندگی ہے۔ وہ خلوت اور جلوت دونوں میں ایک ہی چال ڈھال اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ظاہر اور باطن، احساسات اور جذبات دونوں قوم میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس لیے حالی کے خطوں میں بھی سرسید کے خطوط کی طرح یکسانیت اور وحدت نظر آتی ہے۔"۱۸۵

معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

"حالی کے مکاتیب میں حقیقت کی پرخلوص سادہ بیانی ہے اور ان کے خط ان کی ذات سے زیادہ ان کے مکتوب الیہ کے حالات اور ذہنی کوائف پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں مکتوب الیہ کے لیے اطمینان بخش پیغام تو ملتا ہے مگر دل میں خوشی پیدا کرنے والے عناصر نہیں۔ مدرسۃ العلوم سید احمد خاں کی تحریک کی ناقدری اور مسلمانوں کی عام حالت پر جو خطوط انھوں نے تحریر کیے ہیں وہ بہت پراثر ہیں۔ اکثر خطوط قوم کی ناقدری کا مرقع ہیں۔"۱۸۶

حالی کی سیرت کا سب سے اہم جز ان کی انصاف پسندی اور دل کا بغض و کینہ جیسے جذبات

سے پاک ہونا ہے۔ یہ دونوں صفات آدمیت کا جوہر ہیں۔ مہدی حسن افادی نے حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک لکھی ہے لیکن حالی کے خطوط میں ہم عصروں پر تنقید تو درکنار، طالب علموں کے اعتراضوں کا بھی احترام ملتا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے خطوط کی اشاعت کے بعد جو رویہ اختیار کیا تھا اس میں اختلاف کا پہلو زیادہ حاوی ہے لیکن شبلی کی نسبت حالی کی رائے تھی کہ:

"آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ و سلامت رکھے۔"۱۸۷

ایک جگہ شبلی کی تصنیف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دستہ گل پہنچا۔ میں نے اس مجموعہ کا نام تو احسن اللہ خاں ثاقب سے جو ابھی میرے ہاں مہمان رہ کر گئے ہیں سنا تھا اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ لائبریری پانی پت میں میں نے اسے منگوانے کو لائبریرین سے کہہ دیا تھا مگر اب تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جو آپ نے عنایت فرمایا تو اول سے آخر تک اس کو دیکھا۔ کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرت النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلوں کا ہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشے میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔"۱۸۸

حالی اپنے ساتھیوں یعنی دوسرے مصنفین سے کتنی محبت و خلوص رکھتے تھے اس کا اندازہ حالی کے خطوط کے مطالعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ سید احمد دہلوی کے کسی کام کے لیے کتنی دل سوزی سے سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولوی سید احمد دہلوی مصنف "فرہنگ آصفیہ" خدمت والا میں آتے ہیں۔ جو امر کہ ان کو اپنے سفر دور دراز پر جرأت کرنے کا باعث ہوا ہے اس کو آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے کسی سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی سفارش خود ان کی واجب الرحم حالت ہے۔ جس کا کسی قدر اندازہ آپ مولوی سید علی صاحب بلگرامی کی رپورٹ سے جو آپ کے پاس موجود ہے کر سکتے

ہیں۔ میں یہ عریضہ صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ حیدر آباد سے چلتے وقت میں نے ان کے باب میں آپ کی خدمت میں کچھ عرض کیا تھا۔ اس وقت جناب نے کسی قدر مجبوری ظاہر فرمائی تھی مگر باایں ہمہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ دل سے ان کی اعانت وامداد کرنے پر آمادہ ہیں۔

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

ان کی پچیس سال کی محنت وجانفشانی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا ہو۔ اور آپ کی عنایت اور توجہ کی بدولت اسلام کی ایک لازوال نشانی یعنی زبان اردو ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے جڑ پکڑ پائے۔ یہ احسان صرف مولوی سید صاحب پر نہیں بلکہ تمام ہندوستان پر عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں پر خصوصاً سمجھنا چاہیے۔"۱۸۹

حالی کے خطوط جہاں قوم وملک اور معاشرے کے حالات کا عکس ہیں وہیں حالی مکتوب الیہ کو اپنے ماحول میں شامل کر لیتے ہیں۔ بعض خطوط میں موسم مثلاً گرمی اور بارش کا ذکر ملتا ہے۔ ایک خط میں موسم کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"بارش کا حال بھی کوئی لکھو کہ ہوئی یا نہیں؟ یہاں ابھی بارش نہیں ہوئی مگر رڑکی سہارنپور وغیرہ سے بارش کی خبریں آئی ہیں۔"۱۹۰

خطوط کے ذریعہ مکتوب نگار کی سوانح عمری مرتب کی جا سکتی ہے۔ مکتوب نگار کے ماحول اور عہد بہ عہد بدلتے ہوئے حالات ونظریات کا علم بھی خطوط کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ حالی کے خطوط میں پانی پت کے آس پاس پھیلنے والی بیماریوں کا ذکر ملتا ہے۔ کئی خطوط میں طرح طرح کے عوارض خاص طور سے اپنی آنکھ کی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ایک آنکھ سے بالکل نظر نہیں آتا۔ دوسری آنکھ میں بھی موتیا کا پانی آنا شروع ہو گیا ہے۔ داہنی آنکھ بنوانے کا ارادہ ہے لیکن کھانسی کی وجہ سے فروری تک اپریشن کرانا ملتوی کر دیا ہے۔"۱۹۱

"میری داہنی آنکھ میں پانی اتر آیا ہے۔ اوائل اپریل میں قدح کرانے کی غرض سے لکھنؤ جانے کا ارادہ ہے۔ لکھنا پڑھنا تقریباً بالکل بند ہے۔"۱۹۲

"میں نے جب سے آنکھ بنوائی ہے۔ لکھنا پڑھنا اور خود اخبار وغیرہ کو دیکھنا تقریباً بالکل چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کہ اب تک کوئی عینک بنی ہوئی آنکھ پر ٹھیک نہیں بیٹھی اور ڈاکٹر کی تاکید ہے کہ جب تک عینک نہ لگے لکھنے پڑھنے سے پرہیز کرنا چاہیے اس لیے سوا اشد ضرورت کے خط نہیں لکھتا۔"۱۹۳

اپنی بیماری کے ساتھ اپنے دوستوں یا ہم عصروں کی بیماری کا ذکر بھی خطوط میں ملتا ہے۔ مولانا شبلی کی صحت کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کی حالت نازک ہو گئی تھی اور مرض کو حد سے زیادہ اشتداد ہو گیا تھا۔ باوجود یکہ تبدیل آب وہوا کی بہت ضرورت تھی مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا۔"۱۹۴

مولانا شبلی کی عیادت کے لیے جانے کا ارادہ رکھتے ہوئے ان کے فرزند مولوی حامد نعمانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بہت دن سے ارادہ کر رہا ہوں کہ میری پوتی یعنی غلام الثقلین کی اہلیہ جو لکھنؤ میں ہے اس سے ملنے لکھنؤ آؤں اور وہاں سے مولانا کو دیکھنے کو اعظم گڑھ آنے کا بھی قصد ہے مگر اب تک ایسے موانع پیش آتے رہے کہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا۔ اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڑھ آنے سے پہلے آپ کو وہاں اطلاع دوں گا۔"۱۹۵

محسن الملک کی بیماری سے متعلق لکھتے ہیں:

"بمبئی میں مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) سخت بیمار ہو گئے تھے اور ان کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی اور غلام الثقلین اسی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ مگر اب بہت افاقہ ہے۔"۱۹۶

حالی کے خطوط اس وقت کے لکھے ہوئے ہیں جب خانگی حالات کچھ اطمینان بخش نہ تھے۔ ان کے ایک نواسے عبدالولی کو مستقل عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ زندگی کے آخری بیس سال حالی نے جس تکلیف میں گزارے اس کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ حالی نے ذاتی عوارض کی تفصیلات بیشتر یا تو قریبی دوستوں، عزیزوں کو لکھی ہیں یا ان لوگوں کو جنھوں نے حالی سے کسی قلمی نگارش یا اسی نوعیت کی کسی اور کاوش کا تقاضہ کیا تھا۔ اور حالی کے لیے اپنی مجبوری کی

تشریح کے بغیر معذرت کرنا ممکن نہ تھا۔ اپنے نواسے کی بیماری اور علاج سے متعلق ایک خط میں عبدالرحیم خاں بیدل کو لکھتے ہیں:

"جس کے علاج کو دلی گیا تھا اس کے صرع کے دورے تو رک گئے ہیں مگر جنون بڑھتا جاتا ہے۔ میرا ناک میں دم ہے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ زندگی وبال ہوگئی ہے۔ یہ یقین ہوگیا ہے کہ زیست کے برس دو برس جو باقی ہیں بہت بری طرح سے گزریں گے۔" ۱۹۷

دوسرے خط میں لکھتے ہیں

مجھے اپنے ایک نوجوان نواسے کی بیماری نے جو صرع اور کسی قدر جنون میں مبتلا ہے بالکل پاگل بنا دیا ہے۔" ۱۹۸

صنف مکتوب نگاری میں مکتوب نگاری کی جگہ جگہ تنقیدیں ملتی ہیں۔ حالی کے خطوط میں بھی تنقیدوں کا سرمایہ موجود ہے۔ جب مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہ ہو اور نہ ادبی لغزشوں کا کوئی خوف، بلکہ اس وقت انسان جو کچھ بولتا ہے یا کہتا ہے وہ اس کی انفرادی رائے ہوتی ہے اور وہ سوچے بغیر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ نہیں سوچتا کہ اس کی رائے سے اتفاق مخاطب کو ممکن ہے کہ نہیں۔ حالی نقد و نظر میں اپنا الگ مقام رکھتے تھے۔ بقول مولوی عبدالحق کہ اردو میں ادبی تنقید کی ابتدا حالی سے ہوئی۔ حالی جو رائے دیتے ہیں بچی تلی، ذاتی اختلاف اور وقتی مصلحتوں سے بالاتر۔ ایک شاعر نے لکھنؤ کے بازار کی رونق پر مثنوی لکھی، اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لکھنؤ کے ایک نامور شاعر نے اپنی مثنوی میں بازار کی رونق اور چہل پہل اس طرح بیان کی ہے کہ بازار میں آپ گوہر کا جھمکا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس بیان سے بجائے اس کے کہ بازار کی رونق ثابت ہو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں خاک اڑتی ہوگی۔ کیونکہ آب گوہر کا جھمکا تو خاک کو دبا نہیں سکتا۔" ۱۹۹

حالی کے خطوط میں نہ صرف تنقیدی آرا ملتی ہیں بلکہ خود مصنف کی تصانیف نیز تخلیقی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً مولوی چراغ علی کی وفات پر انھوں نے فارسی میں ایک قطعہ لکھا۔ سرسید کی سوانح عمری "حیات جاوید" لکھی۔ سرسید کے مذہبی امور سے متعلق مضمون کالج کی

میگزین میں شائع کرایا۔ "حیات جاوید" کی تصنیف میں پیش آنے والے واقعات کا حال بھی جابجا ان خطوں میں ملتا ہے۔ اس طرح سے حالی کے خطوط کو "حیات جاوید" کے ابتدائی ماخذ میں شمار کر سکتے ہیں۔ "مکتوبات حالی" میں اکثر خطوط اس وقت کے ہیں جب وہ سرسید کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔ اس کتاب کو لکھنے میں انھوں نے بے حد محنت، جانفشانی اور کاوش سے کام لیا۔ اپنی بیماری، نواسے کی بیماری، خانگی پریشانیوں کے باوجود "حیات جاوید" کو مکمل کرنے کی کوشش کرتے رہے کتاب "حیات جاوید" شائع ہونے کے بعد لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر ہوئی تو مولانا الطاف حسین حالی کو اس کا قلق ہوا۔ ایک خط میں حبیب الرحمٰن شیروانی کو لکھتے ہیں:

"ڈیڑھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا کہ "حیات جاوید" کی جلدیں، تینوں قسم کی ذوقی شاپ میں پہنچ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے کتاب منگوالی ہوگی کیونکہ اگر مصنف قابل وقعت نہ تھا تو ہیرو بلاشبہ ایسا تھا کہ اس کی بائیوگرافی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو دیکھنے کا ضرور مشتاق ہونا چاہیے تھا۔ مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹا دی ہے۔ جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ اس کتاب کو منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرف سے سردمہری کے علاوہ میں نے اب تک کچھ نہیں دیکھا۔" ۲۰۰

ان کے ایک دوست نے "حیات جاوید" پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت تعریف کی تو لکھتے ہیں:

"حیات جاوید" پر آپ کا ریویو دیکھا جو کلمات بتقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ اگرچہ میں اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔" ۲۰۱

مولانا حالی کے مزاج میں مزاح بھی تھا مگر بہت لطیف۔ ان کے خطوں میں کہیں ظرافت کا عنصر نمایاں ہے۔ "حیات جاوید" کی اشاعت کے بعد نواب محسن الملک کی طرف سے سردمہری ظاہر ہوئی بعض شکایت آمیز جملے ان کے قلم سے نکل گئے مگر اس میں ظرافت نظر آتی ہے۔ حبیب

الرحمٰن شیروانی کو حیات جاوید پر تبصرہ کی نسبت لکھتے ہیں:

"نواب محسن الملک بہادر نے بھی کچھ ریمارکس کرنے کا ارادہ کیا ہے مگر ان کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔" ۳۹ع

حالی کے خانگی خطوط میں بھی کچھ مقامات ایسے آجاتے ہیں جہاں محبت اور لطافت ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ اپنی پوتی مشتاق فاطمہ کو لکھے خط کے کچھ جملے محبت، لطافت، ظرافت کا دلکش نمونہ ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی، کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کر آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی ہوں۔" ۴۰ع

خواجہ الطاف حسین حالی کے بھتیجے کو اکسٹرا اسسٹنٹ کا عہدہ ملا۔ انھوں نے حالیؔ کا شکریہ ادا کیا کہ یہ انھیں کی کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے جب ان کے بھتیجے نے اپنے عہدے سے متعلق نیلی گرام بھیجا تو لکھتے ہیں:

"جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں۔ یہ محض تمہاری سعادت مندی اور کسی قدر تمہاری نادانی کی دلیل ہے۔ اگر بفرض محال میری کوشش کو تمہاری کامیابی میں دخل ہو بھی تو اس کو اتنا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے۔" ۴۱ع

دوسری جگہ اپنے بھتیجے کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"والدہ صاحبہ کی یہ خواہش ہے کہ پہلی تنخواہ میں سے سو روپیہ اپنے خرچ کے واسطے رکھ کر ڈیڑھ سو روپیہ یہاں بھیج دو تو دھانوں کو جمعرات سے آئے... دیا جائے اور مصلیٰ اور مجلس اور منتیں جو مان رکھی ہیں سب پوری کی جائیں۔" ۴۲ع

حالی کے خطوط کا اسلوب سادہ، بے تکلف زبان اور صاف ستھرا ہے۔ یہ خطوط بول چال اور رو برو گفتگو کا انداز رکھتے ہیں۔ سادہ، بے تکلف زبان اور برجستہ انداز بیان کی وجہ سے بالمشافہ گفتگو کا گمان ہوتا ہے۔ انگریزی الفاظ بہت بے تکلفی اور بے تامل استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ فارسی اشعار

اور عربی فقرے بھی جگہ جگہ استعمال کرتے ہیں جس سے ان کے ادبی مطالعے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ حالی کے مکتوبات میں علی گڑھ دہلی کی ادبی مجلسوں اور باہمی بات چیت کا بھی عکس موجود ہے۔

مدرسۃ العلوم اور سرسید احمد خاں سے حالی کو بہت محبت تھی۔ حالی کی باطنی کیفیت، سرسید کی زندگی کی جھلکیاں، حالی کے زاویۂ نگاہ اور علی گڑھ سے ان کا ذہنی رشتہ ان کے مضامین کے علاوہ خطوط میں بھی سامنے آجاتا ہے۔ سرسید کے کردار کی پختگی ان کی انا، ان کا جذبۂ یقین، ان کی تگ و دو اور دیگر مراحل خاص طور سے حالی کے خطوط کی زینت ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سید صاحب کو میں نے آج ہی خط لکھا ہے مگر تمہاری کوشش کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ وہ میری باتوں سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو جب تک قاضی القضات کا دیدار آنکھوں سے نہیں کر لیتے ہرگز ایمان نہیں لاتے۔ حیدرآباد کے حالات سے افسوس ہے کہ مدرسۃ العلوم کو اور سرسید کے منصوبوں کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ اور سید محمد بھی چھوڑ بیٹھے ہیں۔ تعمیر برابر جاری ہے۔ سرسید اپنے نام سے قرض لے کر کام چلا رہے ہیں۔ دس پندرہ ہزار کے قریب قرض لے چکے ہیں۔" ۴۳ع

کسی تحریک میں شریک ہونا، اس کے لیے کام کرنا، اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا الگ مسئلہ ہوتا ہے جہاں مختلف وجوہات کو دخل ہوتا ہے۔ کہیں ذاتی مفاد کا لالچ تو کہیں مشن کے اصولوں سے اپنے اصولوں کا اشتراک بھی۔ لیکن کسی تحریک کی تائید ظاہر و باطن سے کرنا اپنا سب کچھ لگا دینا کم ہی افراد کا عمل رہا ہے۔ حالی ان سراپا مخلص اور دیانت دار شخصیتوں میں سے تھے جو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے سرسید کی خدمات کو سراہتے اور ان کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ ستمبر ۱۸۹۱ء کو سرسید کے ساتھ مدرسہ کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے بھوپال اور حیدرآباد گئے وہاں سے سجاد حسین کو لکھتے ہیں:

"سید صاحب کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ایک سو اوپر بارہ ہزار بھوپال سے نقد ملے اور حضور نظام نے ایک ہزار روپیہ ماہوار کے علاوہ ماہانہ سابق کے کہ وہ بھی اسی قدر تھا مقرر فرما دیا۔ اور صرف ایک صوبہ سے ۲۵ ہزار نقد وصول ہوا ہے۔" ۴۴ع

سرسید اور حالی کے آپس میں جو گہرے تعلقات تھے اس کا اندازہ خطوط کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ حالی کے دل میں سرسید کے لیے عقیدت اور محبت اس قدر گھل مل گئی تھی کہ اسے الگ الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ دونوں میں اگر فرق ہے تو صرف طرز و تیور کا مقصد کا نہیں۔ بنیادی طور پر سرسید کے سیاسی مسلک سے حالی وابستہ رہے لیکن سیاسی حالات بدلے تو انھیں بھی بدلنا پڑا۔ انیسویں صدی کی سیاست تعلیمی و معاشرتی اصلاح کی سیاست تھی۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان عملی طور پر بین الاقوامی اسلامی سیاست سے لو لگا چکے تھے۔ اس آخری دور میں بھی حالی کا دل قوم کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ حالی بے حد سادہ مزاج کے انسان تھے سیاسی ہنگامہ آرائی سے ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت نہیں تھی۔ حالی کی عمر بیس سال تھی جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا۔ سرسید کے مقابلے میں ان کے بعض تجربات کم تھے اور بعض زیادہ۔ سرسید نے جنگ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء کا حسرت ناک انجام دیکھا تھا اور اس سے پیدا شدہ حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ حالی نے ابھی شعور کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ سرسید اسلامی ممالک کے جن جاں گسل حالات پر اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کرتے تھے اس کے عبرت ناک نتائج حالی کے آخری زمانے میں سامنے آئے۔ ایک خط میں عبدالحق کے مضمون کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مگر برٹش فارن پالیسی پر جو اس میں نوک جھونک کی گئی ہے وہ سراسر خلاف مصلحت ہے۔ اگر آپ کی یہی درست گفتاری رہی تو شاید آپ اس سلسلے کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔" ۲۰۸

ایک دوسرے خط کے مطالعے سے حالی کے سیاسی شعور کی شدت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ٹرکی کی خبریں جو آجکل آرہی ہیں انھوں نے بالکل کمر توڑ دی ہے۔ ایران اور مراکو تو فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ اب ٹرکی بھی بظاہر خیر معلوم نہیں ہوتی۔" ۲۰۹

مولوی عبدالحق کے نام جو خطوط حالی نے لکھے ہیں، ان میں مختلف اور متنوع مضامین ملتے ہیں۔ حالی ان خطوط میں کہیں دوست، بزرگ اور کہیں ناصح مشفق کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ ان خطوط میں راز کی باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کبھی اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہیں کہیں

عبدالحق کو زمانے کی سرد و گرم ہواؤں سے آشنا کرتے ہیں۔

اگر کوئی ایسی تصنیف حالی کے سامنے آجاتی جس سے فرقہ وارانہ جذبات یا مذہبی منافرت پھیلنے کا ڈر ہوتا تو پریشان ہوجاتے تھے۔ ان کے ایک ہم وطن برہمن نے کتاب "خاتون ہند" لکھی اور سراسر تنگ نظری اور تعصب سے کام لیا۔ عبدالحق سے ایک خط میں ریویو لکھنے کے لیے کہتے ہیں، لکھتے ہیں:

"ریویو میں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ جو لوگ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ برہمو ہوں یا آریہ۔" ۲۱۰

"مکتوبات حالی" میں بیشتر خطوط ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح سے سرسید اور مدرسۃ العلوم کا ذکر اور اس کی فکر کا اظہار ملتا ہے۔

حکم چند نیر نے اپنے مضمون "مولانا حالی کے چار نادر غیر مطبوعہ خط" ۲۱۱ میں ذکر کیا ہے کہ کے ایم ہندی انسٹی ٹیوٹ آگرہ کی لائبریری میں ایک بکس پنڈت پدم سنگھ شرما ۲۱۲ کے نام خطوط سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں اردو میں چالیس خطوط ہیں۔ حکم چند نیر لکھتے ہیں:

"اردو کے ان چالیس خطوط میں چار خطوط خواجہ الطاف حسین حالی کے اکتیس خطوط اکبر الہ آبادی کے اور تین خط منشی سورج نرائن مہر دہلوی کے ہیں۔" ۲۱۳

پنڈت پدم سنگھ شرما کا کتب خانہ کے ایم منشی ہندی انسٹی ٹیوٹ آگرہ میں محفوظ ہے جس میں ہندی اور سنسکرت کی ہزاروں کتابوں کے ساتھ فارسی کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ پنڈت پدم سنگھ کا انتقال ۷ اپریل ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی سے ان کی خط کتابت ہوتی تھی۔ بقول حکم چند نیر:

"شرما جی کے نام خواجہ الطاف حسین حالی کے چار خطوط محفوظ ہیں۔ تین پوسٹ کارڈ اور ایک لفافہ ہے۔ یہ خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔" ۲۱۴

حکم چند نیر نے اپنے مضمون "مولانا حالی کے چار نادر غیر مطبوعہ خطوط پنڈت پدم سنگھ کے نام" میں حالی کے ان چار خطوں کا متن درج کیا ہے جو پنڈت پدم سنگھ کے نام ہیں۔ ان میں پہلا

۱۵رجولائی ۱۹۰۵ء کا ہے، جس میں حالی "بیوہ کی مناجات" اور دیگر مضامین اور منظومات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نہایت خوشی کی بات ہے کہ بیوہ کی مناجات سنسکرت میں لکھی گئی ہے۔ آپ شوق سے اس کو شائع کرائیں اور میں نہایت ممنون ہوں گا اگر ایک کاپی اس کی مجھے بھی عنایت ہوگی۔ "مضامین حالی" میں نے چھپائے۔ میرے دوست مولوی وحید الدین صاحب (سلیم) نے علی گڑھ گزٹ وغیرہ اخباروں اور رسالوں سے ڈھونڈ نکال کر یہ مضمون چھپائے ہیں۔"۱۵؎

خط نمبر دو میں بھی مجالس النساء اور نظم "چپ کی داد" کا ذکر ہے۔ یہ خط ۱۳رمارچ ۱۹۰۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ تیسرا خط ۱۸راگست ۱۹۰۸ء کا ہے جس میں مناجات پر پریمارکس اور سنسکرت ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے اس بات کی دریافت ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی کہ پنڈت بھیم سین جی نے مناجات بیوہ کو بہت پسند کیا اور اس کو اس قابل سمجھا کہ سنسکرت میں اس کا منظوم ترجمہ کیا جائے جو آپ نے اپنے رسالے میں کلام مذکور پر ریمارکس فرمائے ہیں۔ ان کا بھی میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نہایت ممنون ہوں گا اگر آپ مہربانی فرما کر رسالہ پرچارک کے پرچے جب تک اس میں سنسکرت کا منظوم ترجمہ چھپتا ہے، میرے پاس بھیجتے رہیں گے۔ میں ان تمام پرچوں کو جمع کر کے ایک جلد میں پانی پت کی لائبریری میں جہاں سنسکرت کی کتابیں بھی داخل کی گئی ہیں۔ داخل کروں گا۔"۱۶؎

چوتھا خط جس کا متن درج ہے اس میں ہندی شاعر بہاری ست سئی کے دوہے اور اردو اشعار کے متعلق اپنی رائے دیتے ہیں۔ اس خط کو بھی تنم چند نیر نے غیر مطبوعہ خطوط میں شامل کیا ہے لیکن یہ ادبی خط مجموعہ "مکاتیب حالی" کے صفحہ نمبر اکیاسی اور بیاسی پر درج ہے۔ مولانا کے اس خط کی تمہید مولوی عبد الحق نے لکھی ہے۔ مجموعہ "مکاتیب حالی" اگست ۱۹۵۰ء میں ادبی پریس کراچی سے شائع ہوا اور اس کے مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ہیں اس لیے اس خط کو غیر مطبوعہ نہیں کہا جا سکتا۔

حالی کے خطوط میں شرافت، ہمدردی اور خلوص جا بجا جھلکتا نظر آتا ہے۔ مولوی عبد الحق، مولانا ظفر علی خاں، مولوی یحییٰ تنہا اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام جو خطوط ہیں۔ وہ سچی محبت اور باہمی خلوص کے مظہر ہیں۔ حالی کے خطوط مشرقی وضع داری اور شفقت کے دل آویز نمونے ہیں۔ حالی کے خطوط محض ضرورت کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ خطوط کا مقصد آرائش زبان، نہ تجدید ملاقات، نہ جذبات کے اتار چڑھاؤ دکھانا اس لیے حالی کے خطوط میں انسانی زندگی کی نیرنگیاں اور بوقلمونیاں نظر نہیں آتیں۔ حالی کے دوسرے کارناموں کے مقابلے میں ان کے خطوط جوش خروش اور شدت جذبات سے خالی ہیں۔ ان میں وہ چمک دمک اور سرور نہیں ہے جس سے تھوڑی دیر کے لیے دنیائے آب وگل کی کلفتیں اور ہوجاتیں۔ حالی کے خطوط صاف اور سیدھا سادا سے کام کی باتیں ہیں، علمی وقومی مسائل ہیں اور بزرگوں کا احترام ہے کہیں بے تکلف مشورہ ہے کہیں پر زمانے کے نشیب وفراز، انسانی فطرت اور دنیا کی رفتار پر دو چار سطریں لکھ دی ہیں۔ قومی اتحاد، ضبط وتحمل، رواداری، ایثار وکرم اور باہمی محبت کی باتیں وغیرہ خطوط حالی کی خصوصیات ہیں۔

"مکاتیب حالی" میں ایسے خطوط بھی ہیں جن میں بعض علمی یا ادبی یا تاریخی نکات بیان کیے ہیں۔ کچھ لوگوں کو ان کی ادبی غلطیاں بتائی ہیں اور متنازعہ فیہ مسائل کو بھی حل کیا ہے جو اصحاب فن شعر میں ان کے شاگرد تھے ان کو بھی مشورہ سخن دیا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں حالی کے خطوط پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا حالی کی ذاتی دردمندی اور اخلاص تو قدرتاً یہاں بھی اسی طرح موجود ہیں، جس طرح ان تمام مضامین میں جو انھوں نے خاص طور پر بغرض اشاعت لکھے۔ مزید لطف اس جگہ پر یہ ہے کہ ان متفرق خطوں میں تعمیر قوم کے متعلق حالی کا مضطربانہ جذبہ جا بجا چھلکا پڑتا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس معاملے میں ان کے خانگی خط بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حالی کے خطوط کا مطالعہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ حالی نے جس سیدھی اور بے تکلف زبان میں اپنے ذاتی خط لکھے، وہی انھوں نے اپنی علمی اور رفاہی تحریروں میں استعمال کی۔"۱۷؎

■❖■

نواب وقار الملک

(مشتاق حسین)

انگریزوں کے عہد حکومت میں جن مسلمان رہنماؤں نے قوم میں بیداری پیدا کی اور جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف ان کو متوجہ کیا ان میں سرسید احمد خاں پہلے فرد تھے۔ سرسید احمد خاں کے کئی نامور رفیق تھے جنھوں نے ان کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ ان میں دیگر رفقا کے ساتھ نواب وقار الملک (مشتاق حسین) کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ملک کے حالات بدل چکے تھے اور لوگ جدید سیاسی و ملکی حالات سے متاثر ہو رہے تھے۔ 'تہذیب الاخلاق' کے جون ۱۹۸۳ء کے شمارہ میں شامل ایک تحریر کے اقتباس سے اس وقت کے حالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اقتباس پیش خدمت ہے:

"اس وقت مسلمانوں میں دو رجحان عام تھے۔ ایک تو وہی سرسید احمد خاں کا۔ یعنی جدید تعلیم حاصل کرو اور حکومت وقت سے فائدہ اٹھاؤ۔ دوسرا رجحان یہ تھا کہ جدید تعلیم تو حاصل کرو لیکن حکومت وقت کی شاطرانہ چالوں کے خلاف آواز بھی اٹھاتے رہو۔ اس دوسرے رجحان کے لیڈر اس دور میں زیادہ مقبول ہوئے۔ مشتاق حسین جو سرسید کے رفیق تھے۔ ان کی زندگی میں یہ دوسرا رجحان مسلمانوں میں مقبول ہو گیا تھا۔"۱۸؎

وقار الملک صرف اپنی قدرتی صلاحیتوں کی بدولت ابھرے اور اپنے عہد کی نامور شخصیتوں میں شمار ہونے اور وہ مرتے دم تک سرسید کی تحریک میں شامل رہے۔ بقول محمد امین زبیری:

"سائنٹفک سوسائٹی" پریس کا انتظام اور تہذیب الاخلاق کی اشاعت کا اہتمام ان کے ذمہ تھا اور وہ ۱۸۶۶ء میں خود بھی سوسائٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ ہوتے ہوتے کئی اور ذہین افراد کی طرح وہ بھی سرسید کا دست راست بن گئے۔ وہ نہ صرف ان کے ہم خیال تھے بلکہ مددو معاون بھی تھے۔ اس ہم نوائی کا نتیجہ تھا کہ وہ سرسید کی طرح زندقہ الحاد کے الزاموں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انھوں نے سرسید کی رہنمائی میں زندگی کا آغاز ہی قومی خدمت سے کیا تھا اور اس کے لیے ہمیشہ خندہ پیشانی سے سینہ سپر رہے۔ انھیں ہر قدم سے اتفاق تھا جس کا مقصد قومی ترقی اور رفاہ و بہبود ہو۔"۱۹؎

سرسید احمد خاں کے رفقا میں نواب وقار الملک کی شخصیت اپنی سیرت کی دل نوازی، اخلاق کی پاکیزگی، اصولوں کی پختگی اور قومی خدمت میں بے لوث اور پر خلوص انہماک کے باعث امتیازی شان کی مالک تھی۔ ان کی وفات پر مدیر "معارف" سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا:

"نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر عربی نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور دقیقہ سنجی پر ملال کیا۔ لیکن وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔ وہ ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا، اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا، ختم ہو گیا۔"۲۰؎

وقار الملک کے خطوط کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سب سے پہلے محمد امین زبیری نے "مکاتیب" کے عنوان سے خطوط مرتب کر کے ۱۹۱۸ء میں شائع کرائے۔ یہ خطوط دونوں بزرگوں نواب محسن الملک اور وقار الملک کے لکھے ہوئے ہیں۔ مجموعہ "مکاتیب" کل ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ "مکاتیب" کے حصہ اول میں نواب محسن الملک کے خطوط شامل ہیں۔ حصہ دوم کے خطوط نواب وقار الملک کے لکھے ہوئے ہیں۔ حصہ دوم کے ابتدا میں درج ہے کہ یہ خطوط سرسید احمد خاں کے نام ہیں۔ لیکن مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کے دوسرے

جے میں سرسید احمد خاں کے علاوہ منیر نور جنگ، محسن الملک، سید شیر محمد خاں، الطاف حسین خاں، سید افضل الرحمٰن، مسعود احمد عباسی، مولوی امام الدین، محمد امین خاں، محمد مسیح اللہ خاں اور ان کے بیٹے کی بیگم شارلی کے نام بھی خطوط شامل ہیں۔

''مجموعہ مکاتیب'' کے حصہ دوم کے خطوط زمانی اعتبار سے ۵/ اگست ۱۸۸۴ء سے ۱۳/ جنوری ۱۹۱۳ء کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ حصہ دوم کے شروع کے صفحے پر نواب وقار الملک کی تصویر اور قلمی خط کا عکس موجود ہے۔ نواب وقار الملک کے تحریر کردہ خطوط کی کل تعداد چھتیس ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ خطوط سادہ، بے تکلف اور مقصدیت سے پر ہیں۔ خطوط کیوں کہ ضرورتاً لکھے گئے ہیں اس لیے روزمرہ کے الفاظ کا استعمال فطری انداز میں موجود ہے۔ خطوط ادبیت کی چاشنی اور فن کا جادو جگانے کے لیے نہیں بلکہ مقصد کی ترسیل کے لیے لکھے گئے ہیں۔ خطوط میں معیاری زبان اور ادبی زبان کے اہتمام یا انداز بیان کا حسن مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ ان خطوط کے طرز تحریر سے متعلق امین زبیری لکھتے ہیں:

> ''موجودہ طرز تحریر کی بنیاد سرسید مرحوم نے ڈالی تھی اس کی ترقی میں ان دونوں بزرگوں نے بہت کم حصہ نہیں لیا۔ یہ خطوط جدید طرز انشا پردازی اور سنجیدہ و پختہ تحریر کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔''۲۲۱

خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کسی نثری شہ پارے کی دلکشی موجود نہیں ہے جسے پہلی نظر میں محسوس کیا جا سکے۔ بلکہ روکھا پھیکا اور یک گونا سپاٹ پن ہے۔ اس دور کے حیدرآباد کی فضا اور دیگر معاصرانہ احوال و کوائف کے نقطۂ نظر سے خطوط کی اہمیت ضرور ہے اس کے علاوہ معاصرین کے فکر و کردار کی طرف خصوصیت سے اشارے ملتے ہیں۔ اور دونوں بزرگوں یعنی محسن الملک اور وقار الملک کے آپسی تعلقات کا علم بھی ہوتا ہے۔ خطوط کی تاریخی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امین زبیری لکھتے ہیں:

> ''ان خطوط سے نہ صرف ان دونوں بزرگوں کی اعلیٰ سیرت اور کریکٹر پر روشنی پڑے گی بلکہ اس زمانے کی قدیم تاریخ اور قومی اہم معاملات کی تشریح و توضیح بھی ہوگی۔ اسی طرح تاریخ حیدرآباد کے لیے نہایت دلچسپ اور کارآمد

> واقعات کا ذخیرہ ان خطوط میں موجود ہے۔''۲۲۲

سب سے پہلے ''حیات مشتاق'' نامی چھبیس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ شائع ہوا تھا جس میں نواب وقار الملک کی زندگی کے کچھ حالات بہت ہی مختصر طور پر اہل ملک کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی رئیس حبیب گنج وصدر الصدور سررشتہ امور مذہبی ریاست حیدرآباد دکن نے ایک مفصل کتاب ''وقار حیات'' کے نام سے ایک مختصر مقدمے کے ساتھ انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کی جانب سے شائع کرائی۔ اس کے علاوہ محمد امین زبیری نے بھوپال سے ۱۹۲۵ء ہی میں ''تذکرۂ وقار الملک'' شائع کرائی۔ اس کے تیرہ سال بعد ۱۹۳۸ء میں چار سو صفحات کی دوسری کتاب ''تذکرۂ وقار'' شائع ہوئی۔ مگر اس معاملے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا سہرا امین زبیری کے ہی سر بندھتا ہے کیونکہ انھوں نے نواب وقار الملک اور نواب محسن الملک کے خطوط کا ایک مجموعہ ۱۹۱۸ء میں مرتب کر کے ''مکاتیب'' کے عنوان سے شائع کرایا تھا۔ یہی مجموعہ وقار الملک سے متعلق کتابوں کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ خطوط سے متعلق امین زبیری لکھتے ہیں:

> ''اس مجموعے میں وہی خطوط ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئے البتہ چند مکاتیب جن کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں اخبارات سے لیے گئے ہیں۔ ان مکاتیب کا وہ حصہ جن سے حیدرآباد کے حالات و تعلقات معلوم ہوتے ہیں ریاستوں کے عہدہ داروں کے لیے نہایت سبق آموز ہونے کے باوجود اختلافات اور پارٹی فیلنگ کے بھی رشتۂ اتحاد و دوستی کس قدر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے اور ایک دوسرے پر کس درجہ محبت اور راست بازی کا اعتماد کر سکتا ہے۔''۲۲۳

خطوط وقار الملک

اس مجموعے کے مرتب وقار الملک کے فرزند مشتاق احمد ہیں۔ خطوط کا یہ بیش قیمت مجموعہ سرسید ہاؤس سیریز کے تحت ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ خلیق احمد نظامی نے ۲۸/ مئی ۱۹۷۳ء کو قلم بند کیا۔ یہ مجموعہ ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب پر اس کی قیمت درج نہیں ہے۔ مجموعے میں

نہ صرف وقار الملک کے خطوط درج ہیں بلکہ ان سے متعلق دیگر تحریرات بھی شامل کی گئی ہیں۔ وقار الملک کے نام دیگر مشاہیر کے خطوط بھی شامل ہیں جن سے ان مکاتیب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

مجموعہ "خطوط وقار الملک" کے صفحہ نمبر ایک سے "عرض حال" کے تحت مرتب نے خطوط کی اشاعت کے متعلق اپنے تجربات کا تجزیہ کیا ہے۔ مرتب کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا "عرض حال" کے مطالعے سے ان دشواریوں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "مواد حاصل کرنے کے لیے ایجوکیشنل کانفرنس کے نمائندہ اور زبیری صاحب دونوں ایک ہی دن امروہہ پہنچے۔ پہلے زبیری صاحب نے اپنی پسند کے کاغذات چن لیے اور باقی ماندہ مواد مولوی انوار احمد صاحب مرحوم علی گڑھ لے گئے۔ مگر مکاتیب کا مواد اس سے بہت پہلے زبیری صاحب امروہہ سے حاصل کر چکے تھے۔ میں ان دنوں کیمبرج اسکول دیرادون میں پڑھ رہا تھا۔ اس لیے یہ کاغذات کب کس کی معرفت اور کس طرح حاصل کیے گئے مجھے اس کی کان و کان خبر نہ ہوئی البتہ قرائن یہ بتاتے ہیں کہ میری عدم موجودگی میں کسی ایسے صاحب سے کام لیا گیا جن کا ہمارے امروہہ کے مکان میں آنا جانا روز مرہ کی بات تھی اور جن پر گھر والوں کو کوئی کسی طرح کا شبہ ہونا ممکن نہ تھا۔" ۲۳۴

اسی طرح دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> "سب سے زیادہ اس بات کا افسوس ہے کہ گو یہ تمام مواد واپسی کے وعدے پر لیا اور دیا گیا تھا مگر ایک کاغذ تک پھر واپس نہ مل سکا۔ مولوی محمد امین صاحب مرحوم کے وعدوں کے باوجود کانفرنس اپنا فرض پورا کر گئی۔ حد یہ کہ کانفرنس نے اس مواد کے جس حصے کو "فضول اور غیر کارآمد" قرار دیا ہے وہ تک ہم کو نہ واپس کر سکی اور یہ لکھ کر کہ "یہ تمام کارآمد مواد اب بھی موجود ہے" گویا ایک طرح اس بات کا اعلان کر دیا کہ فضول اور غیر کارآمد مواد آیا تو تھا لیکن اب موجود نہیں۔ ہاں مگر ہم کو واپس کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔" ۲۳۵

اس طرح کی اطلاعات یا وضاحتیں "عرض حال" میں موجود ہیں۔ آخر میں خطوط کی بے ترتیبی کے سلسلے میں معذرت کرتے ہوئے مشتاق حسین لکھتے ہیں:

> "ایک خاص چیز کا اظہار اس جگہ کر دینا ضروری پایا جاتا ہے۔ راقم الحروف کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ جو خطوط آگے پیش کیے جا رہے ہیں ان کی ترتیب زیادہ بہتر طریقہ پر کی جا سکتی تھی۔ اور اس کی عدم موجودگی میں ہمارے پڑھنے والوں کو خاصی الجھن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دراصل اس وقت صرف خطوط کو یکجا کر دینا ہی ممکن ہو سکا اور جس مزید محنت کی ضرورت تھی اس کی اجازت بعض مجبوریوں نے نہیں دی اور اس اہم کوتاہی کے لیے بالکل صاف دلی کے ساتھ اظہار معذرت کیا جاتا ہے۔" ۲۳۶

"خطوط وقار الملک" میں فہرست کے پیش نظر صرف انھیں کے خطوط نہیں بلکہ دوسرے اشخاص کے خط بھی موجود ہیں۔ تمام خطوط علی گڑھ تحریک کا آئینہ ہیں۔ ان کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> "خطوط سے وقار الملک کی شخصیت اور کردار کے کتنے ہی پہلو اجاگر ہوگئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وقار الملک کی حیات اور کارناموں کے مطالعے کے لیے یہ خطوط ناگزیر ثابت ہوں گے اور ان سے نہ صرف نواب صاحب کے سیرت نگار ہی فائدہ اٹھائیں گے بلکہ علی گڑھ تحریک اور مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی جدوجہد کے مورخ بھی اس بیش بہا ذخیرے سے مستفید ہوں گے۔" ۲۳۷

"خطوط وقار الملک" میں جن اشخاص کا ذکر کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔ وہ مکتوب الیہ کی حیثیت سے ہو یا کسی دوسرے حوالے سے ان کے نام اس طرح ہیں۔ مثلاً: حکیم اجمل خاں، حسین بلگرامی، مولوی چراغ دہلوی، ڈاکٹر اقبال، نذیر احمد، مولانا محمد علی، مولوی عزیز مرزا، مولانا شبلی، داغ دہلوی، خان بہادر مولوی بشیر الدین، نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، حسرت موہانی، جسٹس سید محمود، شیخ سید عبداللہ، نواب مؤید الملک، جسٹس شاہ دین، مولوی ظفر علی خاں، مولوی محبوب عالم، سر محمد شفیع، سر سکندر حیات، مولوی سید محی الدین، نواب سر سالار جنگ اول، سرور

جنگ، مولوی فرید احمد، محمد امین زبیری، مولوی امام الدین، حالی، ڈاکٹر سید حسن، آفتاب احمد خاں، شیو راج بہادر اور سرور زبیر حسن وغیرہ۔

وہ خطوط جو وقار الملک نے لکھے ہیں ان کی تعداد اور مکتوب الیہ کے نام اس طرح ہیں:

نمبر شمار	مکتوب الیہ	تعداد
۱۔	اعزہ	۳۷
۲۔	ناخدا پاکستان جہاز حاجیان	۱
۳۔	سرفاضل بھائی	۱
۴۔	حاجی محمد احمد	۱
۵۔	نواب میر عثمان علی خاں	۱
۶۔	سر جان اسٹریچی اور سر ڈینس فٹز پیٹرک	۲
۷۔	نواب فرامرز جنگ	۱
۸۔	نواب عزیز جنگ	۱
۹۔	سید محمد عبدالقادر	۱
۱۰۔	شیخ اکرم، مدینہ منورہ	۱
۱۱۔	پنجاب کی ایک مقتدر ہستی	۱
۱۲۔	حکیم اجمل خاں (تار)	۱
۱۳۔	میر محبوب علی خاں	۱
۱۴۔	سید حسین بلگرامی	۱
۱۵۔	کبیر الدین	۱
۱۶۔	سر سید احمد خاں	۳
۱۷۔	نواب سر وقار الامرا	۱
۱۸۔	مولوی عزیز احمد	۱
۱۹۔	ریذیڈنسی	۱

مجموعہ "خطوط وقار الملک" میں دیگر اشخاص کے تحریر کردہ خطوط بھی شامل ہیں۔ ان کے نام اس طرح ہیں۔ مثلاً: حالی، شیو راج بہادر، شبلی، حبیب الرحمن خاں شیروانی، سرور زبیر حسن عزیز مرزا، حکیم سید علی، نواب سر فریدون جنگ، عماد الملک، داغ دہلوی، مولوی قدرت اللہ، نواب عزیز جنگ، عماد الملک، جلال الدین نقمی، سر ڈینس پیٹرک، شیخ ابو الحسن، سر سید احمد خاں، جسٹس سید محمود اور آفتاب احمد خاں وغیرہ۔

"مجموعہ مکاتیب" میں شامل نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے درمیان ہوئی مراسلت بھی "خطوط وقار الملک" میں موجود ہے۔ ان خطوط کی کل تعداد انتیس ہے۔ دونوں کی مراسلت پر تبصرہ بھی لکھا ہے۔ دونوں بزرگوں محسن الملک اور وقار الملک کی مراسلت سے متعلق مشتاق احمد لکھتے ہیں:

> "ان صفحات میں ایک نہایت اہم اور دلچسپ باب اس مراسلت کا آپ کی نظر سے گزرے گا جو نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے درمیان ہوئی یہ تمام خطوط جن کی مجموعی تعداد انتیس ہے۔ علی گڑھ کے ایم اے او کالج اور مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد سے متعلق ہیں۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس چیز پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان دونوں حضرات میں ایک دوسرے سے اتنا قرب ہونے کے باوجود اتنی دوری کیوں تھی اور وہ اسباب و محرکات جو اس صورت حال کا باعث ہوئے تھے۔" ۲۴۸

نواب وقار الملک کے خطوط دو مجموعوں کے علاوہ دیگر رسائل میں شائع ہوتے رہے اور سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ نقوش کے مکاتیب نمبر میں نواب وقار الملک کے انیس خطوط درج ہیں۔ خطوط کے مکتوب الیہم کے نام اس طرح ہیں:

سر آسماں جاہ، نواب سید علی حسن، سید افتخار عالم، منشی محمد محمود شاہ، مولوی حسین عطاء اللہ، مولوی بشیر الدین، نواب محسن الملک، سر سید احمد خاں، حکیم محمد عبدالسلام، محمد یونس وغیرہ۔ "نقوش" کے مکاتیب نمبر میں شائع شدہ خط کا ایک خط جو سر آسمان جاہ کے نام ہے، فارسی میں ہے۔ اس میں مقام تحریر درج نہیں۔ اس کے علاوہ خط نمبر ۲ پر بھی مقام تحریر درج نہیں ہے۔ دو خطوط کے علاوہ تمام

خطوط امروہہ سے تحریر کردہ ہیں۔ ان میں بھی دیگر خطوط کی طرح نواب وقار الملک علی گڑھ تحریک کی علم برداری کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

وقار الملک کے خطوط میں قوم کی خدمت کا جذبہ نمایاں ہے۔ وقار الملک کی قابل تقلید فیاضی نے انھیں فارغ البال زندگی نہیں گزارنے دی۔ اپنی تنخواہ کا آدھے سے زیادہ حصہ کم استطاعت عزیزوں، حاجت مندوں اور دوسرے غریبوں کی امداد میں خرچ کرتے تھے۔ کئی کئی سال تک طلب کی خفیہ مدد کرتے تھے۔ ایک جگہ وظیفہ سے متعلق لکھتے ہیں:

"آپ جس وقت علی گڑھ پہنچیں گے تو وہاں آپ کو دس روپیہ، سر صاحب مدرسۃ العلوم سے بتوسط پروفیسر ضیاء الدین احمد صاحب ملیں گے۔ باقی آئندہ کے لیے جس طرح آپ مناسب سمجھیں اسی طرح وظیفہ پہنچتا رہے گا۔"۲۲۹

سر سید احمد خاں نے اپنے ایک مضمون "فیاضی انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین" میں نواب وقار الملک کی فیاضی اور ہر ہر موقع پر کالج کی خدمت اور دیگر امور کی بہت واضح الفاظ میں تعریف کی تھی۔ سر سید احمد خاں وقار الملک سے جب وظیفہ یا فنڈ لینا چاہتے تھے تو اجازت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے۔ سر سید احمد خاں جس قدر، چندہ یا لڑکوں کو وظیفہ کی رقم دینا چاہتے تھے نواب وقار الملک کی منظوری حاصل کیے بغیر ان کی طرف سے اعلان کر دیا کرتے تھے۔ نمونے کے طور پر اس طرح کا ایک خط درج ذیل ہے:

"میں مدرسۃ العلوم کا بجٹ بنا رہا ہوں، اس میں اب کی سال بھی آپ کی طرف سے اسکالرشپ درج ہوگی، جس تعداد سے کہ ضرورت ہوگی، صرف اطلاعاً لکھ دیا ہے، کچھ اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔"۲۳۰

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی نواب وقار الملک اور سر سید احمد خاں کا آپسی خلوص تھا جو سر سید ہال کی عمارت میں آج بھی آشکارا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یادگار سر سید، انتظام میوزیم، محمود منزل، آسمان منزل، سالار جنگ، اسٹریچی ہال، لارنس گیٹ، خاص بورڈنگ ہاؤس، پختہ بورڈنگ ہاؤس، اورینٹل اسکول کلاس غرض یہ کہ ان کے زمانے کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں نواب وقار الملک نے مجموعی طور پر ہزاروں روپیہ چندہ نہ دیا ہو۔

سر سید احمد خاں نے جب مسلمانوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا تو اس کی تکمیل کے واسطے چندہ کی بھی تحریک شروع کی۔ بنارس کے دوران قیام میں پہلے ایک کمیٹی "خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کر کے قوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور بعد میں دوسری کمیٹی بنام "خزینۃ البضاعۃ" اس غرض کے لیے مقرر کی کہ مجوزہ مدرسہ کے لیے وقتاً فوقتاً چندہ وصول کرتی رہے۔ غدر (جنگ آزادی) کے بعد مسلمانوں کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی اور ملک میں ایسے لوگ بہت کم تھے جو یک مشت کوئی بڑی رقم دے سکتے۔ اسی تعلق کا ایک خط درج ذیل ہے:

"میری عزت اور میرا فخر ہوگا اگر آپ میری تنخواہ جس کی تعداد ساٹھ روپیہ ہے میری طرف سے خزانۃ البضاعۃ میں جمع فرما دیں۔ میں پانچ روپیہ مہینہ کے حساب سے جمع کروں گا جس کی پہلی قسط اسی کی تنخواہ سے شروع ہوگی۔ آج یکم جون ہے اس لیے پہلی قسط اس عریضہ کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ یہ بہت ہی ناچیز رقم ہے جو ایسے بڑے کام میں پیش کرتا ہوں اور بلاشبہ اگر سب مسلمان ایک ایک مہینہ کے آمدنی سے ادا دیں تو غالباً کروڑوں روپیہ جمع ہو جانے کی نوبت پہنچ جائے۔ لیکن وقتاً ایسا ہونا فی الحال مشکل معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ جملہ مسلمانوں کو اس کمیٹی کے مقاصد سے مطلع ہوتے ہوئے ایک عرصہ چاہیے۔"۲۳۱

مجموعہ "خطوط وقار الملک" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد سے سبکدوشی کے بعد ریاست بھوپال نے نواب وقار الملک کو اپنے عہدہ نیابت یا وزارت پر طلب کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلے کی مراسلت بھی مجموعہ میں شامل ہے۔ ریاست کی جانب سے آئے خط کی کچھ سطور درج ذیل ہیں:

"اگر آپ کے لیے واسطے نیابت ریاست بھوپال سلسلہ جنبانی کی جاوے تو آپ اس کو منظور فرما کر کیا تنخواہ لیں گے۔"۲۳۲

اس خط کا جواب جو وقار الملک نے دیا تھا وہ کچھ اس طرح ہے:

"جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے عہدہ کے نام کے تعلق سے کچھ عرض کرنے

کی اجازت نہیں سمجھتا۔ عہدہ کا نام چاہے کچھ بھی ہو۔ میں جس چیز کا خواہش مند ہوں۔ وہ آقا کا اختیار و اعتبار ہے اور بس۔ اور تنخواہ کی نسبت یہ ہے کہ در اصل حالانکہ ایک دن بھی میرے کام کو وہاں کسی نے نہیں دیکھا تو امروہہ میں بیٹھ کر میرا یہ عرض کرنا کہ اس قدر تنخواہ سے کم پر رضامند نہ ہوں گا۔ در حقیقت میرے لیے ایک قسم کی بدتمیزی میں داخل ہوگا۔ سرکار عالی دامت اقبالہ و سلطنتہا جو کچھ بھی بالفعل مجھ پر فرماویں اس میں سے مجھ کو کچھ بھی عذر نہ ہوگا اور اس موقع پر شاید مناسب نہ ہوگا کہ اگر میں اپنی حیدرآبادی تنخواہ وغیرہ سے آپ کو مطلع کروں۔"۲۳۴

اس خط میں ریاست حیدرآباد کا ذکر اور وہاں کی ملازمت ترقی، عہدہ اور تنخواہ وغیرہ کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے خطوط بھی بہت طویل ہیں۔ اس مراسلت سے نواب وقار الملک کی سیاسی سوجھ بوجھ کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وقار الملک کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کی ضرورت ہے لیکن ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اندر کانگریس میں شرکت کا خیال پیدا ہونا انتہائی مایوس کن صورت حال کا نتیجہ ہے۔ اس لیے انھوں نے ایک ایسا طریقہ اختیار کرنے کی امید ظاہر کی جو اعتدال پر مبنی ہو۔ اس کے لیے انھوں نے با اثر اور ذی مرتبہ نمائندہ مسلمانوں کا ایک جلسہ ۲۰-۲۱ / اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں منعقد کیا۔ اور بالآخر سہارنپور کے ایک اجلاس عام میں جولائی ۱۹۰۳ء میں "محمڈن پولیٹیکل ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد ۳۰/ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد "آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت نواب وقار الملک نے کی۔ 'پولیٹیکل ایسوسی ایشن' اور "مسلم لیگ" کا ذکر ان کے خطوط میں اکثر ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جناب سرسید صاحب مرحوم و مغفور نے خود اپنے وقت میں آخر الامر رفتار زمانہ سے مجبور ہو کر ایک پولیٹیکل ایسوسی ایشن قائم کی تھی۔ جس کا نام انھوں نے ڈیفنس ایسوسی ایشن رکھا تھا۔ نواب محسن الملک مرحوم ان کے بعد برابر پالیٹکس

میں حصہ لیتے رہے۔ میں جب آنریری سکریٹری کالج کے عہدہ پر مقرر ہوا تو اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ اور کالج دونوں میرے ہاتھ میں رہے۔ چونکہ یہ دونوں کام میں انجام نہیں دے سکتا تھا اور مقتضائے مصلحت بھی نہ تھی کہ یہ دونوں خدمتیں ایک شخص سے متعلق رہیں۔ لہٰذا میں نے لیگ سے معافی چاہی لیکن ایسا کرنے سے میں نے اپنی پرائیویٹ حالت کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور جب ضرورت ہوئی اپنی پرائیویٹ حالت میں پالیٹکس میں شریک رہا ہوں۔"۲۳۴

خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب وقار الملک اپنے ماتحتوں، ملازموں، پڑوسیوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ اپنے ماتحتوں کے حقوق کا خیال کرتے اور ہر طرح سے ان کے حقوق کی حفاظت کرتے تھے۔ خطوط میں ایک مشفق باپ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اپنے فرزند مشتاق احمد کو تعلیم کے لیے دہرادون کے کیمبرج اسکول میں داخل کرانے کے متعلق لکھتے ہیں:

"مشتاق احمد کو اب میں نے دہرادون کے کیمبرج اسکول میں داخل کر دیا ہے۔ جس میں جونیئر و سینئر کیمبرج لوکل امتحانات ہوتے ہیں اور اسی اسکول میں انگلش تعلیم ایک انگلش لیڈی اور ایک دو یوروپین پروفیسر کے ذریعے سے ہوتی ہے اور نصاب تعلیم و نظام تعلیم کیمبرج یونیورسٹی کے مطابق ہے اور پرچے امتحانات بھی وہیں سے آتے ہیں اور وہیں پر سے جانچے جاتے ہیں۔ عربی کی تعلیم میں نے کئی مرتبہ شروع کرائی مگر رہ گئی۔ اب پھر انشاء اللہ عربی کے شروع ہونے کا انتظام کیا جائے گا۔"۲۳۵

خطوط میں ایک جگہ اپنے اعزہ سے مخاطب نظر آتے ہیں تو دوسری جگہ وہ اعزہ خود ان کو مخاطب کرتے نظر آتے ہیں۔ خطوط میں اپنی والدہ محترمہ کے احکام بہت احترام اور محبت کے ساتھ بجا لاتے ہیں۔ اپنی والدہ اور بیگم کو حیدرآباد کے قیام کے دوران اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے کوئی عذر روانگی میں ہوتا رہا اور امروہہ سے حیدرآباد کا سفر برابر ملتوی ہوتا رہتا تھا۔ ان کے ایک تار کے جواب میں امروہہ سے پھر سفر کے التوا کا تار آیا تو اپنی والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جس روز سے تار کا جواب آیا اور معلوم ہوا کہ ارادہ پھر ملتوی ہوا ہے تو میرے دل پر سخت رنج گزرا ہے جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ لوگ جو مجھ سے ملنے آتے ہیں پوچھتے ہیں کہ کیوں طبیعت کا کیا حال ہے تو مجھ کو ان سے کہنا پڑتا ہے کہ حق اچھا نہیں ہے اور حقیقت میں سب کیفیتیں بلا رکی ہیں اور اگر دل پر بھی صدمہ رہا تو اندیشہ ہے کہ کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جاؤں افسوس ہے کہ یہ سارا رنج اور ساری خرابیاں ساس بہو کے شامل رہنے سے ہیں۔" ۳۳۶

لیکن بعد میں ان کو احساس ہوتا ہے کہ کل کے خط کے الفاظ سخت ہو گئے اس لیے دوسرے ہی دن خط کی تلخی کا افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے درحقیقت بہت افسوس ہے کہ میرے کل کے خط سے آپ کو رنج ہوا ہوگا۔ افسوس اس لیے زیادہ ہے کہ میری تمام تر کوشش اور نجات اس میں ہے کہ آپ کو خوش رکھوں۔ بجائے اس کے ایسا موقع پیش آتا ہے کہ آپ کو میری تحریر سے رنج ہو۔" ۳۳۷

نواب وقار الملک نے اپنی پہلی بیگم کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی تھی اور دوسری بیوی کے انتقال کے بعد ایک عقد اور کیا تھا۔ نواب وقار الملک اپنی جائداد میں سے پہلی بیگم صاحبہ کی اولاد کا حصہ ادا کر چکے تھے اور باقی جائداد کو دوسری بیگم صاحبہ کی اولاد مشتاق حسین اور بیٹی مرحومہ کے حق میں وقف علی الاولاد کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت نواب وقار الملک کے فرزند مشتاق حسین کیونکہ بالغ نہیں تھے اس لیے وقف کا ایک متولی مقرر کرنا چاہتے تھے۔ طویل علالت کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے لکھنا تقریباً چھوڑ چکے تھے۔ مگر اپنے فرزند کی کم سنی کے باوجود ان سے مشورہ کرنا چاہتے تھے اور معاملے کی اہمیت کے خیال سے اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے خط تحریر کیا۔ لکھتے ہیں:

"نیاز محمد کا خط آ پہنچا جس سے تمہاری خیریت معلوم ہو کر اطمینان ہوا۔ ایک خاص بات ہے کہ جس ضرورت سے یہ خط تم کو اپنے قلم سے لکھنا پڑا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ مسودہ وقف میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ مشتاق حسین کے بعد فلاں

شخص متولی مقرر ہوگا۔ اگر اس وقت تک مشتاق احمد نابالغ ہوں۔"

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"اس مسئلے کو تمہارے مشورے سے طے کرنا چاہتا ہوں تم اپنی رائے سے واپسی ڈاک اطلاع دو۔" ۳۳۸

نواب وقار الملک نے جو خطوط دوسری بیگم کے نام لکھے ہیں۔ ان میں سنجیدہ اور متین شوہر کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ انداز تخاطب کی شگفتگی اور محاوروں کا بے ساختہ پن سے خطوط کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اپنی پہلی بیگم کے نام لکھے ایک مزاحیہ انداز کا خط درج ذیل ہے:

"روزانہ ایک خط لکھا کرو تو وہ جو میں نے تمہارے روپیوں میں سے پانچ روپیہ منشی کے واسطے لے لیے ہیں وہ پانچ تمہاری تنخواہ میں خطوط کے لکھنے کے واسطے اور بڑھا دوں گا۔ دیکھو مان لو۔ بہت سستا سودا ہے۔ معلوم نہیں تمہاری سمجھ میں آوے گا یا نہیں۔ امروہہ میں تو اگر اشتہار دے دیں کہ ایک چھوٹا سا خط روزانہ لکھنے کی تنخواہ پانچ روپیہ ہے۔ تو ہزاروں آدمی دوڑ پڑیں گے۔" ۳۳۹

نواب وقار الملک کے فرزند اکبر محمد احمد نے دوران تعلیم ولایت میں اپنے والد کی اجازت کے بعد ایک تعلیم یافتہ انگریز دوشیزہ مس شارلی سے شادی کر لی تھی۔ ملک واپسی پر انھوں نے بنگلور میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ۲۸ سال کی عمر میں معمولی سی علالت کے بعد محمد احمد کا انتقال ہو گیا۔ ان سے ایک بیٹی حمیدہ پیدا ہوئی۔ شارلی کے نام لکھے خطوط میں ایک خسر کی ذمہ داریاں ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد شارلی بیگم محمد احمد اپنی بیٹی حمیدہ کے ساتھ ولایت جانے کی خواہش مند تھیں۔ مگر نواب وقار الملک کے خیال میں بچی حمیدہ کو ماں کے ساتھ ولایت بھیجنا مصلحت کے تحت خلاف تھا۔ انھوں نے بہو کے رشتہ داروں کو ہندوستان بلانے کی پیشکش کی اور بہو کو ایک سال کے لیے اپنا ارادہ ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مراسلت کے سلسلے میں ۲ فروری ۱۸۹۸ء کو امروہہ سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ یقیناً اس بات کو دیکھیں گی کہ وہ کوئی ایک طرفہ رائے نہیں ہے۔ بلکہ حتی الامکان دونوں طرف کا اس میں کافی خیال رکھا گیا ہے۔ اور بظاہر اگر کوئی امر

آپ کے لیے اس میں طلیان کا موجب ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ کا سفر
انگلستان کس قدر عرصے کے بعد قرار پاتا ہے اور اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ آپ کا تنہا
تشریف لے جانا اور بچی کو اس عمر میں یہاں چھوڑنا آپ بمقتضائے محبت مادری
گوارہ نہیں کریں گی اور بچی کے سفر انگلستان کے لیے اجازت دینا بحالات
موجودہ میرے امکان سے باہر ہے جس کے لحاظ سے میں بہت ہی منت کے
ساتھ معافی چاہتا ہوں۔" ۱۴۰

شارلی کی بیٹی حمیدہ کا انتقال پانچ سال کی عمر میں ہیضہ کی بیماری سے ہو گیا۔ حمیدہ کے انتقال کے بعد مسز محمد احمد لندن واپس چلی گئیں اور بقیہ ساری عمر بیوگی میں گزار دی لیکن نواب وقار الملک سے سلسلہ مراسلت مرتے دم تک قائم رہا۔ نواب وقار الملک شارلی کے نام خط اردو میں لکھ کر انگریزی ترجمہ اپنے داماد مولوی صبغت اللہ سے کروایا کرتے تھے۔ مسز محمد احمد کے ولایت جانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک آبائی جائداد کا حصہ بیوہ ہونے کے بعد بھی نہ مل سکا۔ حالانکہ نواب وقار الملک ولایت جانے کے برسوں بعد تک ایک معقول ماہانہ امداد بطور خرچ ان کو بھیجتے رہے۔ مگر آخر کار ایک دن وہ اپنے گھر کی مالک بن گئیں تو انھوں نے خود ہی نواب وقار الملک کو مطلع کیا کہ اب میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی ہوں اور اب مجھے آپ کی کسی مالی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی بہو کا اصل خط انگریزی میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی "خطوط وقار الملک" میں درج ہے۔ جب مالی امداد کے لیے مسز محمد احمد نے خود ہی منع کر دیا تو بہو کے نام ایک خط میں مشورہ دیتے ہیں:

"میرا فرض یہ ہے کہ آپ سے کہوں کہ اگر آپ کو اپنی دوسری شادی کا کوئی
موزوں موقع میسر آئے تو آپ اس سے پہلو تہی نہ کریں میں آپ کو یقین
دلاتا ہوں کہ اگر ایسی حالت آپ کے یہاں کی کسی بہن یعنی میری لڑکیوں میں
سے کسی کی ہوتی تو ان کو بھی یہی مشورہ دیتا اور کوشش کرتا کہ میرے مشورے کے
مطابق عمل کیا جاوے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے
مذہب کے مطابق ہے اور کسی سوسائٹی میں بھی معیوب نہیں ہے۔" ۱۴۱

اس خط کے جواب میں مسز محمد احمد نے لکھا کہ:

"میں تو دل میں بیوہ محمد احمد کی حیثیت ہی سے دنیا سے کوچ کرنا پسند کروں
گی۔" ۱۴۲

نواب وقار الملک کے تعلق سے جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں وہ ملک کے سامنے صرف دو حیثیتوں سے پیش ہوئے ہیں۔ ایک حیثیت انگریز سرکار کے ملازم کی اور ریاست نظام کے جلیل القدر عہدہ دار کی ہے۔ دوسری حیثیت سیاسی اور تعلیمی ہے جس میں وہ مسلمانوں کے مسلمہ قائد کی شکل میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مگر ان کی خانگی اور گھریلو زندگی پر زیادہ روشنی نہ پڑ سکی۔ نواب وقار الملک کے خطوط کے ذریعے ان کی زندگی کا خانگی اور گھریلو پہلو کھل کر سامنے آتا ہے۔ پڑوسیوں، دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی بڑی خوبی سے پیش آنے کے علاوہ وہ اپنے ملازموں اور خدمت گزاروں کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آتے تھے۔ پریشانی کے عالم میں ان کا اعتقاد اپنے خدا پر کتنا پکا اور راسخ تھا اس بات کا اندازہ بھی خطوط کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

ان خطوط میں حفظ مراتب کا خیال پورا رکھا گیا ہے۔ مکتوب الیہ کو اس کے مرتبے کے مطابق مخاطب کیا گیا ہے۔ انداز تخاطب اپنے دوستوں اور عزیزوں کے لیے تو طویل اور مختصر دونوں طرح کا ہے لیکن کہیں کہیں رشتہ داروں اور عزیزوں کے لیے مختصر القاب و آداب کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ عزیز من سلامت، بہو کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں، پیاری شارلی فرزند کو لکھتے ہیں کہ بھائی محمد احمد روزے کیسے کٹتے ہیں، چھوٹے فرزند کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔ برخوردار من سلمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

اپنی علالت کا ذکر خطوط میں جگہ جگہ کرتے ہیں۔ طویل علالت کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے لکھنا ہی تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ ایک خط میں جو مولوی محمد بشیر الدین کے نام ہے اس میں اخبار 'البشیر' میں مضمون نہ لکھ سکنے کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھ کو بہت خوشی ہوتی اگر اس میں کچھ لکھ سکتا۔ لیکن طبیعت کچھ ایسی بھی
ہو گئی ہے کہ بہت ہی کم کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ علاوہ اس کے اخبار میں لکھنے
کے لیے جو قابلیت درکار ہے وہ بھی اپنے میں نہیں دیکھتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ
اپنا کوئی دردِ دل ہر شخص کچھ نہ کچھ لکھ ہی لیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی موقع پیش آیا

اور میں کچھ "المشیر" کے لیے کسی وقت لکھ سکا تو وہ خود میری مسرت کا باعث ہوگا۔"[۴۴۳]

کتاب "حیات النذیر" کے مصنف سید افتخار عالم نے اپنی ایک کتاب نواب وقار الملک کو تبصرہ کے لیے بھیجی لیکن نواب وقار الملک اپنی طبیعت کی ناسازی کے سبب اس کتاب پر تبصرہ نہیں لکھ سکے۔ اپنی خراب صحت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید افتخار عالم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری حالت صحت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں اس عمدہ کتاب کو بالاستیعاب دیکھ بھی سکوں جس کے بدوں ریویو لکھا نہیں جا سکتا اور نہ اب دماغ میں اتنی طاقت ہے۔"[۴۴۴]

مجموعہ "خطوط وقار الملک" میں کچھ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ ایسے ہیں جنھیں علی گڑھ کے قریب رہ کر کام کرنے کا موقع ملا لیکن بہت سے افراد ایسے بھی ہیں جنھوں نے علی گڑھ سے دور رہ کر خاموشی کے ساتھ سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کا دائرہ بڑھانے میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ نواب وقار الملک کے ایک مکتوب الیہ فرید احمد جو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے، اسی زمرے میں آتے ہیں۔ بقول مشتاق احمد:

"مولوی فرید احمد صاحب نظامی ساکن امروہہ نواب وقار الملک بہادر کے بڑے مداح اور ان کے مخصوص احباب میں سے تھے۔"[۴۴۵]

خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب وقار الملک ان کو مختلف کاموں میں شریک رکھتے تھے۔ امروہہ میں ایک مدرسہ "تاج المدارس" نواب وقار الملک کی کوششوں سے قائم ہوا۔ اس کے سالانہ امتحان میں مدد کے لیے فرید احمد کے نام لکھے خط سے وقار الملک کے امروہہ میں قیام کے دوران تعلیمی سرگرمیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خط درج ذیل ہے:

"ایک چھوٹا سا مدرسہ انگریزی جاری ہے تاج المدارس بطور برانچ ہائی اسکول کے ہمارے محلہ میں واقع ہے اس کے سالانہ جلسہ امتحان میں مہربانی سے کچھ مدد فرما کر مشکور کیجیے اور اگر مہربانی سے اس کو آپ منظور کریں تو تشریف بھی

لائیے تا کہ بالمشافہ اس میں مشورہ ہو جاوے۔"[۴۴۶]

نواب وقار الملک کی غیر معمولی قومی خدمت کے جذبے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد جب نواب محسن الملک سکریٹری ہوئے تو کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے طریقۂ کار سے لوگوں کو شکایت ہونے لگی۔ ایک دن فرید احمد نظامی نے ان سے کہا کہ "ہم لوگوں کو افسوس ہے کہ ایسی خرابیاں ان صاحب کے نوٹس میں آ رہی ہیں۔ اور آں جناب امروہہ میں مقیم ہیں۔ علی گڑھ تک تکلیف گوارہ نہیں فرماتے۔" فرید احمد کی اس بات کا جواب اس طرح خط لکھ کر دیتے ہیں:

"بیشک میں علی گڑھ پہنچ کر کالج کی اصلاح حالت میں حصہ لے سکتا تھا مگر تم کو معلوم ہے کہ میرے اور نواب محسن الملک کے اصول مختلف اور متضاد ہیں۔ وہ اگر پورب کو جاتے ہیں تو میں پچھم کو۔ میں علی گڑھ چلا جاؤں گا اور اصلاح حالت کی کوشش کروں گا تو ضرور ایک زبردست جماعت میرے ساتھ ہوگی اور کچھ ان کے ساتھ مگر مسلمانوں کے کام میں رخنہ پڑ جائے گا۔"[۴۴۷]

سرسید نے ایک مرتبہ ان کے استقلال رائے سے اختلاف کرتے ہوئے برہم ہو کر لکھا تھا کہ "مجھ کو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں ہیں۔"
[۴۴۸]

خطوط کے مطالعے سے نواب وقار الملک کی اخلاقی جرأت، حق گوئی، بے خوفی اور آزادیٔ رائے کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مذہبی معاملہ ہو یا کالج کا کوئی مسئلہ، سرسید احمد خاں ہوں یا مدار المہام ان کی بے باک رائے میں کوئی مخل نہ ہو سکتا تھا۔ قانون ٹرسٹیاں کے تحت کالج سکریٹری شپ کے تنازعہ میں سرسید احمد خاں اپنا جانشین سید محمود کو بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی رائے سے متعلق جو خط لکھا تھا اس کے ایک ایک لفظ سے ان کے بنیادی اوصاف عیاں ہیں۔ اس خط میں ان کا لہجہ، سرسید احمد خاں کا ادب و احترام، اعلیٰ روایت کی پاسداری اور اپنی اظہار رائے میں آزادی کی مجبوری سب کچھ چند جملوں میں سمٹ آیا ہے۔ خط درج ذیل ہے:

"قوی اندیشہ ہے کہ اس کے بعض مطالبات اور خصوصاً اس کا وہ حصہ جس سے

ضرور آپ ملال خاطر کا باعث ہوں گے لیکن جن مجبوریوں سے میں ان کے لکھنے پر مجبور ہوں ان کا بیان بھی میں نے ان کے ساتھ ہی کر دیا ہے اور اگر کوئی معذرت آپ کے اس ملال کو ختم کر سکتی ہے تو جس قسم کی معذرت ہو۔ میں اس کے پیش کرنے میں اپنا فخر سمجھوں گا۔

آج چھٹا دن ہے جو میں اس رائے کا مسودہ لکھ چکا ہوں۔ اس تمام عرصے میں میں نے برابر سوچا کہ آیا اس مضمون کو میں رہنے دوں یا خارج کر دوں لیکن فقط اس خیال نے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ ایک قومی کام ہے۔ لہٰذا جو کچھ میری رائے میں آیا میں نے اس کا کرنا اپنے اوپر فرض سمجھا۔"۱۴۹

"مکاتیب" میں شامل خطوط سے معلوم ہوتا ہے دونوں بزرگوں یعنی نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے درمیان قومی معاملات کے باعث اختلافات تھے۔ مگر دونوں کے دلوں میں وہ چنگاری ہی نہ تھی جو شعلہ پیدا کرتی ہے۔ دونوں میں جو تعلقات تھے اور تعلقات میں جو محبت اور احترام تھا وہ ایک مثال ہے اور اس کا اندازہ بھی "مکاتیب" میں شائع خطوط سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ خود محسن الملک کو اس اختلاف کا اعتراف تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے آپ اپنا مددگار اور جو نہ پاویں گے ہم مل کر خوب کام کریں گے اور دنیا کو دکھاویں گے کہ دو مختلف الخیال، مختلف الطبیعت، مختلف الرائے مل کر قومی کام کیسے اتحاد اور اتفاق سے مل جل کر چلاتے ہیں۔"۱۵۰

نواب وقار الملک ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میں حتی الامکان آپ کے ساتھ کسی شدید اختلاف سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا۔ تاکہ لوگوں کو غلط فہمی سے یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ حیدر آباد کے بعد پھر ان لوگوں میں وہی جھگڑا یہاں بھی شروع ہوا۔ وہاں انھوں نے ریاست کو تکلیف میں مبتلا کیا اور یہاں کالج کو نقصان پہنچاویں گے۔ حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ حیدر آباد میں بھی میرا اور آپ کا کوئی نزاع کبھی نہیں تھا۔"۱۵۱

خطوط کی شخصی اور ادبی اہمیت ہوتی ہے جن کے ذریعہ مکتوب نگار کی شخصیت، سیرت یا اس کے

کردار کے بنیادی اوصاف کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ لیکن خطوط کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے مکتوب الیہ کی خوبیوں پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نواب محسن الملک سے متعلق وہ خط پیش کیا جا سکتا ہے جو نواب وقار الملک نے امروہہ سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو بنام امام الدین تحریر کیا تھا۔ اس خط سے نواب محسن الملک کی قومی خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ان کی وفات کے بعد ان کے رفیق کی زبان قلم پر آئے۔ لکھتے ہیں:

"نواب محسن الملک کے سانحے نے کمر توڑ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ وہ اپنے بعد قوم میں کوئی اپنی سی قابلیت کا شخص نہیں چھوڑ گئے۔ آسمان جب بہت کچھ چکر کھاتا ہے، تب کہیں اس طبیعت کے بزرگ پیدا ہوتے ہیں اور آئندہ تو اس نسل کے بزرگوں کا پیدا ہونا ظاہراً محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکچرار ہوں گے۔ انجنیئر ہوں گے، فلاسفر ہوں گے، قوم کے ہمدرد بھی پیدا ہوں گے، یہ سب کچھ ہوگا لیکن افسوس نواب محسن الملک کی سی خوبیوں کا اثر دیکھنے میں نہ آئے گا۔"۱۵۲

وقار الملک کے خطوط سے ان کی شخصیت، سیرت، گھریلو زندگی، مہربان والد، متین شوہر، دوستوں کے دوست، پڑوسیوں کے محسن اور ملازمین کے خیر خواہ کی حیثیت سے ان کے مرتبہ و سیرت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط تاریخی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ ان میں بھوپال، حیدر آباد، امروہہ اور علی گڑھ کا تذکرہ ہے۔ ریاستوں سے متعلق اشخاص و اکابر کی خدمات اور کارناموں سے متعلق اہم اطلاعات فراہم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ مذہبی معاملات مثلاً نماز، روزہ، سود، شیعہ و سنی تنازعات، سیاسی و سماجی حالات سے آگاہی ہوتی ہے، اس لیے ان خطوط کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔



شبلی نعمانی

بیسویں صدی بڑی تبدیلیوں کی صدی رہی ہے۔ اس صدی میں ان لوگوں کے ادبی کارنامے ظہور پذیر ہوئے جنھوں نے اس صدی کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات کو محسوس کیا اور انھیں اپنے فکر و خیال کا وسیلہ بنا کر اپنے خطوط میں بے لاگ انداز میں پیش کیا، اردو ادب کی رومانی تحریک کے اثرات اس دور کے بہت سے ادیبوں نے قبول کیے۔ انھیں لوگوں نے دورِ سرسید میں نئی شاعری اور نئی نثر نگاری سے متعلق یادگار زمانہ کارنامے انجام دیے۔ علامہ شبلی کے خطوط رومانی انشا پردازی کی فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی جدید اردو نثر کے بانی و معمار اور سرسید احمد خاں کے ممتاز رفیقوں میں تھے۔ سرسید کے اثر میں آنے کے بعد ہی شبلی نعمانی نے وہ کتابیں لکھیں جو اردو ادب کی جان ہیں۔ وہ سرسید تحریک کے روحِ رواں اور بڑے علم بردار تھے۔

علامہ شبلی نعمانی جس طرح اردو کے قد آور نقاد اور سوانح نگار ہیں، اسی طرح اردو مکتوب نگاری میں بھی انھیں بلند اور منفرد مقام حاصل ہے۔ غالب نے اردو مکتوب نگاری میں جس طرز کی بنیاد رکھی وہ انھیں کی شخصیت کا جز بن کر رہ گئی، اسی طرح شبلی کے خطوط کی خصوصیات بھی کسی اور میں پیدا نہ ہوسکیں۔ شبلی کے خطوط میں روانی، سلاست، دلکشی اور اختصار ہے۔ شبلی کی تحریروں کی سب سے نمایاں خوبی ایجاز و اختصار ہے۔ دوسرے کئی کئی صفحات میں بیان کرتے ہیں، شبلی وہی بات چند سطروں میں بیان کر جاتے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت جس خوبی کے ساتھ ان کے خطوط میں ظاہر ہوئی ہے، کسی اور جگہ نہیں۔ شبلی کے مکاتیب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"سرسید کا دور اپنے بے تکلف اندازِ بیان کے لیے امتیاز رکھتا ہے۔ طرزِ بیان

میں خاص لطیف روح اگر کہیں جلوہ گر ہے تو شبلی کے خطوط و مکاتیب میں، ان کے خطوط میں ذوق و شوق اور دل و دماغ کو سیراب و شاداب رکھنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ گو اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر خط گویا زعفران کا پھول ہے جس میں باغ بہشت کی خوشبو ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان کے خط بالکل مختصر ہوتے ہیں، ایجاز یوں بھی شبلی کی تحریر کا خاصہ ہے۔ مگر جو ایجاز ان کے خطوط میں ہے، اس کو جانِ اعجاز ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان کی مکتوب نگاری فرصت اور وقت گزاری کا مشغلہ نہیں، ان کا ہر خط کسی جمیل یا جزیل مقصد سے وابستہ ہے۔ ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کی اہمیت جانتے تھے اور اس کی قدر کرتے ہیں۔ لہٰذا زندگی کا ایک لمحہ بھی ان کے نزدیک رائیگاں نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے شاید ان کے خط کا ایک لفظ بھی بیکار اور بے ضرورت نہیں۔" ۲۵۳

شبلی نعمانی کے متفرق خطوط رسائل و کتابوں کی زینت ہیں لیکن باقاعدہ شبلی کے خطوط کے تین مجموعے شائع ہوچکے ہیں:

(۱) مکاتیب شبلی: مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبع شاہی لکھنؤ، حصہ اول، ۱۹۱۶ء۔ یہ مجموعہ ۳۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مکتوب الیہم کی تعداد ۱۴۰ ہے اور خطوط کی تعداد ۳۹۸ ہے۔ پہلا خط سرسید احمد خاں کے نام ہے جو ۲۵ رمئی ۱۸۹۲ء کو قسطنطنیہ سے لکھا گیا۔

(۲) مکاتیب شبلی: مرتبہ سید سلیمان ندوی، حصہ دوم، طبع اول، ۱۹۱۷ء، مطبع معارف اعظم گڑھ۔ یہ مجموعہ ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں عربی و فارسی کے خطوط بھی شامل ہیں۔ اردو خطوط صفحہ نمبر ا سے صفحہ نمبر ۲۳۵ تک درج ہیں۔ خطوط کی تعداد ۳۳۷ ہے۔

مکاتیب شبلی کے دونوں مجموعے دوسری بار مطبع معارف اعظم گڑھ سے پہلا حصہ ۱۹۲۸ء میں اور دوسرا حصہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے۔

(۳) خطوطِ شبلی: مرتبہ محمد امین زبیری۔ پہلی بار یہ مجموعہ لاہور سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مرتب نے ۱۱ صفحات پر مشتمل دیباچہ لکھا ہے۔ مقدمہ بطور خط مولوی

عبدالحق نے لکھا ہے۔ صفحہ ۴۳ پر شبلی کے خط کا عکس بھی ہے۔ عطیہ بیگم کے نام خطوط کی تعداد ۵۵ ہے۔ بنام زہرا بیگم تعداد خطوط ۳۴ ہے۔

خطوطِ شبلی دوسری بار وہ مجموعہ جس کو محمد امین زبیری نے مرتب کیا۔ ۱۹۲۶ء میں آگرہ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول جس میں خطوط بنام عطیہ فیضی جس میں ۵۵ خطوط شامل ہیں اور جو ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء کے عرصے پر محیط ہیں۔ حصہ دوم میں زہرا بیگم کے نام خطوط کی تعداد ۳۴ ہے۔ یہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۴ء کے عرصہ پر محیط ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۳۳ صفحات پر مشتمل ہیں۔

(۴) علامہ شبلی کے کچھ خطوط "باقیاتِ شبلی"، مرتبہ مشتاق حسین، میں بھی شامل کیے گئے ہیں جو اور کسی مجموعے میں نہیں ملتے۔ اب یہ مجموعہ کمیاب ہے۔

شبلی کا اپنا ایک الگ انداز تحریر ہے۔ وہ کسی کا مقلد ہونا پسند نہیں کرتے مگر پھر بھی غالب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ برجستہ وبے باک اندازِ فکر اور برمحل طریقہ رسائی غالب کے خطوط کا امتیازی وصف ہے۔ غالب کے خطوط کا یہ دل آویز عکس شبلی کے یہاں بھی موجود ہے۔ غالب کی طرح شبلی بھی اپنے خطوط سے بے نیاز رہے اور اپنی دوسری علمی وادبی تحریروں کے مقابلے میں انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب غالب کے خطوط کو شائع کرنے کا خیال ہرگوپال تفتہ اور منشی شونارائن آرام کے ذہن میں آیا تو غالب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان کی اشاعت میری شہرت کے منافی ہے اور کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر لکھا ہو۔ اسی طرح جب شبلی سے بذریعہ خط شیخ رشید انصاری نے خطوط شائع کرانے کی اجازت طلب کی تو انھوں لکھا کہ:

"میرے خطوط بالکل بے مزہ ہوتے ہیں ان کو جمع کرتے ہوئے مجھے خود مزہ نہیں آتا تو اوروں کو کیا آئے گا۔" ۲۵۴

سید سلیمان ندوی کے بھی حوصلے پست ہو جاتے اگر انھوں نے چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں جیسی جرأت سے کام نہ لیا ہوتا ۲۵۵ شبلی کے خطوط کا بھی یہی حال ہوا کیونکہ پہلے تو سید سلیمان ندوی کے "الندوہ" میں اعلان کرنے پر شبلی نے برہمی کا اظہار کیا مگر بعد میں راضی ہو گئے اور ۱۹۱۰ء میں مولوی حبیب الرحمن خاں شیروانی کو لکھا کہ سید سلیمان ندوی ان کے خطوط جمع کر رہے ہیں۔ کچھ خطوط غلطی سے محفوظ رہ گئے ہوں گے۔

مہدی حسن افادی مولانا شبلی نعمانی سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ خطوط کی اشاعت کے سلسلے میں ان کے جذبات وکیفیات کا ذکر کرتے ہوئے آفاق احمد لکھتے ہیں:

"مہدی افادی اس بات کے لیے بڑے فکر مند تھے کہ شبلی کے خطوط کی اشاعت عمل میں آئے۔ "الناظر" کی ایک اشاعت میں ظفر الملک نے شبلی کے مکاتیب کے بارے میں سرد مہری کا مظاہرہ کیا تو مہدی کو بہت دکھ ہوا اور انھوں نے اس کی شکایت اپنے ایک خط میں سید سلیمان ندوی سے بھی کی کیونکہ مہدی کے نزدیک ظفر الملک کا یہ اقدام "غیر قانونی لٹریچر کی حق تلفی" کے مترادف تھا۔" ۲۵۶

جو خطوط علامہ شبلی نعمانی نے اپنے دوستوں، بزرگوں اور شاگردوں کو لکھے ہیں، ان کی نمایاں صفت ان کا ایجاز واختصار اور خلوص ہے۔ یہ ایجاز واختصار محاورات، تشبیہات، استعارے ومجاز نیز کنایہ اور جگہ جگہ مبالغہ کی شمولیت سے اپنا الگ رنگ لے کر سامنے آتا ہے۔ عبارت کا حسن غزل کے اشعار کا لطف دینے لگتا ہے۔ شبلی کے خطوط میں جو اختصار ملتا ہے اس کی وجہ سے بقول سید سلیمان ندوی "ان کی بیوی مختصر خط کو "تار" کہا کرتی تھیں۔" ۲۵۷ نہایت مختصر لکھتے تھے، کبھی کبھی صرف "ہاں ہاں" پر اکتفا کرتے۔ مفصل اور طویل سوالوں کے جواب بھی وہ ایک فقرے میں دیتے۔ شبلی کے ایجاز کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

"اس قدر روشن ارباب وفا ہو جاتا"

شبلی ۱۰ رمئی ۱۹۱۱ء لکھنؤ" ۲۵۸

اس ایک مصرعی خط نے ہزاروں شکووں کا نچوڑ پیش کر دیا جس میں کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ مکتوب الیہ سے بے تکلفی اور قربت کا احساس دلاتا ہے۔

شبلی کے ابتدائی خطوط میں کسی قدر طوالت بھی ملتی ہے۔ شروع کے خطوں سے ذہن قدرتی طور پر علی گڑھ اور اس کی مخصوص فضا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ شبلی جدید تعلیم کے اثرات اور نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ علی گڑھ پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ہی اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی محمد سمیع کو علی گڑھ کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھ کو آج کل تاریخ بنی العباس کی پڑی ہے۔ یہاں آ کر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مکمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے لاحول ولا، تو وہ لوگ تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔ سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے۔ صرف تین شخص کو مستثنیٰ کرتے تھے وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔" ۲۹؎

سرسید احمد خاں اور علی گڑھ نے شبلی کی شخصیت کو نکھارا لیکن شبلی کو مذہبی اور سیاسی معاملات میں سرسید احمد خاں سے اختلاف تھا۔ سرسید کو بھی شبلی سے اختلاف رائے تھا مگر دونوں نے اس بات کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ صرف "الفاروق" کے بارے میں سرسید نے شبلی کو یہ کتاب نہ لکھنے کی رائے دی تھی۔ شبلی جدید تعلیم کے خلاف نہیں تھے، وہ چاہتے تھے کہ طالب علم مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کریں۔ شبلی جب ندوہ (مدرسہ ندوۃ العلوم) میں تھے تو ایک طالب علم ضیاء الحسن انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ اپنے شاگرد مولانا ضیاء الحسن کو لکھتے ہیں:

"میاں ضیاء الحسن علی گڑھ کالج میں تعلیم کے لیے جاتے ہیں۔ تم کو ایک خط ان کی معرفت کا ڈاکٹر ہارویز کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دو۔ میں ان کو بھیج دوں گا۔" ۳۰؎

مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے شبلی کا تعلق، ان کی تعمیر پذیر شخصیت، ان کے بدلتے ہوئے مزاج کا عکس ان کے خطوط میں پوشیدہ ہے۔ سرسید سے شبلی نعمانی کی کس طرح بنی اور کیونکر بگڑی، علی گڑھ کا قیام، سرسید کے کتب خانے سے استفادہ اور دیگر حالات کا علم شبلی کے خطوط سے ہوتا ہے۔ شبلی

کا خیال تھا کہ جدید تعلیم مسلمانوں کو مذہب سے دور کر رہی ہے لیکن جب علی گڑھ کے طلبہ نماز اور روزے کے پابند ہوتے ہیں تو حکیم محمد عمر کے نام ایک خط میں اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"اس وقت نہ مجھ سے میری طبیعت کا حال پوچھیے، نہ کوئی اور واقعہ آپ سنیے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں۔ یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ جنت الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک بی اے سکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پر اثر نعرے سے چونکا دیتا ہے "الصلوٰۃ خیر من النوم" پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں، اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے، بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔" ۳۱؎

شبلی نعمانی نے اسلامی ممالک کی سیر کا منصوبہ بنایا اور مسٹر ارنلڈ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے۔ دوران سفر مسٹر ارنلڈ یورپ چلے گئے اور شبلی بیروت، سائیبریا، سمرنا دیکھتے ہوئے ۲۳ مئی ۱۸۹۲ء کو قسطنطنیہ پہنچے۔ اس سفر سے شبلی کا اصل مقصد قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا۔ شبلی نے وہاں کے ہر کتب خانہ اور ہر نادر کتاب کا مطالعہ کیا۔ کتب خانوں کے علاوہ شبلی وہاں کے مدارس اور طرز تعلیم سے بہت متاثر ہوئے۔ شبلی کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا ہر لحظہ خیال رہتا تھا۔ قسطنطنیہ سے سرسید احمد خاں سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک خط میں سرسید کے مدرسۃ العلوم کو ایک خاص رنگ دینے کے لیے قومی لباس کا مشورہ دیتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں:

"یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی کہ ہر کالج کا خاص لباس ہے اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام لکھا ہوتا ہے۔ مجھ کو یہ بات نہایت پسند ہوئی۔ ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا۔ سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا

289-288

ہوگا۔''۶۲ع

علامہ شبلی کے خطوط علمی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جب ہندوستان کے مشہور کتب خانوں سے ان کی پیاس نہ بجھی تو انھوں نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ وہاں کے کتب خانے انھیں علوم و فنون کے عجائب خانے لگے۔ ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں:

> ''کتابیں یہاں عجائب و غرائب ہیں لیکن حیرت کے سوا کچھ حاصل نہیں نہ نقل ہوسکتی ہے نہ حافظہ ان کے لیے کافی ہے۔ ہر روز دو تین میل پیادہ پا سفر کرتا ہوں کیونکہ کتب خانے دور دور واقع ہیں۔''۶۳ع

مولانا شبلی کے ابتدائی خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں سرسید کا کس قدر پاس تھا اور یہ سرسید کی عظمت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے شبلی جیسے نوجوان کی ہمت افزائی کی بلکہ اس سے استفادہ کرنے میں بھی مطلق نہیں شرمائے۔ اس طرح مولانا کے حوصلے بلند ہوتے گئے اور ان کا مطالعہ گہرا اور مقبولیت کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا۔ مولانا سرسید کے کتب خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''تصانیف کا شوق ابتداً مجھ کو تاریخی تصانیف کے دیکھنے سے ہوا تھا۔ جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر بہت ساری کتابیں مجھ کو یکجا ملی تھیں جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔''۶۴ع

شبلی کے خطوط ان کی سیرت و شخصیت، جذبات و خیالات، احساسات و رجحانات اور اعمال و افعال کی صحیح معنی میں عکاسی کرتے ہیں۔ انداز میں شوخی اور طرزِ اظہار میں بے باکی اور بے ریائی ہے اور قدم قدم پر قومی و ملی خدمات کا جوش اور جذبہ نمایاں ہے۔ ان کے خطوط کے بارے میں خورشید الاسلام نے لکھا ہے:

> ''شبلی کے خطوط ہمارا قومی اعمال نامہ ہیں۔ ان میں شبلی کی خانگی زندگی نمایاں نہیں ہے لیکن پس پردہ جلووں کی ایسی کمی بھی نہیں ہے۔ بہر حال ان خطوط میں ندوے کے نقوش ہیں۔ سیرت پر مکالمات ہیں۔ شعرالعجم کے مباحث پر گفتگو ہے، نادر کتابوں کی دریافت پر خوشی کا اظہار ہے۔ تبصرے ہیں تنقیدی اشارات

> ہیں۔ دوستوں کی سرگوشیاں ہیں عزیزوں کی سفارش ہے اپنی عظمت کا شعور ہے اور وہ لطائف ہیں جو دوستی و ربط کے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔''۶۵ع

خطوطِ شبلی کی اسلوب کی ایک نمایاں صفت عبارتوں کا خوبصورت اتار چڑھاؤ بھی ہے جس کی اہم وجہ شبلی کے مزاج کی رومانیت اور ان کا وہ انداز جو ایک خطیب کے بجائے ایک شاعر کا نرم و نازک لب و لہجہ ہے جس میں فضیلت اور علمیت کے ساتھ شبلی کے ادبی و شعری احساسات اور انسانی جذبات کو بھی بڑا دخل ہے۔ جملوں کی بناوٹ استعارات و تراکیب سے آراستہ ہے۔ اس کی وجہ ان کا ذوقِ جمال تھا جس نے ان کے خطوط میں نثری شاعری کی تصویرِ جمیل پیش کردی۔ خطوط میں جملوں کے ترتیبی آہنگ سے شعریت جھلکتی ہے اور صوتی آہنگ کو بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

خطوط نگاری میں شبلی کا کوئی متعین اسلوب نہیں تھا بلکہ مخاطب کے معیار و مذاق کے مطابق ان کا طرزِ بیان بدلتا رہتا تھا۔ کبھی مفصل خط لکھتے تو کبھی ایک دو جملوں پر ہی اکتفا کر لیتے تھے۔ القاب و آداب کی پروا کیے بغیر مدعا بیان کر دیتے تھے۔ جن دوستوں سے بے تکلف ہوتے، انھیں خطوط بھی بے تکلفانہ لکھتے۔ مولانا شیروانی ندوہ کے ادارۂ تحریر میں شبلی کے ساتھیوں میں سے تھے اور شبلی سے بڑی یگانگت اور تعلق رکھتے تھے۔ شبلی کے خلوص، بے لوث جذبات اور شوقِ خدمت کا اندازہ ان کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''ایک ہمارے روشن خیال شیروانی ہیں جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں۔ ان کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے۔ بڑی مشکل سے مسلمانوں میں انگریزی پھیلاتے پر راضی ہوئے تو عمل درآمد میں حیران ہیں۔ حالانکہ تمام طالب علموں کی انگریزی پڑھانا مقصود نہیں نہ میرا یہ خیال ہے صرف اس قدر مقصود ہے کہ وہ چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں۔ اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی۔ ان ہمتوں پر کوئی کیا کر بیٹھے۔ ندوے کے لیے یہ بڑا نازک موقع ہے۔''۶۶ع

خطوطِ شبلی کی عبارت کی خوبی اشعار کے انتخاب اور ان کی پیش کش سے بھی وابستہ ہے جس

سے ان کا اسلوب اور زیادہ دلکش اور جاندار ہو جاتا ہے۔ فارسی و عربی کے مصرعے والفاظ ان کے شگفتہ و رواں دواں اسلوب کے حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں اور نثر میں محاکات نگاری اور سہل ممتنع کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اپنے دوست اور ساتھی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے اعظم گڑھ پہنچنے کی خبر سن کر خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"کیا آپ واقعی جلوہ فرما ہوں گے اور کیا حقیقت میں میرے ویرانے میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی۔ نامہ والا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں "یہ بچ بچ یہ صرف انھیں کے قلم کے ہیں۔" ۶۷؎

علامہ شبلی نعمانی ندوے کے بانیوں میں سے تھے۔ علی گڑھ میں جدید تعلیمی علوم اور انگریزی کا غلبہ ان کی ناگواری کا سبب بنا اور انھوں نے ندوہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ندوہ کو ایک مثالی تعلیمی ادارہ بنانے کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مولانا شبلی ندوے کی دینی اور روایتی تعلیمات کے نصاب کو چند خاص عربی کتب اور انگریزی سے مرتبع کرنا چاہتے تھے اور اپنے اسی طرز فکر کی وجہ سے ندوے کے علما سے ان کے اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں شبلی نے ندوہ سے علاحدگی اختیار کر لی اور اعظم گڑھ چلے گئے۔ خطوط شبلی میں ندوہ کا اتنا ذکر موجود ہے کہ ان سے نہ صرف اس عہد کے ندوہ کی صورت حال کا علم ہوتا ہے بلکہ وہ تنازعات اور بحثیں بھی واضح ہو جاتی ہیں جن سے شبلی کو دو چار ہونا پڑا۔ ندوہ سے متعلق خطوط سے کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

"باوجود اس کے کہ میں کمیٹی سے خارج رکھا گیا ہوں۔ رسالہ میں مجھ کو دخل نہیں تو کیا مجھ سے دعا گوئی اور طلبا نوازی کا کام اپنا مقصود ہے۔ مجھ کو یہ پسند نہیں کہ ایک مذہبی مجلس میں شریک ہو کر جوڑ توڑ کروں اپنا اثر بڑھاؤں اور مخالف کو شکست دوں۔ اس جنت سے دوزخ بھلی اس مردوں سے نامردی بہتر۔ بھئی! ہم مسلمانوں کی فطرت خدا نے بالکل چوکری ہے آپ کیا کریں گے اور کوئی کیا کرے گا۔ جس کا جی چاہے سکریٹری مددگار ناظم وغیرہ وغیرہ بن لے اور اس عزت پر اترا لے باقی کام ہونا ہے تو قسمت ہی میں نہیں پھر کیا فائدہ۔" ۶۸؎

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"میرے خلاف چند خود غرضوں نے ندوے کے معاملے میں جو طوفان مچایا، آپ نے سنا ہی ہوگا۔ لطف یہ کہ شرکت سب نے کی اور سب الگ ہیں اور لطف یہ کہ گورنمنٹ افسروں سے گورنمنٹ ہی کا پہلو ظاہر کرتے ہیں اور سرخ رو ہوتے ہیں۔" ۶۹؎

ان خطوط سے شبلی کی مایوسی، جذبات اور طنز کا اندازہ ہوتا ہے۔ خطوط شبلی میں عربی و فارسی کی برجستہ تراکیب ومحاورات وضرب الامثال بے اختیار اور غیر ارادی طور پر قلم سے ٹپک پڑتے ہیں، جس میں ان کی کسی شعوری کاوش کو دخل نہیں ہوتا۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

"بھائی تم خط و کتابت ترک کر دی ہے کہ ایا اس احدی الرئیسین لیکن تم نے رو رو کر ایک چرکا لگا دیا۔" ۷۰؎

"قدر افزائی سن اور والا نامہ مدت کے بعد ملا آپ نے اپنی معرفی کی ناحق تکلیف اٹھائی۔" ۷۱؎

ادب اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر ادبی کاوش کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی حد تک تنقیدی شعور لازمی ہے۔ مولانا اس تنقیدی شعور کی وجہ سے دوسروں کی تصنیفات کا ہی نہیں بلکہ اپنی کا بھی غیر جانب داری سے جائزہ لیتے ہیں۔ کیونکہ خطوط شبلی میں ادبی نکات اور تنقید ادب کے متعلق بھی مواد ملتا ہے اس لیے خطوط کے مطالعے سے شبلی کے عمیق مطالعہ اور گہری سوجھ بوجھ اور سلجھے ہوئے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خیام کی یورپ نے قدر کی لیکن اگر وہ طالبی استر آبادی سے واقف ہوتے تو جس کی دس ہزار فلسفیانہ رباعیاں موجود ہیں تو ان کی اور بھی آنکھیں کھلتیں کئی سو رباعیاں اس کی میرے پاس موجود ہیں کبھی بھیجے گا۔" ۷۲؎

مولانا شبلی کے خطوط علمی و ادبی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ علم الکلام کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے علم الکلام نہایت ناتمام کتاب لکھی اور در حقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے۔" ۷۳؎

۱۸۸۳ء میں جب شبلی علی گڑھ آئے تو سرسید کی رفاقت، کالج کے طلبا اور اساتذہ کے درمیان رہنے اور ملنے کے مواقع فراہم ہوئے تب اردو شاعری میں بھی باعتبار کیفیت و کمیت اضافہ ہونے لگا۔ علی گڑھ کے ابتدائی دور میں وہ بحیثیت شاعر نمایاں رہے۔ اردو شاعری کی نسبت انھوں نے اپنے خطوں میں زیادہ اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ غالب کی طرح وہ بھی اپنی فارسی شاعری کو ہی پسند کرتے تھے اور اردو شاعری کو محض تفریح طبع یا قومی ضرورت کے تحت رکھتے تھے لیکن آزاد اور حالی کی موضوعاتی نظمیں انھیں متاثر کرتے تھیں۔ اس دور کے خطوط میں ان کی بعض اردو غزلیں نظر آتی ہیں۔ انھیں خطوط میں بعض جگہ انھوں نے اپنی شاعری کے چرچے بھی کیے ہیں۔ ایک خط میں غزل کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کرلیتا ہوں۔ رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی۔ دو تین شعر مزے کے ہیں تمھیں بھیجتا ہوں۔''[۷۴]

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں، دو غزلیں جو حال میں کہی ہیں تم کو بھیجتا ہوں فارسی غزل جو حمید کو بھیجی ہے عمدہ پرواز پر لکھی گئی ہے۔ اگرچہ تم کی توقع نہیں تاہم اسے دیکھنا تم۔''[۷۵]

شبلی نے اپنے خطوط میں پانچ غزلوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ غزلیات 'کلیات شبلی' میں شامل نہیں ہیں۔ علامہ شبلی زمانے کی روایت کے برخلاف شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں۔ ۱۹۰۹ء میں مولانا ظفر الملک نے اپنے رسالہ ''الناظر'' لکھنؤ کی کسی اشاعت میں شبلی کو خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کا شاگرد لکھ دیا تو شبلی نے ان کو ایک خط میں لکھا:

> ''جناب ایڈیٹر صاحب زاد اللطف، آپ نے اپنے پرچہ میں لکھا ہے کہ میں خواجہ عزیز الدین صاحب کا شاگرد ہوں، خواجہ میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں۔ میں نہ شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے۔ یہ جو کبھی کبھی (کچھ) موزوں کرلیتا ہوں شاعر نہیں تفریح طبع ہے۔''[۷۶]

شبلی کے تمام خطوط تصنع اور بناوٹ سے پاک ہیں۔ مولانا شبلی ادیب، و انشاپرداز تھے۔

خطوط میں دلکشی کا ایک خوبصورت انداز اور تخیل کی آمیزش سے انشاپردازی کی شان نمایاں ہے۔ اگرچہ انشاپردازی کو خطوط نگاری کا نازک فن برداشت نہیں کرسکتا لیکن شبلی کے دلکش اسلوب کی وجہ سے انشاپردازی ان کے خطوط کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ انشاپردازی کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> ''آج میں نے عجیب دل آمیز خواب دیکھا۔ عجیب اس لیے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور دل آویزی کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہوچکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے۔''[۷۷]

مہدی حسن افادی معاصرانہ ادب اور اس کے تقاضوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انھیں شبلی کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ شبلی نے مہدی کے نام کم و بیش اسی خطوط لکھے ہیں جس زمانے میں شبلی شعرالعجم لکھ رہے تھے تو مہدی نے توجہ دلائی کہ آزاد کی تالیف موعود پر نظر رکھیے گا۔ جو موضوع مشترک پر نکلنے والی ہے۔ جسے شبلی یہ سمجھے کہ ''سخندان فارس'' کی طرف اشارہ ہے جب حقیقت کا علم ہوا تو شبلی لکھتے ہیں:

> ''آزاد کی کتاب آج آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم وہ ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وہی معلوم ہوتا لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لیکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا۔ بارہویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے ہی صرف ہوچکا تھا اس لیے یوں ہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔''[۷۸]

لیکن جب مہدی افادی نے انھیں بتایا کہ ان کا اشارہ سخندان فارس سے نہیں بلکہ ''تذکرۂ شعرا'' سے تھا تو شبلی نے مہدی کو لکھا:

> ''میں آزاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہوگیا تھا۔ لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا۔
> خیر اب تو دل الحمد یم، ام[۷۹]

شبلی سخندان فارس کے بارے میں بہت فکرمند تھے۔ جس کا اندازہ ان کے خطوط میں موجود دلچسپ جملوں سے لگایا جاسکتا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"سفر نامہ ان فارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ! لیکن الحمدللہ میرے شعر العجم کو ہاتھ
نہیں لگایا ہے۔" ۴۹۰

مولانا شبلی کی "شعر العجم" کے علاوہ "سوانح مولانا روم" ایسی تصنیف ہے جو تنقیدی اور تحقیقی لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ سوانح مولانا روم شبلی کے سلسلۂ کلامیہ کی چوتھی کڑی ہے جس میں فاضل مصنف نے مولانا روم کی زندگی کے حالات با اختصار مگر مثنوی پر مفصل تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ مولانا شبلی نے ۱۹۰۲ء میں مثنوی پر تقریباً لکھنی شروع کی چنانچہ ایک خط میں جو انھوں نے ۱۸ فروری ۱۹۰۲ء کو مولانا حمید الدین کے نام لکھا لکھتے ہیں:

"تم نے ایک زمانے میں مجھ سے کہا تھا کہ تم نے مثنوی مولانا روم غور سے پڑھی اور
ان کے اصول پر فیصلہ متعین کیے۔ اگر خیال میں ہوں تو لکھ بھیجو۔" ۴۹۱

اسی طرح نواب سید علی خاں کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"میں آج کل مثنوی مولانا روم پر ایک بڑا مفصل ریویو لکھ رہا ہوں۔" ۴۹۲

مولانا شبلی سیاسی خیالات میں آزاد تھے اور گہری سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ حالانکہ مولانا شبلی کبھی عملی سیاست میں نہ تھے۔

مولانا شبلی کو اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون سے ذہنی لگاؤ تھا۔ اس کی بربادی دیکھ کر ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اپنے تصور کے چمن کو ہمیشہ کھلا دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کے لیے وہ تمام عمر کوشش کرتے رہے۔ اسلامی سیاست میں وہ عالمگیر اسلامی برادری کے قائل تھے۔ ۱۸۹۶ء میں روس و روم کی جنگ شروع ہوئی۔ عام مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے بھی ترکی کی حمایت کی۔ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے پرجوش نظمیں لکھیں، مضامین لکھے۔ ایک صاحب ان کی سیاسی نظمیں چھاپنا چاہتے تھے تو ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اگر آپ سیاسی نظمیں شائع کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ میرے تینوں مضمون
سیاسی کروٹ والے بھی شامل کیجیے کہ اس نظم کی وہ شرح ہے۔" ۴۹۳

۱۸۹۷ء میں جب یونان اور روم کی جنگ ہوئی تو وہ علی گڑھ میں تھے اور سرسید کا نقطۂ نگاہ یا ان کی سیاسی پالیسی سے ان کو اندر سے گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ سرسید احمد خاں کی سیاسی پالیسی کی

ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"رائے میں میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ سولہ سال رہا لیکن پولٹیکل
مسائل میں ہمیشہ ان کا مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا تھا اور سرسید سے بارہا
بحثیں کیں۔" ۴۹۴

عربی اخبارات میں جو کچھ پڑھتے تھے بیان کر دیتے تھے ایک خط میں مہدی افادی کو لکھتے ہیں:

"ترکی کی جدید زندگی نے ان کے ہوا خواہوں کو مخمور کر دیا ہے۔ کیا بتاؤں عربی
اخبارات میں آج کل کیا نشہ ہوتا ہے۔ سو سو دفعہ پڑھتا ہوں اور سیر نہیں
ہوتا۔ آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے۔ ان میں بیس ہزار کی جمعیت
کا ایک کا انداز ایک جنس لطیف تھی۔" ۴۹۵

خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا جہاں ایک طرف آزادی وطن کے قائل ہیں وہیں دوسری طرف آزادیٔ نسواں کے بھی حامی ہیں۔ اس سے ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شبلی کے خطوط کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی عصری تعلیم کے حامی تھے۔ شبلی نہیں چاہتے تھے کہ عورتوں کو صرف امور خانہ داری میں ہی محصور رکھا جائے لیکن لگتا ہے کہ کوئی انھیں پیچھے سے کھینچتا بھی ہے۔ وہ ایک عالم دین تھے اور مولویوں کی بنائی ہوئی فضا نے دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ حبیب الرحمٰن شیروانی کو خط میں لکھتے ہیں:

"بمبئی میں عورتوں کے جلسے دیکھے، ان کی تقریریں سنیں، ان کی قابلیت دیکھی
لیکن "چنداں خوشی نہ ہوئی" کیوں کہ ان سرگرمیوں میں مسلمان عورتوں کا کہیں
پتہ نہ تھا۔" ۴۹۶

شبلی نے اپنے ایک خط میں تعلیم نسواں کے نصاب پر بحث کی ہے۔ ان کے دیگر خطوط کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ خواتین کی تکمیل کے لیے کن امور کی ضرورت خیال کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"عورتوں کے لیے الگ نصاب ہو یہ اصولی غلط ہے۔ جس میں یورپ مبتلا ہو رہا

ہے کوشش ہونی چاہیے۔ دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ اور بڑھتا جائے۔ ادب، بات چیت، رفتار گفتار، نشست و برخاست، مذاق زبان، سب الگ ہو جائیں۔ البتہ بعض چیزیں مثلاً رضاعت، پرورش اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے نصاب میں اضافہ ہونے چاہیے۔"۲۸۷

عورتوں کے متعلق شبلی کے نظریات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ظفر الدین لکھتے ہیں:

"وہ عورتوں کے لیے فکر مند تھے اور انھیں تعلیم یافتہ اور زمانے کے اعتبار سے ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں نصاب پر زور دیتے رہے۔ حق تو یہ کہ عطیہ بیگم اور اس گھرانے سے جذباتی لگاؤ کے اسباب میں ایک نمایاں سبب یہ بھی ہے کہ عطیہ میں انھیں وہ خصوصیات نظر آتی تھیں جن کے وہ متلاشی تھے۔ عطیہ علم و فضل کی دولت سے مالا مال مغربی تعلیم سے آراستہ فن موسیقی سے واقف، صاحب تصنیف و تالیف اور اہل کمال کی قدر شناس تھیں۔ اور اس وقت مسلمانوں میں مولانا کو ایسی خاتون نظر نہیں آتی تھیں۔"۲۸۸

علامہ شبلی کے جو خطوط عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے نام ہیں وہ 'مکاتیب شبلی' کے مقابلے میں ایک طور پر انفرادیت رکھتے ہیں۔ 'مکاتیب شبلی' میں شبلی ایک عالم دین، ادیب، فلسفی، سیاست داں، مورخ نظر آتے ہیں۔ 'خطوط شبلی' میں انھوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خطوط کیا ہیں آپ بیتی ہیں جو مزہ آپ بیتی میں ہے وہ جگ بیتی میں کہاں؟ 'خطوط شبلی' کے خطوط میں بے تکلفی، تعلیم نسواں، موسیقی اور پردہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے معاشرتی امور بھی زیر بحث آئے ہیں۔ شبلی کے ان خطوط کو ایک خاص روشنی میں دیکھا جائے تو ان کے خطوط کو اردو ادب میں عشقیہ خطوط کا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر 'خطوط شبلی' کا مطالعہ اس لحاظ سے کیا جائے کہ ان میں کتنی ادبی چاشنی ہے تو انھیں خوبصورت ادبی دستاویز کہنا مناسب ہوگا۔ عبدالحق نے 'خطوط شبلی' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ دلی جذبات و خیالات کے نقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں

بے ریائی اور خلوص کی سچی تصویریں ہیں جن کے ادا کرنے میں ادبی تکلفات اور انشا پردازی کے داؤ پیچوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ پڑھنے والوں کے دل لبھائیں گے اور ان کے شوق کو تازہ رکھیں گے۔"۲۸۹

خط لکھتے وقت بعض صورتوں اور بعض رشتوں میں مصلحت اندیشی در آتی ہے اور خط لکھنے والا وہ باتیں تحریر نہیں کرتا جو اس کے ذہن و دل کی ترجمانی کرتا ہو بلکہ وہ ان باتوں کو ترجیح دیتا ہے جو مکتوب الیہ سے اس کے رشتے کے تناظر میں موزوں، مفید اور حسب حال ہو۔ عطیہ فیضی کو لکھے ایک خط میں اس مصلحت اندیشی کی مثال ملاحظہ کیجیے:

"عورتوں کے متعلق تمہاری رائے کہ وہ بیوی اور معاشی علوم کو پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔ لیکن یاد رکھو کہ مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کیے ہیں اس بل پر کیے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دلیر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو۔ لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں تنومندی، دلیری، دلیری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مرد تو عورتیں نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہیں۔"۲۹۰

شبلی نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ قوم اور صرف قوم کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہیں بھی فرشتہ نہیں بنے بلکہ انسان نظر آتے ہیں۔ خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہیں اور جمال پسند اور حسن پرست شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"میرا تو رواں رواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہوا ہے۔ لیکن دنیا کو سلیقے کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"۲۹۱

دراصل یہ ان کے مزاج کی شوخی اور ان کی طبیعت کا نمونہ ہے۔ ساتھ ہی عالم، ادیب، فلسفی اور مورخ کے اندر چھپے انسان کی روح کا پرتو بھی ہے۔ یہی انسانی روح جو بجلی کی طرح تڑپ اٹھتی ہے۔ اس تڑپ کے لیے ان کے خطوط کی زبان اور ان کے والہانہ انداز بیان پر جذباتی کیفیت کا

اطلاق کیا گیا ہے۔ شبلی جب عطیہ فیضی کی بیماری کا حال سنتے ہیں تو "تار" سے خیریت دریافت کرتے ہیں اور اکثر خطوط میں یوجا کرنے کی باتیں بھی کر دیتے ہیں۔ ایک خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

"قرۃ عینی!

تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگایا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا، افسوس دیر تک ملنے کی امید نہیں۔ میں وطن احباب، آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی، اور قومی کام کیونکر چھوڑ دوں۔" ۹۲

مولانا شبلی نے موسیقی کی باقاعدہ تحصیل و تکمیل تو نہ کی تھی، پھر وہ اس فن سے اس حد تک واقف تھے کہ گیج وتیم کی تمیز بآسانی کر لیتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سے تم کو خدا نے خوش آواز عطا کی ہے اور نہایت موثر آواز ہے لیکن افسوس ہوا تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں۔ اس لیے تم بالکل بے سُر اگا رہی تھیں۔ موسیقی کی معمولی معلومات ضرور ہیں ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ بار ہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا لیکن رک گیا کہ تمہاری گنگری اور نا ہیں بے قاعدہ تھیں بمبئی میں اس فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے یہاں تک کہ جن کا یہ پیشہ ہے وہ بھی محض جاہل ہیں۔" ۹۳

شبلی کے خط میں ان کے سفر کے حالات بھی درج ہیں۔ شبلی نے قسطنطنیہ اور دوسرے مقامات کے سفر کیے، وہ اپنے سفر کی داستان اپنے مکتوب الیہم کو ارسال کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مختی تال کے سفر کا جو منظر پیش کیا ہے وہ ان کے اسلوب میں محاکات نگاری اور متحرک تصویر کشی کا بہت اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ قسطنطنیہ کا حال ایک خط میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"آج جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا۔ میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا۔ جامع حمیدیہ میں داخل ہو گیا۔ سلطان المعظم بڑی شان وشوکت سے آئے جب سلطان تشریف لاتے ہیں تو اطلسی پردے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور کوئی شخص ان کو دیکھ نہیں سکتا۔" ۹۴

مولانا شبلی کے خطوط میں ادبیت اور دلچسپی کے عناصر موجود ہیں۔ شبلی اردو زبان و ادب کے چند معتبر اور صاحب طرز مکتوب نگاروں میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کی سوانح حیات، مشغولیات و مصروفیات اور مختلف زمانوں کے رجحانات و کیفیات کے بارے میں گراں قدر معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

"خطوط شبلی" میں ان کی شخصیت کا جمالیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور یہاں وہ صرف ایک مولوی نہیں بلکہ زندہ دل اور زندہ جاوید انسان نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف "مکاتیب شبلی" کے خطوط جو انھوں نے اپنے احباب اور دیگر ہم عصروں کو لکھے ہیں ان میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں جو ان کے شخصی رویے، رجحان، ذہنی میلان اور فکر و نظر کو سمجھنے میں زیادہ معاون ہیں۔

خطوط کے مطالعے سے دلچسپ اور خیال انگیز بات سامنے آتی ہے کہ سرسید کے نامور رفقا میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جسے آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف نہ ہو اور اس کے ساتھ یہ سب سرسید سے بھی کسی نہ کسی پہلو اختلاف رکھتے تھے۔ اس کے باوجود بھی مدرسۃ العلوم کی تحریک سے الگ نہ ہوتے تھے۔ شبلی کے خطوط پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"خطوں کی زمین اتنی مانوس اور شاداب ہوتی ہے کہ سارا خط ایک قطعہ چمن معلوم ہوتا ہے۔ مخاطب کے ذوقی تقاضے بھی ان کے مدنظر رہتے ہیں کہ خط میں مکتوب الیہ کے لیے کچھ بھی ہو تو بھی لطف سے خالی نہیں ہوتا۔" ۹۵



حواشی

۱۔ سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص ۲۵۶
۲۔ وحید الدین سلیم (۱۸۵۹-۱۹۲۸) سرسید کے ادبی معاون تھے۔
۳۔ راس مسعود (۱۸۸۹-۱۹۳۷) سرسید کے پوتے اور جسٹس سید محمود کے فرزند تھے۔
۴۔ شیخ عطاء اللہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد تھے اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔

۵۔ خطوط سرسید، مرتبہ نسرین ممتاز بصیر، ص ۱۹، لیتھو پرنٹرس اچل تالاب علی گڑھ، فروری ۱۹۹۵ء (بار اول)

۶۔ ایضاً　ایضاً　ایضاً

۷۔ وجہی سے عبدالحق تک، سید عبداللہ، ص ۲۹۷–۲۹۸

۸۔ ایضاً　ایضاً

۹۔ غالب کی مکتوب نگاری، سرسید کے خطوط کا ایک مجموعی جائزہ، علی احمد فاطمی، ص ۲۵۶، مرتبہ نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

۱۰۔ سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص ۲۵۶

۱۱۔ سرسید کے خطوط: ایک مجموعی جائزہ، ص ۲۵۶

۱۲۔ سرسید احمد خاں اپنے خطوط کی روشنی میں، از محمد عزیز، ص ۳۲، عالمی سہارا، سرسید نمبر، اکتوبر ۲۰۰۷ء

۱۳۔ تنقیدات عبدالحق، مرتبہ عبدالحق، ص ۸۳، خواجہ پرنٹنگ پریس، دہلی، پہلا ایڈیشن، ۱۹۵۶ء

۱۴۔ سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ص ۲۵۹

۱۵۔ خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، ص ۲۸، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۱ء

۱۶۔ خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، ص ۱۶۰، خط نمبر ۱۳

۱۷۔ ایضاً　ایضاً ص ۳۸

۱۸۔ خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، ص ۵۶–۵۵، ۲۱ جنوری ۱۸۷۰ء، از لندن

۱۹۔ رسالہ جمیلہ دہلی، سرسید نمبر، ص ۹۸

۲۰۔ وجہی سے عبدالحق تک، ص ۲۹۶

۲۱۔ خطوط سرسید، ص ۵۸، خط بنام محسن الملک، ۱۱ فروری ۱۸۷۰ء، از لندن

۲۲۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۶۹ء، از لندن، بنام محسن الملک

۲۳۔ سرسید میگزین، سرسید ہال (ساؤتھ) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص ۲۱، ۱۹۸۶ء

۲۴۔ خطوط سرسید، ص ۱۹۰

۲۵۔ مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین، ص ۳۳۵، یونین پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۶۰ء

۲۶۔ ناموران علی گڑھ، فکر و نظر، ص ۳۰۶–۳۰۵، ۱۹۸۶ء

۲۷۔ تہذیب الاخلاق، ص ۹۳، اپریل ۲۰۰۲ء

۲۸۔ ایضاً　ایضاً

۲۹۔ خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، ص ۱۶۰

۳۰۔ رسالہ جمیلہ دہلی، سرسید نمبر

۳۱۔ خط بنام محسن الملک

۳۲۔ مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین، ص ۳۶۷

۳۳۔ ایضاً　ایضاً　ص ۳۶۸

۳۴۔ مکاتیب سرسید احمد خاں، ص ۲۷۱–۲۷۰

۳۵۔ خطوط سرسید، مرتبہ سر راس مسعود، ص ۴۲

۳۶۔ خطوط سرسید، ص ۱۲۵

۳۷۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک، خلیق احمد نظامی، ص ۲۹۵، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۲ء

۳۸۔ مکتوبات سرسید احمد خاں، ص ۳۶

۳۹۔ خط بنام محسن الملک، از لندن، ۲۶ نومبر ۱۸۶۹ء

۴۰۔ رسالہ جامعہ، جولائی–دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۷۶

۴۱۔ خط بنام وقار الملک، علی گڑھ، ۷ اگست ۱۸۸۹ء

۴۲۔ ایضاً　ایضاً ۸ اگست ۱۸۹۹ء

۴۳۔ ایضاً　ایضاً ۵ مئی ۱۸۸۳ء

۴۴۔ ایضاً　ایضاً ۱۸ جولائی ۱۸۸۳ء

۴۵۔ خطوط سرسید، مرتبہ نسرین ممتاز بصیر، ص ۴۰

۴۶۔ ایضاً　ایضاً　ص ۴۱

۴۷۔ خط بنام احمد الدین، ۹؍ دسمبر ۱۸۸۳ء
۴۸۔ ایضاً ۲؍ مارچ ۱۸۸۳ء
۴۹۔ ایضاً ۲۹؍ مارچ ۱۸۸۳ء
۵۰۔ محمد حسین آزاد، تذکرہ کشور و کرم، ص ۳۱، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء
۵۱-۵۲ مکاتیب آزاد میں (مرتب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی) دیباچہ سے پہلے صفحہ نمبر ۴۰ پر مصادر کے عنوان سے فہرست میں نمبر ۲-۳ پر درج ہے۔
۵۳۔ مدیر "مخزن"
۵۴۔ محمد حسین آزاد، و کرم تذکرہ کشور، ص ۴۲
۵۵۔ دور جدید کے اردو خطوط، عبد اللطیف اعظمی، غیر مطبوعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ
۵۶۔ مکاتیب آزاد، مرتبہ ساحل احمد، ص ۷، تاج آفسیٹ، الہ آباد، دسمبر ۱۹۹۷ء
۵۷۔ مکاتیب آزاد، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل، ص ۱۹، مجلس ترقی ادب لاہور
۵۸۔ ایضاً، ص ۱۸
۵۹۔ ایضاً، ص ۲۲۰
۶۰۔ ایضاً، ص ۱۶۹
۶۱۔ ایضاً، ص ۱۶۶-۱۶۷
۶۲۔ ایضاً، ص ۱۹۴
۶۳۔ ایضاً، ص ۱۹۵
۶۴۔ ایضاً، ص ۲۰۵
۶۵۔ مکتوبات آزاد، مرتبہ آغا محمد طاہر، ص ۹۶، گیلانی پریس لاہور، یکم فروری ۱۹۲۷ء
۶۶۔ داستان تاریخ اردو، حامد قادری، ص ۴۰۳
۶۷۔ خط بنام سید حسین بلگرامی، ۱۰؍ فروری ۱۸۸۳ء
۶۸۔ مکاتیب آزاد، ص ۱۸۱-۱۸۰
۶۹۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۷۰۔ سالار جنگ کا خطاب سب سے پہلے میر تراب علی خاں مختار الملک کو دیا گیا۔ محمد حسین آزاد نے میر تراب علی خاں کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ میر تراب علی خاں کا خطاب الامراء مختار الملک نواب سالار جنگ تھا۔ حکومت برطانیہ نے انھیں سر کا خطاب دیا۔ بحوالہ مکاتیب آزاد، ص ۱۸۲
۷۱۔ مکاتیب آزاد، ص ۱۸۳
۷۲۔ ایضاً، ص ۸۸
۷۳۔ محمد حسین آزاد، و کرم (تذکرہ کشور) ص ۴۳، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۲۰۰۰ء
۷۴۔ حکیم محمد دین لاہور کے پاس ایک قصبہ تھا، وہاں کے رہنے والے تھے۔ علم کیمیا کا شوق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔
۷۵۔ مکاتیب آزاد، ص ۱۵۱
۷۶۔ ایضاً، ص ۱۵۶
۷۷۔ ایضاً، ص ۹۷
۷۸۔ ایضاً، ص ۹۸
۷۹۔ محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ محمد حسین آزاد کے ڈرامے "اکبر" کو مکمل کیا۔ بحوالہ اردو میں ڈرامہ نگاری، سید بادشاہ حسین، ص ۸۷-۸۹، خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔
۸۰۔ مکاتیب آزاد، ص ۲۶۱
۸۱۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۸۲۔ مکاتیب آزاد، ۱۷۵
۸۳۔ محمد حسین آزاد کے صاحب زادے جو کم سنی ہی میں وفات پا گئے ان کا نام ملا محمد باقر تھا۔
۸۴۔ مکاتیب آزاد، ص ۹۸-۹۷
۸۵۔ محمد حسین آزاد کے چھوٹے صاحب زادے کا نام خلیفہ محمد اکبر تھا۔ ان کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا۔
۸۶۔ مکاتیب آزاد، ص ۱۱۳

۸۷۔ محمد حسین آزاد کی صاحب زادی
۸۸۔ محمد حسین آزاد کے نواسے سید محمد سالم
۸۹۔ مکاتیب آزاد، ص ۱۹۷
۹۰۔ ایضاً، ص ۷۷
۹۱۔ محمد حسین آزاد، و کرم، ص ۴۳
۹۲۔ مکاتیب آزاد، ص ۱۹
۹۳۔ بحوالہ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۳۳۹
۹۴۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۷۹۳
۹۵۔ نذیر احمد: شخصیت اور کارنامے، اشفاق احمد اعظمی، ص ۳۰۱، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۳ء
۹۶۔ عبدالغفور شہباز جو آگے چل کر نذیر احمد کے ہم زلف بھی ہوئے۔
۹۷۔ موعظۂ حسنہ، مرتبہ عبدالغفور شہباز، ص ۱۸۳، برقی پریس دہلی ۱۹۹۰ء
۹۸۔ ایضاً، ص ۱۸۲
۹۹۔ ایضاً، ص ۱۸۳
۱۰۰۔ ایضاً، ص ۱۷
۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۱
۱۰۲۔ حامد حسن قادری، ص ۵۴۷
۱۰۳۔ بحوالہ رسالہ نقوش، مکاتیب نمبر، ص ۱۳۶
۱۰۴۔ ایضاً، ص ۱۹۳
۱۰۵۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۷۹۳
۱۰۶۔ موعظۂ حسنہ، ص ۴
۱۰۷۔ ایضاً، ص ۵
۱۰۸۔ ایضاً، ص ۱۳
۱۰۹۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۲۶
۱۱۱۔ ایضاً، خط نمبر ۸، ص ۲۸
۱۱۲۔ ایضاً، خط نمبر ۹۳، ص ۱۳۶
۱۱۳۔ ایضاً، خط نمبر ۹، ص ۳۱
۱۱۴۔ ایضاً، خط نمبر ۹۳، ص ۱۳۵
۱۱۵۔ ایضاً، خط نمبر ۹۱، ص ۱۳۳
۱۱۶۔ ایضاً، خط نمبر ۸۹، ص ۱۳۳-۱۳۲
۱۱۷۔ ایضاً، خط نمبر ۱۳، ص ۳۵
۱۱۸۔ بشیر الدین کی والدہ کو لوگ چاکر بیدی صاحب کہا کرتے تھے۔ بعد میں خاندان کے سب چھوٹے بڑے ان کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ بحوالہ موعظۂ حسنہ، ص ۳۳
۱۱۹۔ موعظۂ حسنہ، خط نمبر ۱۲، ص ۳۴
۱۲۰۔ ایضاً، خط نمبر ۳۷، ص ۳۸
۱۲۱۔ ایضاً، خط نمبر ۹۹، ص ۱۳۹
۱۲۲۔ ایضاً، خط نمبر ۸۵، ص ۱۳۹
۱۲۳۔ ایضاً، خط نمبر ۸۵، ص ۱۳۹
۱۲۴۔ ایضاً، خط نمبر ۸۵، ص ۱۳۰-۱۳۹
۱۲۵۔ نذیر احمد کا غیر مطبوعہ جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لائبریری آرکائیوز میں دستیاب ہے۔ اس میں مکتوب الیہ کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن قرین قیاس سے یہ خط سرسید احمد خاں کے نام معلوم ہوتا ہے۔
۱۲۶۔ نذیر احمد نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے وقت کی بات کی ہے۔ لکھنؤ بھی حیدرآباد کے مدمقابل تھا۔ دلی تو دارالسلطنت تھا۔ اس سے حیدرآباد کو کیا نسبت!
۱۲۷۔ موعظۂ حسنہ، خط نمبر ۶۱، ص ۱۰۹
۱۲۸۔ ایضاً، خط نمبر ۷۹، ص ۱۳۳-۱۳۲

۱۲۹۔ ایضاً، خط نمبر ۵۹، ص ۱۰۲-۱۰۳
۱۳۰۔ ایضاً، خط نمبر ۵۶، ص ۹۹-۹۸
۱۳۱۔ ایضاً، خط ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۷ء، خط نمبر ۷۱، ص ۱۳۳
۱۳۲۔ دہلوی اردو، سید ضمیر دہلوی، ص ۲۴۷، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۰ء
۱۳۳۔ ایضاً، ص ۲۳۳
۱۳۴۔ ایضاً، ص ۲۳۴
۱۳۵۔ تہذیب الاخلاق، جون ۱۹۸۴ء، ص ۱۶
۱۳۶۔ میر امن سے عبدالحق تک، ص ۱۹۱
۱۳۷ سہ ماہی فکر و آگہی، دہلی علی گڑھ نمبر، ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۵
۱۳۸۔ مکاتیب، حصہ اول، ص ۵
۱۳۹۔ ایضاً ایضاً
۱۴۰۔ خطوط وقار الملک، ص ۳۶۰
۱۴۱۔ ایضاً، ایضاً
۱۴۲۔ مکاتیب، ص ۶-۷
۱۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰
۱۴۴۔ ایضاً
۱۴۵۔ ایضاً، ص ۱۱
۱۴۶۔ ایضاً، ص ۱۵
۱۴۷۔ ایضاً، ص ۴۴
۱۴۸۔ تذکرہ نواب محسن الملک، ص ۱۱
۱۴۹۔ مکاتیب، ص ۴۴
۱۵۰۔ ایضاً، ص ۱۸
۱۵۱۔ خطوط وقار الملک، مرتبہ مشتاق احمد، ص ۶، ۴۵، سر سید ہاؤس سیریز نمبر ۱، مئی ۱۹۷۴ء

۱۵۲۔ مکاتیب، ص ۲۶، خط بنام وقار الملک
۱۵۳۔ ایضاً، ص ۲۶، ایضاً
۱۵۴۔ ایضاً، ص ۲۹۔ خط بنام وقار الملک
۱۵۵۔ بحوالہ دکنی سے عبدالحق تک، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۱۷۸
۱۵۶۔ مکاتیب، ص ۵۶، خط بنام انوار احمد صاحب زبیری مارہروی
۱۵۷۔ تہذیب الاخلاق، ص ۱۵، جون ۱۹۸۴ء
۱۵۸۔ مکاتیب، ص ۳۱
۱۵۹۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص ۳۶۱
۱۶۰۔ مکاتیب، خط بنام وقار الملک، ص ۴۲
۱۶۱۔ تہذیب الاخلاق، ص ۷۷، سر سید نمبر، اکتوبر ۲۰۰۱ء
۱۶۲۔ تذکرہ نواب محسن الملک، ص ۴۲
۱۶۳۔ مکاتیب، خط بنام طلبا کے مدرسۃ العلوم، ص ۹۳
۱۶۴۔ ایضاً، ص ۹۷
۱۶۵۔ ایضاً، ص ۹۸
۱۶۶۔ پولیٹیکل ایسوسی ایشن جو ابتداً لکھنؤ میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا نام بالآخر آل انڈیا مسلم لیگ قرار پایا۔ بحوالہ مکاتیب، حصہ اول، ص ۴۸
۱۶۷۔ مکاتیب، ص ۴۳
علی گڑھ تحریک سیاسی و سماجی مطالعہ، مظہر حسین، ص ۲۷۷
۱۶۹۔ ایضاً، ص ۲۷۸
۱۷۰۔ مکاتیب، ص ۳۶-۳۵
۱۷۱۔ تذکرہ محسن الملک، ص ۳۷
۱۷۲۔ مکاتیب، ص ۳۵
۱۷۳۔ یادگار حالی، صالحہ عابد حسین، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، بار دوم، ستمبر ۱۹۳۹ء، ص ۲۵۹

۱۷۴۔ مکاتیب حالی، پیش لفظ، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، ص ۹، ادبی پریس کراچی، ۱۹۵۰ء
۱۷۵۔ مکتوبات حالی، جلد دوم، مرتبہ سجاد حسین، خط بنام حافظ مسعود اکبر چغتائی، جنوری ۱۸۸۲ء
۱۷۶۔ ایضاً، خط بنام تصدق حسین ۳ فروری ۱۸۹۳ء
۱۷۷۔ ایضاً، خط بنام خواجہ تصدق حسین، ۳۰ فروری ۱۸۹۳ء
۱۷۸۔ مکاتیب حالی، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، ص ۶۲-۶۱، ادبی پریس کراچی، اگست ۱۹۵۰ء
۱۷۹۔ تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر عبدالحق، ص ۱۰۳، خواجہ پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۵۹ء
۱۸۰۔ اہلیہ خواجہ غلام الثقلین
۱۸۱۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص ۵۹۳
۱۸۲۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً
۱۸۳۔ مکتوبات حالی، جلد اول، ص ۱۹۳
۱۸۴۔ ارمغان حالی، ص ۱۳۸
۱۸۵۔ حالی کی اردو نثر نگاری، سید عبداللہ، ص ۹۲۷-۹۲۶
۱۸۶۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، معین الدین عقیل، ص ۷۹۳-۷۹۲، انجمن پریس، اشاعت اول ۱۹۷۳ء
۱۸۷۔ خط بنام مولانا شبلی، مکاتیب حالی، ص ۴۰
۱۸۸۔ ایضاً، ص ۴۲
۱۸۹۔ ادبی دنیا، ص ۳۱-۳۰، خط بنام محسن الملک، ص ۳۱-۳۰، ۱۹۵۵ء
۱۹۰۔ خط بنام خواجہ اخلاق حسین، مکاتیب حالی، ص ۲۳
۱۹۱۔ مکاتیب حالی، ص ۳۸
۱۹۲۔ ایضاً، ص ۷۷
۱۹۳۔ ایضاً، ص ۸۳
۱۹۴۔ ایضاً، ۳۶-۳۵
۱۹۵۔ ایضاً، ص ۸۵-۸۳

۱۹۶۔ ایضاً، ص ۲۳
۱۹۷۔ ارمغان حالی، مقدمہ و حواشی، پروفیسر حمید احمد خاں، ص ۵۰، دین محمد پریس، لاہور، ۱۹۷۱ء
۱۹۸۔ مکتوبات حالی، جلد اول، ص ۱۱۲
۱۹۹۔ مکاتیب حالی، ص ۸۲، اشارہ ہے آفتاب الدولہ خواجہ اسد علی لکھنوی کی مثنوی "طلسم الفت" کی طرف دو اشعار اس طرح ہیں:

وہ مصفا سڑک وہ اس کا جماؤ　　آب گوہر کا چارسو چھڑکاؤ
رات دن جھمگھٹا ہے میلہ ہے　　مہر و مہ کا کٹورا بجتا ہے

۲۰۰۔ تنقیدات عبدالحق، ص ۹۳
۲۰۱۔ ایضاً، ص ۹۹
۲۰۲۔ خط بنام حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، نقوش مکاتیب نمبر، ص ۱۷۵
۲۰۳۔ خط بنام مشتاق فاطمہ اہلیہ غلام الثقلین، داستان تاریخ اردو، ص ۵۹۳
۲۰۴۔ تنقیدات عبدالحق، ص ۱۰۰-۹۹
۲۰۵۔ مکاتیب حالی، ۲۹ جنوری ۱۸۹۳ء
۲۰۶۔ فروغ اردو، حالی نمبر، جون ۱۹۵۵ء، حصہ دوم، ص ۳۶۴
۲۰۷۔ ایضاً، ص ۳۶۶
۲۰۸۔ مکتوبات حالی، حصہ اول، خط بنام عبدالحق، ۲۳ اگست ۱۹۰۸ء، ص ۷۷
۲۰۹۔ خط بنام عبدالولی، ارمغان حالی، ص ۵۲
۲۱۰۔ ایضاً، ص ۸۳
۲۱۱۔ رسالہ فکر و نظر، حالی نمبر، ص ۲۰۳، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۱ء
۲۱۲۔ پنڈت پدم سنگھ ہندی کے ادیب نقاد اور شاعر تھے۔ انھیں ہندی، عربی، سنسکرت، اردو، فارسی اور انگریزی پر یکساں قدرت حاصل تھی۔
۲۱۳۔ رسالہ فکر و نظر، حالی نمبر، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۲۵

۲۱۴۔ ایضاً، ص۴۱۲

۲۱۵۔ ایضاً، ص۴۱۴

۲۱۶۔ ایضاً، ص۴۱۳

۲۱۷۔ ارمغانِ حالی، ص۱۴۲

۲۱۸۔ تہذیب الاخلاق، ۱۰؍ جون ۱۹۸۳ء، ص۱۹

۲۱۹۔ ماہِ نو، کراچی، جمہوریت نمبر، ۱۹۵۸ء، ص۲۷

۲۲۰۔ خطوطِ وقار الملک، پیش لفظ، مرتبہ مشتاق احمد، سرسید ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۶ء

۲۲۱۔ مکاتیب، پیش لفظ، مرتبہ امین زبیری، ص۵

۲۲۲۔ ایضاً، ایضاً

۲۲۳۔ ایضاً، ایضاً

۲۲۴۔ خطوطِ وقار الملک، ص۲-۱

۲۲۵۔ ایضاً، ص۱۰

۲۲۶۔ ایضاً، ص۱۶

۲۲۷۔ ایضاً، ص۳

۲۲۸۔ ایضاً، ص۱۶

۲۲۹۔ نقوش مکاتیب نمبر، ص۱۷۰

۲۳۰۔ تہذیب الاخلاق، یکم دسمبر ۱۹۸۳ء، ص۴۳

۲۳۱۔ تہذیب الاخلاق، سرسید نمبر، ص۸۷، اکتوبر ۲۰۰۱ء

۲۳۲۔ خطوطِ وقار الملک، ص۱۸۴

۲۳۳۔ ایضاً، ص۸۵-۸۳

۲۳۴۔ مکاتیب، خط نمبر ۱۸، ص۱۱۵-۱۱۳

۲۳۵۔ خطوطِ وقار الملک، ص۱۶۳

۲۳۶۔ ایضاً، ص۱۹

۲۳۷۔ ایضاً، ص۴۰

۲۳۸۔ ایضاً، ص۳۱-۳۰

۲۳۹۔ ایضاً، ص۲۷

۲۴۰۔ ایضاً، ص۴۱

۲۴۱۔ ایضاً، ص۴۵-۴۳

۲۴۲۔ ایضاً، ص۴۶

۲۴۳۔ نقوش مکاتیب نمبر، ص۱۶۸

۲۴۴۔ ایضاً، ص۱۷۶

۲۴۵۔ وقار الملک، ص۳۹۴

۲۴۶۔ ایضاً، ص۳۹۵

۲۴۷۔ ایضاً، ص۳۶۰

۲۴۸۔ تہذیب الاخلاق، دسمبر ۱۹۸۳ء، ص۴۲

۲۴۹۔ مکاتیب، ص۷۰

۲۵۰۔ خطوطِ وقار الملک، ص۴۵۶

۲۵۱۔ ایضاً، ص۴۵۶

۲۵۲۔ مکاتیب، ص۱۱۹

۲۵۳۔ دلّی سے عبدالحق تک، سید عبداللہ، ص۲۹۹-۲۹۸

۲۵۴۔ مکاتیبِ شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد اول، ص۱، ۱۹۱۷ء

۲۵۵۔ ان دونوں حضرات نے غالب کی اجازت کے بغیر ان کے خطوط جمع کرنے شروع کر دیے تھے۔

۲۵۶۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات، مرتبہ خلیق انجم، ص۶۵، ۱۹۹۶ء

۲۵۷۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، ص۸

۲۵۸۔ خط بنام مولانا ابوالکلام آزاد، ۱۰؍ مئی ۱۹۱۱ء، لکھنؤ

۲۵۹۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۵۱-۵۰
۲۶۰۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۳۰، اعظم گڑھ، ۱۹۲۷ء
۲۶۱۔ مکاتیب شبلی، علی گڑھ، ۲ مارچ ۱۸۸۶ء، بنام محمد عمر
۲۶۲۔ خط بنام حبیب اللہ، ۵ جون ۱۸۹۳ء
۲۶۳۔ خط بنام سر سید احمد خاں، ۱۸۹۳ء
۲۶۴۔ مولانا شبلی نعمانی: ایک مطالعہ، ص ۱۰۲، مقتون احمد، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۶ء، اشاعت اول
۲۶۵۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، ناز صدیقی، ص ۵۵، الیاس، شاہ علی بندہ، حیدرآباد، ۱۹۷۶ء
۲۶۶۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۳۳، خط ۲۰/ مئی ۱۹۰۱ء
۲۶۷۔ بنام جناب حبیب الرحمن خاں شیروانی، ۲۵/ جون ۱۸۹۹ء
۲۶۸۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، پہلا ایڈیشن، ص ۲۱
۲۶۹۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، ناز صدیقی، ص ۵۰
۲۷۰۔ بنام ابوالکلام آزاد، لکھنؤ، ۱۵/ جون ۱۹۰۹ء
۲۷۱۔ بنام حبیب الرحمن خاں شیروانی، دسمبر ۱۸۹۹ء
۲۷۲۔ خط بنام مہدی افادی، از حیدرآباد
۲۷۳۔ مولانا شبلی: ایک مطالعہ، ص ۱۰۹
۲۷۴۔ مکاتیب شبلی، خط بنام مولوی سمیع اللہ، ۱۸/ جنوری ۱۸۸۴ء، ص ۵۸
۲۷۵۔ مکاتیب شبلی، ص ۶۰، ۲۶/ جنوری ۱۸۸۴ء
۲۷۶۔ مکاتیب شبلی، ص ۳۳۱، ۲/ اگست ۱۹۰۹ء
۲۷۷۔ خط بنام شیخ حبیب اللہ، ۱۹/ جون ۱۸۹۲ء، از قسطنطنیہ
۲۷۸۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۲۱۲
۲۷۹۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً
۲۸۰۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات، خلیق انجم، ص ۳۵

۲۸۱۔ مکاتیب شبلی، ص ۱۸
۲۸۲۔ ایضاً، ص ۳۷۷
۲۸۳۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، ص ۹۳
۲۸۴۔ ایضاً، ایضاً
۲۸۵۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات، ص ۱۸۳
۲۸۶۔ مکاتیب شبلی، ص ۱۲۳
۲۸۷۔ خط بنام عطیہ فیضی، ۲۶/ مئی ۱۹۰۹ء
۲۸۸۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات، ص ۲۳۷
۲۸۹۔ خطوط شبلی، مرتبہ محمد امین زبیری و منشی سید محمد یوسف، ص ۲۶، شمسی مشین پریس آگرہ
۲۹۰۔ خطوط شبلی، مرتبہ محمد امین زبیری، ص ۵۳
۲۹۱۔ خط بنام محسن الملک
۲۹۲۔ خطوط شبلی، ص ۳۹
۲۹۳۔ ایضاً، ص ۴۸
۲۹۴۔ بنام شیخ حبیب اللہ، ۱۹/ جون ۱۸۹۳ء، از قسطنطنیہ
۲۹۵۔ ولی سے عبدالحق تک، ص ۲۹۹



چوتھا باب

اُردو کے دیگر مشاہیر مکتوب نگار

- امیر مینائی
- اکبرالہ آبادی
- پریم چند
- ابوالکلام آزاد
- داغ دہلوی
- مہدی افادی
- نیاز فتح پوری

○

مکتوب نگاری کا ادب میں اہم درجہ ہے۔ صنف مکتوب نگاری کارآمد بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ نامور ہستیوں کے مکاتیب ان کے مذاق، مزاج، رجحان ادبی کارناموں اور علمی سرگرمیوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل کرنے کا سب سے مستند اور کارآمد ذریعہ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں ان کی زندگی اور شخصیت کے وہ نقش و نگار ابھرتے ہیں جو واقعہ نگاری کی جان اور حقیقت نگاری کی روح مانے جاتے ہیں۔

مرزا غالب، سرسید احمد خاں، مولوی نذیر احمد، وقارالملک، محسن الملک، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی کے علاوہ دیگر مشاہیر ادب ڈاکٹر محمد اقبال، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، اکبرالہ آبادی، امیر مینائی، داغ دہلوی، مہدی افادی، پریم چند، نیاز فتح پوری وغیرہ کے خطوط میں زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے گراں قدر مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ادبی خطوط نگاری کو اعتبار عطا کیا اور اس روایت کی پاسداری کی۔ بقول محمد علی زیدی:

> "اگر مکتوب نگار کی شخصیت ممتاز نہیں ہے تو محض اسلوب کی دلکشی اور انشاپردازی کی دل فریبی مکاتیب کو اہمیت نہیں بخش سکتی۔ اس لیے کسی ادیب کا بحیثیت مکتوب نگار کے کامیاب ہونے کے لیے ذاتی طور پر مشہور اور نامور ہونا بھی لازمی ہے تاکہ مکتوب الیہ کے علاوہ اور دوسرے قارئین بھی اس کی شخصیت کے ذاتی پہلوؤں میں دلچسپی لے سکیں اور ان مخفی گوشوں کو معلوم کرنے کی کوشش میں ہوں جن کی دریافت کا واحد ذریعہ خطوط ہی ہو سکتے ہیں۔ اسی سے مکاتیب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔"[1]

مکاتیب کسی نامور ادیب کی عادت، خصائل اور معلومات و رجحانات معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ وہ آئینہ ہیں جس میں ان کی شخصیت کے تمام پہلو جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔

امیر مینائی

کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں مرزا محمد عسکری نے امیر مینائی کی سیرت اور شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسم تہذیب تھے۔ شرم و حیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی۔ طبیعت نہایت محبت والی پائی تھی۔ راست باز ہمدردی سے بھرے ہوئے نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا اور نہ کسی کی ہجو کہی۔ بچے پابند صوم و صلوٰۃ شرع احکام قرآن کے پورے عامل تھے۔ اسی وجہ سے ان کے تقدس اور بے ریائی کی شہرت لوگوں میں اسی قدر تھی جس طرح ان کے علم و فضل اور کمالات شاعری کی۔"[۱]

امیر مینائی جامع الکمالات تھے۔ شاعر کے علاوہ وہ ایک نثار اور ناقد بھی تھے۔ "امیر اللغات" اور ان کے خطوط جن میں انھوں نے نہایت پیچیدہ نکات ادبیہ حل کیے ہیں ان کی قابلیت کی گواہی دیتے ہیں۔ امیر مینائی خطوط میں ادبی نگارشات، املا، تذکیر و تانیث جیسے مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت مرزا غالب کے خطوط ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

امیر مینائی کے خطوط کا مجموعہ ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ سے "خطوط منشی امیر احمد" کے عنوان سے مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے شائع کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں امیر مینائی کے خطوط کا دوسرا ایڈیشن مطبع ادبیہ لکھنؤ سے مع اضافہ اور ترتیب نو شائع ہوا۔ یہ مجموعہ تین سو انتیس صفحات پر مشتمل

ہے۔ مکتوب الیہم کی تعداد پچیس اور خطوط کی تعداد دو سو ساٹھ ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ خطوط ۲۸ / مارچ ۱۸۹۱ء سے فروری سنہ ۱۹۰۰ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ قابل ذکر مکتوب الیہم کے نام اس طرح ہیں: حکیم برہم، مرزا داغ، قاضی عبدالجمیل، اعجاز حسین، ریاض حسین خیال، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی اور داغ دہلوی وغیرہ۔ پیش نظر خطوط کا مجموعہ "مکاتیب امیر مینائی" جون ۱۹۲۲ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے چھپا۔ یہ مجموعہ تین سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحہ نمبر سات پر دیباچہ طبع ثانی درج ہے جس میں تاریخ تحریر ستمبر ۱۹۲۲ء اور مقام تحریر گوالیار ہے۔ صفحہ نمبر نو پر دیباچہ اول کے نام سے تحریر موجود ہے جس میں تاریخ تحریر نومبر ۱۹۱۰ء اور مقام تحریر علی گڑھ ہے۔ دیباچہ طبع اول اور دیباچہ طبع ثانی دونوں خود مرتب احسن اللہ خاں ثاقب کے تحریر کردہ ہیں۔ صفحہ نمبر چودہ سے امیر مینائی کے حالات زندگی درج ہیں۔ اس کے بعد ان کے کلام پر ناقدانہ ریویو، امیر مینائی اور داغ دہلوی کا موازنہ اس کے بعد دیگر تحریریں ہیں۔ صفحہ نمبر ایک سو ایک سے خطوط کا آغاز ہوتا ہے۔ صفحہ نمبر تین سو چودہ سے مجموعہ مکاتیب پر مختلف شعرا و ادبا کے تبصرے شامل ہیں۔ امیر مینائی کے خطوط مجموعوں کے علاوہ دیگر کتب و رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے۔ رامپور رضا لائبریری میں بھی امیر مینائی کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط موجود ہیں۔

ان خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر مینائی اس بات کے خواہش مند تھے کہ ان کے خطوط شائع ہوں کیونکہ انھیں صنف مکتوب نگاری سے ایک فطری لگاؤ اور دلچسپی تھی۔ مکتوب نگاری کی جانب ان کی محبت اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ان کا کوئی شاگرد انھیں مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کرتا تو وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور اس کی اس قدردانی کے شکرگزار ہوتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میری قدر کر کے میرا دل بڑھانے والے خادم کو زندہ رکھے اور اقبال بڑھائے۔ آمین امیت بہ آیا۔ دل کو تسکین ہوئی۔ تم نے میری انشا پردازی کی ستائش کر کے اور مجھے شرمندہ کیا۔"[۲]

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"خطوط جب میں گھر سے اچھے لکھتا تھا۔ وہ ذخیرہ ایک سو کئی جزو کا میرے ایک

شاگردوں نے جمع کیا تھا۔ سولہ برس ہوئے کہ وہ بیچارہ مر گیا اور اس ذخیرے کا پتہ نہ لگا۔ پھر کسی نے جمع نہیں کیا۔ تین چار شاگردوں نے بھی کبھی کچھ خطوط کی نقلیں اپنی پسند کے موافق لکھ لیں وہ جا بجا ہیں۔ بعض تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے کر لی ہیں اور جب سے دفتر امیر اللغات کھولا گیا ہے۔ محرران دفتر بعض مکاتبات لکھ لیتے ہیں۔ یہ سب اگر جمع ہوں تو ایک مجموعہ ہو سکتا ہے۔ مگر کون یہ کام کرے۔"

۲

فاضل مرتب دیباچہ اول میں اس طرح رقمطراز ہیں:

ایسا کوئی عریضہ میں نے استاد کی خدمت میں نہیں بھیجا جس کا جواب نہ دیا ہو اور کوئی ایسا مسئلہ فن شعر کے متعلق دریافت نہیں کیا کہ جس کی جانب توجہ نہ فرمائی ہو۔"۳

امیر مینائی کی وفات کے بعد ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو مرتب نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہی خطوط شائع کئے جائیں جن میں ادب کی رنگینی اور شاعری کا حسن ہو۔ لیکن شبلی نعمانی نے نجی خطوط کی طرف احسن اللہ خاں ثاقب کی توجہ مبذول کرائی۔ لکھتے ہیں:

"میرا قصد تھا کہ صرف وہ خطوط کتابی حیثیت میں شائع کیے جائیں کہ جن میں ادب کی رنگینی ہو یا فن شعر کے متعلق کوئی نکتہ بحث یا کوئی بات ہو مگر شمس العلماء مخدومی حضرت مولانا شبلی نعمانی دامت افاضتہم نے فرمایا کہ نہیں تمام تحریریں جو مل سکیں بلا ترک حذف درج کی جائیں۔ کیونکہ مصنف کے فقرے فقرے اور لفظ لفظ سے اس کے حالات، خیالات، ذکاوت اور طبیعت کا پتہ لگتا ہے۔"۴

امیر مینائی کے خطوط ان کی عمدہ یادگار ہیں۔ ان کے نجی خطوط بہت دلچسپ ہیں۔ خط بنام داغ دہلوی رسالہ "نیرنگ دہلی" کے "امیر نمبر" میں شائع ہوا۔ یہ خط شکوہ آمیز ہے کیونکہ ۱۸۹۱ء میں داغ دہلوی کو حضور نظام دکن نے "استاد السلطان" کا خطاب دیا۔ امیر مینائی نے اس بات کا تذکرہ اخبار میں پڑھا۔ انہیں دنوں داغ دہلوی کا خط امیر مینائی کے پاس آیا لیکن اس خط میں داغ دہلوی نے اپنے خطاب و اعزاز کا ذکر نہیں کیا۔ داغ دہلوی کے اس خط کے جواب میں امیر مینائی لکھتے

ہیں:

"اخبار گورکھپور میں دیکھا کہ ریاست نے آپ کا تخاطب خطاب 'استاد السلطان' ہوتا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھپا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ سرور گھٹ گیا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے تمغہ سے فرمائی وہ میرے سرور آمد ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہی ہیں۔ خدا جلد ظہور میں لائے۔"۵

امیر مینائی کو خط لکھنے کا بہت شوق تھا اور ان کے شاگرد و دوست کثرت سے تھے۔ ان کے خطوط ان کے سوانح کی طرف دلکش اشارے کرتے ہیں۔ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل خطوط میں درج ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ:

"خطوط سے منشی صاحب کے عادات و اطوار اور کریکٹر پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اگر کوئی لکھنا چاہے تو ان کی سوانح عمری کا بہت عمدہ مواد ان سے فراہم ہو سکتا ہے۔ نیز ان میں فن نظم اور زبان کے متعلق کثر مشکل کو حل کیا ہے۔"۶

خطوط کے مطالعے سے ان کی عادات و اطوار اور کریکٹر کے علاوہ ان کے مزاج و اخلاق کا بیان ملتا ہے۔ روزمرہ کے مشاغل میں خط کتابت بھی اہم فریضہ تھا۔ کثرت سے خط لکھتے تھے اور جواب کے منتظر نظر آتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کی فرمائش تاریخ کی تھی۔ آپ سے بھی عذر خواہ ہوں۔ وہ خطوط جن میں دن مہینہ وقت وغیرہ رحلت کا تھا وہ ہی نہ رہے چونکہ ڈاک میں کاغذ بکثرت آتے ہیں اور صندوقچے معمور ہو جاتا ہے لہذا مہینے میں کئی کئی بار صاف کیا جاتا ہے۔ ضروری کاغذ تھیلی میں بند کر کر اور بستوں میں بند ہو جاتے ہیں باقی چاک ہوتے ہیں۔ بہرکیف اس قدر قیاس سے خیال آیا کہ سال رحلت ۱۳۰۶ھ ہوگا۔"۸

"بہت دنوں سے تم نے کچھ لکھا نہیں اور مجھے بھی اپنی کاہشوں کی بدولت خیر پرسی کی توفیق نہیں ہوئی۔ خدا کرے تم خیریت سے ہو۔"۹

''مدت کے بعد محبت نامہ آیا تمہاری بیچی اور خالص الفت وودا کا مشکور بنایا۔ خدا تم کو خوش رکھے کہ مجھ مغموم و محزون کو اپنی خیریت کی خوش خبری سنا کر خوش کر دیتے ہو اور میری مزاج پرسی کرتے رہتے ہو۔'' [10]

خطوط ایسا آئینہ ہوتے ہیں جن میں مکتوب نگار کی شخصیت کے تمام پہلو جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے خطوط مکتوب نگار کی عادات و خصائل اور میلانات و رجحانات معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔ خطوط کی اسی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف جیسا اس کی بے تکلفانہ خط و کتابت سے ہو سکتا ہے۔ ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ اسی واسطے مکتوب کو نصف ملاقات قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا اور اس سے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ اب اس کی ملاقات محض اس کی خط و کتابت پر منحصر ہے اور بس یہی کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوب کا فراہم کرنا درحقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلم بند کر دینا ہے۔'' [11]

''امیر اللغات'' نہ صرف لغت ہے بلکہ اردو علم و ادب کی تکمیل کے لیے بہترین ہدایت ہے۔ اس کو دیکھنے سے مؤلف کی جامعیت، وسعت نظر، تحقیق اور موشگافی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ''امیر اللغات'' کو ترتیب دینے اور لکھنے میں امیر مینائی کو کتنی تگ و دو کرنی پڑی۔ الفاظ کی چھان بین کے مسائل پر اپنے شاگردوں اور دوستوں سے مشورے، اس کے علاوہ بیماری اور عمر کی اس منزل پر آ کر اس قدر عرق ریزی کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں انھیں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کن دشواریوں سے گزرنا پڑا۔ خطوط کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''امیر اللغات کو خدا رونق دے۔ ذرا میری زیباری کیجئے تو ضرور ایک وقت اصلاح کے واسطے نکالوں گا امیر اللغات کا پہلا حصہ چھپ گیا۔ اسی ہفتہ خریداروں کو پہنچے گا۔'' [12]

برہم کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کے دوست ڈاکٹر احمد شاہ صاحب نے امیر اللغات کے مخصص آٹھ کے دیکھنے کا شوق جس پیرائے میں ظاہر کیا اس کا میں ممنون ہوا میری طرف سے بعد سلام اخلاص التیام کہیے کہ اگر امیر اللغات کی تکمیل جلد منظور ہے تو کسی علت سے ایک آدھ پیدا ہوا۔ پھر دیکھیے کتنی جلدیں نکلتی ہیں۔'' [13]

امیر مینائی کے خطوط میں امیر اللغات کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی دیگر تصانیف کا ذکر بھی انھوں نے اپنے خطوط میں کیا۔ جس میں ان کی شان نزول اور ادبی مزاج اور علمی معیار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خطوط میں ان کی تصنیفات کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

''پہلا محبت نامہ آیا تو مراۃ الغیب بھیجنے کی فکر ہوئی اس کو چھپے ہوئے کئی برس ہوئے میں نے دو نسخے لیے تھے وہ قدر دوستان نزدیک و دور ہو چکے اس شہر میں تاجران کتب کے پاس بھی نہ ملا۔ ناچار مطبع منشی نول کشور کو لکھا۔ اب تک جواب نہیں آیا۔ میرے پاس نعتیہ مسدسات جن کے نام ذکر شاہ انبیا، صبح ازل، شام ابد، لیلۃ القدر ہیں، موجود ہیں۔ مراۃ الغیب، گوہر انتخاب، محامد خاتم النبیین، مضامین دل آشوب نہیں ہیں۔'' [14]

اکثر خطوط کیونکہ شاگردوں کے نام ہیں اس لیے ان میں کثرت کے ساتھ پند و نصیحت اور کلام پر اصلاح موجود ہے۔ ان کے خطوط کو مکاتیب اردو میں سلسلہ اخلاقیات کی کڑی کہا جا سکتا ہے۔ مکتوب الیہم پر ان کی شخصیت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خطوط میں خلوص اور نیک نیتی سے مغلوب ہو کر کھلے طور پر تلقین اخلاق سے کام لیتے ہیں۔

بے ساختگی اور سادگی کے ساتھ انھوں نے خطوط میں آرائش و زیبائش کو بھی جگہ دی ہے۔ خطوط کی نثر میں شعریت کے علاوہ عربی فارسی کے جملے اور محاوروں کا استعمال بخوبی کیا ہے۔ انشاپردازی، زور بیان اور جدت کے ساتھ مختصر نویسی ان کے مکاتیب کی اہم خصوصیات ہیں۔ بیشتر خطوط صاف و سادہ زبان میں تحریر ہوئے ہیں۔

مکتوبات میں القاب و آداب مختصر اور دلکش استعمال کرتے ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے

کا طریقہ مکتوب الیہ سے رشتہ کی نوعیت کے علاوہ موضوع اور حالات کی مناسبت سے بھی تشکیل پاتا ہے۔ ایک ہی مکتوب الیہ کو مختلف انداز تخاطب سے نوازتے ہیں۔ کسی خط کی ابتدا شعر سے بھی کر دیتے ہیں۔ زیادہ تر مکاتیب مخاطب کے انداز سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً پیارے زاہد، پیارے برہم، دلنواز گرامی، گوہر ارو حی فداک، محب دل نواز۔

کہیں ظریفت و ادبیت سے آراستہ القاب بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً عزیزی و سعیدی کم صلاح و فلاح دارین کی دعائیں، معظم و محترم دام بالعنایۃ والاکرام وغیرہ۔ خطوط کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مرتب نے لکھا ہے:

"جو لوگ طالب فن انشا ہیں ان کے واسطے یہ خطوط استاد شفیق کا کام دیں گے۔ زبان کی فصاحت و متانت، معاملہ نگاری، مختصر نویسی، ہر بات کی تحقیق بحث و خطا کی احتیاط، یہ تمام باتیں اور غور کرنے والوں کو ان سے بہت زیادہ یہ تحریریں تعلیم دیں گی۔ ان امور کے علاوہ احباب سے اخلاص تلامذہ کے ساتھ شفقت، عزیزوں سے محبت، تقویٰ، صبر و رضا، استقلال اور دوسری صفات پاکیزہ کا سبق بھی حاصل ہوگا۔ بہر حال امید کی جاتی ہے کہ تمام پہلوؤں سے یہ مجموعہ ہر ذوق سلیم کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔"[۱]



مرزا داغ دہلوی

خطوط ایسے مکمل اور منظم دستاویز ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر صاحب تحریر کا مزاج، رجحان اور تمام وہ باتیں جن کی تلاش کسی مشہور ہستی میں کی جاتی ہے، اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہیں کیونکہ خط لکھنے والے کو خط لکھتے وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس کی یہ تحریر تشہیر میں آنے والی ہے۔ بلکہ اس کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ اس کی یہ تحریر اپنے دوست یا عزیز کو لکھی جارہی ہے انھیں تک اس کے اثرات قائم و باقی رہیں گے۔

مرزا داغ دہلوی کے خطوط بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے خطوط کا مجموعہ سب سے پہلے ان کے شاگرد احسن مارہروی نے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو ہند سے "انشائے داغ" کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔ خطوط کے اس مجموعے میں خطوط کی کل تعداد ایک سو چالیس ہے۔ یہ مجموعہ ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ "انشائے داغ" کا مقدمہ مرتب احسن مارہروی کا تحریر کردہ ہے۔ مقدمے سے پہلے صفحہ پر مرتب احسن مارہروی کی تصویر ہے۔ مقدمہ کے بعد پہلے صفحہ پر مرزا داغ دہلوی کی تصویر بھی موجود ہے۔

داغ دہلوی کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں رفیق مارہروی نے نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے "زبان داغ" کے نام سے نئے خطوط کے اضافے کے ساتھ شائع کیا۔ اس طرح داغ کے خطوط کی تعداد دو سو انتالیس ہوگئی۔

داغ دہلوی کے شاگرد احسن مارہروی نے قیام حیدر آباد کے دوران جس وقت وہ فصیح اللغات کی ترتیب و تالیف میں مصروف تھے۔ اپنے استاد کے خطوط جمع کرنے کے متعلق لکھا ہے:

"اسی زمانہ تالیف و تصنیف میں روزانہ بچے کی طرح موصوف کے خطوط جمع

کرنے کا خیال بھی قائم ہوا اور جتنے خطوط اپنے پاس تھے، انھیں محفوظ رکھنے کی کوشش شروع کی اور دوسرے احباب اور خواجہ تاش بھائیوں سے فرمائشیں جاری رکھیں۔"۱۶

داغ دہلوی کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اس کے بعد کی اشاعت کے سلسلے میں ڈاکٹر کامل قریشی لکھتے ہیں:

"۱۹۵۶ء میں امتیاز علی عرشی نے "اردو ادب" میں ان ۲۱ خطوط کا مجموعہ بھی ضروری اور مفید حواشی کے ساتھ شائع کر دیا جو رضا لائبریری رام پور نے خریدا تھا۔ وہ ایک کو چھوڑ کر تمام خطوط "زبان داغ" میں شامل ہیں۔"۱۷

احسن مارہروی نے "انشائے داغ" کے مقدمہ میں جو شہادت دی ہے کہ داغ نے خطوط کے لیے ایک یادداشت رجسٹر بنوایا تھا جس میں خطوط کی روانگی نمبر درج کی جاتی تھی۔ اس کے پیش نظر داغ کے مکتوبات کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہونی چاہیے تھی۔ خطوط کے متعلق احسن مارہروی لکھتے ہیں:

"راقم الحروف نے اپنے زمانہ قیام میں بکثرت ایسے خطوط پائے جو شاگردوں نے اپنی غزلوں کی اصلاحوں کے متعلق مختلف مقامات سے مختلف اوقات میں بھیجے تھے اور سالہا سال گزر چکے تھے کہ وہ جوابوں سے محروم بلکہ مایوس ہو کر الماریوں کے خانوں میں لب بستہ پڑے ہوئے تھے وہ سب نکلوائے گئے اور قید تنہائی سے نجات دلوا کر مجلس آرائی کا سامان کیا گیا۔ سیکڑوں خطوط کے جوابات لکھوائے گئے اور ہزاروں غزلوں پر اصلاحیں کی گئیں۔ اس عمل درآمد کا سلسلہ برسوں تک جاری رہا جس میں روزانہ تقریباً پانچ سے دس جوابوں کا اوسط پڑ جاتا ہے۔"۱۸

داغ کے شاگردوں کی کثرت ان کے تعلقات کی وسعت اور ان کی ملک گیر شہرت اور تقریباً چالیس پینتالیس سال کی طویل مدت کے پیش نظر ان کے مکاتیب کی تعداد بہت کم ہے۔ مکاتیب کی تعداد کم ہونے کی وجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امتیاز علی عرشی نے لکھا ہے:

"اس چالیس سال کی مدت میں انھیں ہزاروں خط لکھنا چاہیے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نثر نویسی کی طرف مائل کم تھے۔ اور نہ بے ضرورت خط لکھتے تھے اور نہ ضرورت سے زیادہ لکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے خطوط کا سرمایہ کم ہے۔"۱۹

"انشائے داغ" کی مقدمہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چونکہ ان کی حیات میں کسی کو ان کے خطوط جمع کرنے کا خیال نہ آیا اور نہ وہ دلچسپ اور جاذب توجہ تصور کیے گئے اس لیے زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان کے بہت سے خطوط دست برد انقلاب، غارت گری اور غفلت سے ضائع ہو گئے۔

بے تکلف خطوط کے ذریعے انسان کے جذبات، اخلاق اور احساسات کا انکشاف جس قدر ہوتا ہے وہ کسی دوسری چیز سے نہیں ہوتا۔ کسی مصنف کے خطوط اس کی وفات کے بعد جمع کرنے کا مطلب ہے اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلم بند کر دینا۔ داغ دہلوی کے خطوط سے ان کی سوانح حیات کا بہت کچھ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ داغ دہلوی کے خطوط کے متعلق امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

"ان سے داغ کے سوانح پر مفید روشنی پڑتی ہے ان کی شاعرانہ شوخی نے جس زلف ورخ سے آب ورنگ حاصل کیا ہے، اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔"۲۰

مرزا داغ دہلوی کے مکتوب الیہم مختلف حیثیتوں اور مختلف نوعیتوں کے ہیں، اسی اعتبار سے احسن مارہروی نے داغ کے خطوط کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں ان لوگوں کے خطوط ہیں جو والیان ریاست، حکام اور امرا کے نام ہیں۔ دوسری فصل میں وہ خطوط شامل ہیں جو مخصوص اعزہ، خاص احباب اور عام شناساؤں و تلامذہ کے نام ہیں۔ تیسری فصل میں شاگردوں کے نام خطوط شامل ہیں۔ دوسرے مجموعے "زبان داغ" میں تقریباً سو خطوط کا اضافہ کیا جا چکا ہے۔ ان میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو سید قطب الدین اشک جلیسری، داغ کے ہم راز دوست اور شاگرد کے نام ہیں۔ منی بائی حجاب، حمیدہ بائی، مسماۃ ملکہ جان، مہاراج یوراج، پیرے ٹھاکر، ہر کشن بہادر بیدار، سائل دہلوی، لالہ شمبھو ناتھ، قاضی عبدالحمید، مولوی عبدالغفور نساخ، ڈاکٹر عوض خان، شیخ محمد وزیر وزیر اور منشی امیر احمد امیر مینائی کے نام ہیں۔ یہ تمام خطوط ان کی مختلف طرز نگارش

کی جو انھوں نے مختلف حیثیتوں کے لوگوں کے لیے اپنا رکھی تھی نمائندگی کرتے ہیں۔ خطوط کا یہ سلسلہ ۱۸۶۰ء سے شروع ہو کر ۳ر جنوری ۱۹۰۵ء تک چلتا ہے۔ مکاتیب کا اسلوب عام طور سے سادہ ہے لیکن وہ خطوط جن میں تذکرۂ عشق و عاشقی اور تبصرۂ حسن و جمال کا پہلو ہے۔ ان میں ان کا اسلوب تحریر تبدیل ہو جاتا ہے اور سادہ نثر کی جگہ شوخی لے لیتی ہے۔ اسی طرح کچھ بے تکلف اور ہم راز دوستوں کو خط لکھتے وقت بھی اسلوب میں عبارت آرائی کا رنگ آ جاتا ہے۔

خطوط میں حفظ مراتب کا خیال رکھا گیا ہے۔ انداز تخاطب بے تکلف اور بے ساختہ ہے۔ اکثر خطوط بغیر القاب و آداب کے ہیں یا القاب مختصر ہیں مثلاً نواب صاحب، جناب من، جناب مکرم، مکرمی مہربان من، بندہ نواز، میر صاحب، سید صاحب، مہاراجہ صاحب، محب صادق، داغ نواز، جناب والا، بندہ پرور، حضور دام اقبالہ وغیرہ سے مکاتیب کی ابتدا کی ہے۔ کسی خط میں بغیر القاب کے ہی خطوط کی ابتدا کر دیتے ہیں۔ خط بنام ٹھاکر ہر کشن بہادر بیدار میں لکھتے ہیں:

"تمہارا استاد بوڑھا ہے۔ مگر ہزار جوانوں سے بہتر کبھی دل میں آتا ہے کہ
اپنا عاشق آپ ہو جاؤں۔ رئیس صاحب ہمارے عاشق تم ہو جاؤ خدا کے لیے
ہو جاؤ، بھگوان کے لیے ہو جاؤ۔" ۴۱

اکثر خطوط میں ایک ہی مکتوب الیہ کے لیے مختلف قسم کے القاب استعمال کیے ہیں۔ مثلاً محسن بائی... دوسرے خط میں انداز تخاطب بدل جاتا ہے۔ اس طرح لکھتے ہیں: "دل دراز و دل نواز" عام طور سے ایک مکتوب نگار کے لیے ایک ہی القاب بہت کم استعمال کیا ہے۔ تقریباً ہر نئے خط کے القاب الگ ہیں۔ لیکن نواب طلب علی خاں کے لیے تقریباً تمام خطوط میں "غریب پرور فیض گستر سلامت" کے القاب استعمال کیے ہیں۔

خطوط میں کاروباری اور خانگی حالات کے علاوہ جب کہیں تذکرۂ عشق و محبت یا تبصرۂ حسن و جمال کا پہلو ل جاتا ہے تو ان میں شوخی سے ضرور کام لیتے ہیں۔ شوخی و ظرافت ان کے اکثر خطوط میں جلوہ گر ہے۔ خطوط میں ظرافت کا چٹخارہ ہے جس سے ان کے خطوط کی لطافت و دلآویزی میں اضافہ ہوتا ہے۔

داغ دہلوی نے طوائفوں کے نام بھی خطوط لکھے ہیں۔ داغ دہلوی اور طوائف منی جان

حجاب کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ داغ نے منی جان حجاب کو ایک محبت نامہ بھیجا جس میں انھیں حیدرآباد آنے کے لیے لکھتے ہیں۔ ابھی وہ خط کلکتہ پہنچا بھی نہ ہوگا کہ ان کے شاگرد نوح ناروی استاد سے ملنے حیدرآباد آئے تو تحفے کے طور پر الہ آباد کی ایک طوائف بی جان کی تصویر بھی لائے۔ حجاب کے حیدرآباد پہنچنے سے ایک دن پہلے داغ دہلوی بی جان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حور کی صورت، نور کی مورت، خوش رہو اور ہم سے ملو۔ کل نوح صاحب
تشریف لائے۔ آج بر سبیل تذکرہ تمہاری طرف سے ہمارا ایک ہدیہ پیش کیا۔
یعنی تمہاری تصویر نہیں بلکہ تیر۔ نام پوچھا تو سن کر خود کو اور ایمان لانا پڑا لاکنی
جان بکلدیم تون کہا رخدایا ایسی صورت بھی تو نے پیدا کی ہے۔ سیرت کی
تعریف سنی تو صورت سے بڑھ کر۔ خوش آواز خوش مزاج، پھر اس پر لکھی پڑھی،
زمانہ ایسے لوگوں کی جتنی قدر کرے کم ہے۔" ۴۲

مندرجہ بالا خط کی شوخی و ظرافت مرزا داغ دہلوی کی طبیعت خاص کا پتا دیتی ہے اس میں مرزا کی شوخی و ذہانت اور جودت و ذکاوت کے جوہر اچھی طرح نمایاں ہے۔

خطوط میں دستخط کے ساتھ تاریخ سنہ اور دن اکثر لکھا گیا ہے۔ ابتدائی زمانے کے خطوط میں کہیں کہیں ہجری سنہ اور مہینے درج کیے گئے ہیں، ورنہ اکثر میں عیسوی مہینہ اور سنہ درج ہے۔ بقول احسن مارہروی:

"ہر خط پر خواہ وہ دوسرے سے لکھوایا گیا ہو خواہ خود لکھا ہو اپنے ہاتھ سے دستخط
ضرور کیا کرتے تھے۔ کبھی دستخط کی جگہ خالی مہر بھی لگا دی جاتی تھی، کبھی مہر اور
دستخط دونوں ہوتے تھے۔" ۴۳

جن خطوط میں اعزا و اقارب کو تسلی و تشفی دیتے ہیں ان میں ان کی طرز نگارش بالکل سادہ ہے اور ہر لفظ سے خلوص و محبت ٹپکتی ہے۔ مکاتیب کے اسلوب تحریر میں مکتوب نگاری کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انداز گفتگو کی آمیزش اور مکالمات کے رنگ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ داغ کے مکاتیب میں بھی کہیں کہیں اس رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مکاتیب میں ذاتی

لب ولہجہ اور انداز گفتگو کی جابجا کارفرمائی ہے:

"نواب صاحب آپ تو بیٹھے بٹھائے کلیجے میں نشتر چبھو دیتے ہیں۔"

"جس کا قرار والا نامہ نے ذکر کیا ہے اس سے ملاقات کیسے ہو۔ سعد آباد سے جلیسر قریب ہے لیکن سعد آباد تک کیوں کر پہنچا جائے مجھے مرنے کی بھی فرصت نہیں۔" [۴۴]

عام طور سے بیشتر خطوط سادہ نثر میں ہیں لیکن وہ خطوط جو والیان ریاست رام پور، حیدر آباد اور دوسرے روسا کے نام ہیں ان کے اسلوب تحریر میں کوئی کشش نہیں کیونکہ ان سے داغ کے تعلقات بے تکلف نہیں تھے۔ زبان بھی ثقیل ہے ان میں بیشتر خطوط خاص طور سے خطوط بنام کلب علی خاں میں احکام کی بجا آوری کی اطلاع ہے۔ امتیاز علی عرشی نے داغ کے مکاتیب کے متعلق رائے دی ہے:

"داغ کے جو خطوط میرے مطالعے میں آئے ہیں ان کے پیش نظر یہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادبی نقطۂ نگاہ سے ان تمام خطوط سے گھٹیا ہیں۔ جو اب تک مختلف ادیبوں کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نہ لطف بیان ہے نہ شوخی ادا ہے۔ نہ برجستگی محاورہ ہے۔ نہ ظرافت کا نمک ہے۔ نہ مکالمات کی چاشنی ہے۔ ایک سپاٹ ادائے مطالب ہے اور بس۔" [۴۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے خطوط ایسے ہیں جو محض سپاٹ اور ادائے مطالب ہیں لیکن ان کی بذلہ سنجی، خوش مزاجی، شوخ طبعی ان کے مکاتیب میں پوری آب وتاب سے جلوہ گر ہے۔ خطوط میں انھوں نے اپنی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا انکشاف کیا ہے۔ اپنے مخصوص دوستوں اور شاگردوں سے اپنے معاشقہ کا حال نہیں چھپایا۔ خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، لکھتے ہیں:

"تمہارے علاقے میں رمضان نہیں آیا بھاگ کر یہاں چلا آیا۔ روزہ رکھتا ہوں۔" [۴۶]

داغ دہلی کے تھے دہلوی زبان پر فریفتہ تھے۔ زبان کی صحت وصفائی کا اتنا خیال تھا کہ تمام

تلامذہ یہاں تک کہ کم وبیش شاگردوں کی غزلوں پر بھی خود ہی اصلاح دیتے تھے... خطوط کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شاگرد بے اصلاحی غزل چھپوا دیتا تھا تو اس پر ناراض ہوتے تھے۔

داغ کے خطوط میں اس زمانے کے اہم واقعات وحادثات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ حالانکہ ایسے واقعات وحادثات کا ذکر ان کے مکاتیب میں بہت کم ہے لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد وپیش کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔

خطوط میں اکثر مقامات پر زبان وبیان کی ناہمواریاں اور اغلاط نظر آتی ہیں۔ اس کے متعلق احسن مارہروی لکھتے ہیں:

"ان کے بعض خطوط میں کہیں کہیں لفظی بے ربطی یا املائی غلطی پائی جاتی تھی۔ مگر فی الحقیقت وہ ان کی غلطی نہیں ہوتی تھی، بلکہ کاتب کی غفلت یا غلط ساعت کی وجہ سے ایسا ہوتا تھا۔" [۴۷]

خطوط کے مطالعے سے کہا جا سکتا ہے کہ داغ نے نثر کو اور مکتوب نگاری کو فن کی طرح نہیں برتا کیونکہ شاعری کی طرف ان کی توجہ پوری طرح مرکوز تھی، لیکن داغ کے خطوط ادبی نقطۂ نگاہ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط ان کی حیات کے واقعات اور رجحانات ومیلانات معلوم کرنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ یہ خطوط ان کے سچے انسانی جذبات کا آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے خط ضرورتاً لکھے اور اتنا ہی لکھا جتنی ضرورت تھی۔ خطوط ہی داغ کا نثری سرمایہ ہیں اس کے علاوہ نثر میں ان کی ایک تقریظ ملتی ہے جو انھوں نے مولوی ظفر علی خاں کے ترجمے "خیابان فارس" پر کی تھی۔ اس کا اسلوب بھی خط کی طرح سادہ ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض خطوط ادبی حیثیت رکھتے ہیں اور انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہیں۔



اکبر الٰہ آبادی

اکبر الٰہ آبادی کا شمار اردو زبان کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے لیکن وہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ قوم کے مصلح بھی تھے۔ ان کا دل مذہبی درد اور مشرقی تہذیب کی محبت سے معمور تھا۔ وہ مغرب بیزار اور مشرق پسند تھے۔ قوم کی جس تحریک کو انھوں نے مضر سمجھا اس کی اعلانیہ مخالفت کی اس کے لیے وہ سرسید سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو گئے۔ اسی طرح انھوں نے ملک و ملت کے لیے جسے مفید سمجھا اس کی ہر پیرائے میں حمایت کی۔ ان کے خیالات کا اظہار نظم و نثر دونوں میں ملتا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی نے ایک طویل عمر پائی ان کے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے ان کے مضامین کی تعداد اگر کم ہے تو اس کی کمی ان خطوط سے ایک حد تک پوری ہو جاتی ہے جو انھوں نے سپرد قلم کیے ہیں۔ کسی شخص کے جذبات و احساسات کو سمجھنے اور اس کے خیالات سے واقفیت کے لیے اس کے خطوط کا مطالعہ بہت مفید ہے انسان کی شخصیت نجی خطوط میں بے نقاب ہو جاتی ہے جن خیالات کا اظہار وہ اعلانیہ نہیں کرنا چاہتا ان کا اظہار خطوں میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کر دیتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کو سمجھنے اور ان کے خیالات کی روح سے واقفیت کے لیے ان کے خطوط کا مطالعہ ضروری ہے۔

اکبر الٰہ آبادی کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

خطوط اکبر (حصہ اول) بنام خواجہ حسن نظامی

زمانی اعتبار سے اس مجموعے میں شامل خطوط ۷ / جنوری ۱۹۱۱ء سے ۲۷ / اگست ۱۹۲۱ء تک کے درمیانی عرصے میں تحریر ہوئے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۲ء میں دہلی سے طبع ہوا۔ یہ مجموعہ ایک سو بہتر

صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مرتب خواجہ حسن نظامی ہیں۔ اس مجموعے میں شامل خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مختار الدین احمد آرزو لکھتے ہیں:

> "ان خطوط کے مطالعے سے اکبر کی شخصیت پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کا بیشتر حصہ علمی و ادبی افادات پر مشتمل ہیں۔"[۱۹]

خطوط اکبر حصہ دوم

یہ مجموعہ ۱۹۲۳ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ ان خطوط کے مکتوب الیہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ہیں۔

مکاتیب اکبر

اس مجموعے کے مرتب محبوب علی ہیں۔ ادبی پریس لکھنؤ سے ۲۲ / مارچ ۱۹۲۳ء کو شائع ہوا۔ اس مجموعے میں دو سو تین خطوط شامل ہیں۔ ان خطوط کے مکتوب الیہ محمد ہادی عزیز لکھنوی ہیں۔ یہ خطوط ۲۶ / ستمبر ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۱ء تک کے درمیانی عرصہ میں تحریر ہوئے ہیں۔

بزمِ اکبر

یہ مجموعہ ۱۹۳۰ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے مرتب قمر الدین احمد بدایونی ہیں۔ مرتب نے اس میں اکبر الٰہ آبادی کی شاعری اور حالات زندگی پر اظہار خیال کیا ہے۔ اور دوسرے حصے میں اکبر الٰہ آبادی کے خطوط شامل کیے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر لوگوں کے مکاتیب بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔

رقعات اکبر

اس کے مرتب محمد نصیر ہمایوں، مطبع ریلوے روڈ لاہور اور خطوط کی تعداد ننانوے ہے۔ ان خطوط کے مختلف مکتوب الیہم میں کچھ ممتاز شخصیتوں کے نام اس طرح ہیں۔ سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، سید افتخار حسین، شیخ عبدالقادر وغیرہ۔ یہ خطوط ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء

کے درمیانی عرصے میں تحریر کیے گئے۔

مکتوبات اکبر

اس مجموعے میں شامل تمام خطوط مرتب مرزا سلطان احمد قادیان کے نام ہیں۔ کریمی پریس لاہور سے شائع ہوئے۔ یہ خطوط ۲ دسمبر ۱۹۰۵ء سے ۲۲ جنوری ۱۹۲۱ء تک کے تحریر کردہ ہیں۔

خطوط اکبر

اس کے مرتب مختارالدین احمد آرزو ہیں۔ خطوط کی تعداد چھتیس ہے۔ زمانی اعتبار سے ۱۸۹۱ء سے ۳۱ اگست ۱۹۲۱ء کے درمیانی عرصے کے تحریر کردہ ہیں۔

خط و کتابت مابین اکبرالہ آبادی اور مہاراجہ سر کشن پرشاد

اس مجموعہ کو خواجہ حسن نظامی نے مرتب کر کے اگست ۱۹۵۱ء کو دہلی سے شائع کیا۔ اس میں اکبرالہ آبادی کے پچیس خطوط شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کل چوہتر صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا خط ۲۰ دسمبر ۱۹۱۳ء اور آخری خط ۳ دسمبر ۱۹۱۸ء کا ہے۔

اکبرالہ آبادی طنز و مزاح نگاری کی حیثیت سے بلند مرتبے کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری کے پس پردہ کون سے عوامل و محرکات تھے جنھوں نے اکبرالہ آبادی کو انوکھے موضوعات عطا کیے۔ ان باتوں کو ان کے ماحول کی معاشرتی اور فکری تاریخ کے حوالے سے اور ان کی شعری تخلیقات کے بین السطور میں سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کا ماحول ان کے زمانے کے حالات، تقاضے، ان کا ذہنی رد عمل اور وہ اسباب جنھوں نے ان کے شعور کو شدید طور پر متاثر کیا، ان سب باتوں کو سمجھنے کا بہترین ماخذ ان کے خطوط ہی ہو سکتے ہیں۔

اکبرالہ آبادی اپنے خطوط کی اشاعت سے گریزاں تھے۔ احباب کا اصرار ہوتا تھا اور وہ ٹال جاتے تھے۔ خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر خطوط پر انھوں نے نظر ثانی اور حذف و ترمیم کی تھی۔ مرزا سلطان احمد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"خطوط اس خیال سے کبھی نہیں لکھے گئے کہ وہ شائع ہوں گے۔ مجھ سے اکثر صاحبوں نے اجازت چاہی لیکن میں نے تامل کیا۔ پرائیویٹ خطوط کو جب تک دیکھ نہ لوں۔ اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔" ۳۹

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"آپ پر بلاشبہ بھروسہ کر سکتا ہوں کہ میرے خطوط جو آپ کے نام ہوں یا اوروں کے نام ہوں۔ ان کو حذف و ترمیم مناسب کے بعد شائع کیجیے اب یا کبھی۔" ۴۰

اکبرالہ آبادی کو اپنے پرائیویٹ خطوط کا بہت خیال رہتا تھا کہ کہیں شائع نہ ہو جائیں۔ ایک مرتبہ سلطان احمد نے بھوپال کے کسی صاحب کو ان کے نجی خطوط بھیج دیے۔ اس بات کا علم جب اکبرالہ آبادی کو ہوا تو اظہار افسوس کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ کو بھی افسوس ہے کہ بھوپال صاحب کو آپ نے میرے پرائیویٹ خطوط بھیج دیے۔" ۴۱

عبدالماجد دریابادی کے نام خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خطوط کی اشاعت کی مخالفت کرتے تھے لیکن بعد میں ان کی مخالفت میں کمی آگئی اور انھوں نے ترمیم کے بعد خطوط کا شائع کرانا منظور کر لیا۔ بقول مختارالدین احمد آرزو:

"خطوں کو جمع کرنا اور ترتیب کا کام ان کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا۔ گو ان کی حیات میں کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔" ۴۲

مجموعوں کے علاوہ ان کے خطوط مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے، جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں خطوط نویسی سے دلچسپی بہت کم تھی۔ خط لکھنے کے لیے نہ کوئی اہتمام کرتے نہ کوئی مخصوص کاغذ ہوتا تھا بلکہ ضرورت کے وقت ردی پر ہی لکھ دیا کرتے تھے۔ عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

"عزیز مکرم، یہ مضمون آپ کو بھیجنا تھا، ردی پر لکھ دیا۔"

"غلطی سے یہ خط ردی کاغذ پر لکھ گیا۔ معاف فرمایئے گا۔" ۴۳

خطوں کی عبارت سادہ اور جملے مختصر لکھتے تھے۔ خط بھی عام طور پر مختصر ہی ہیں القاب و آداب کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ پیراگراف بہت بدلتے ہیں۔ خط کی پیشانی پر عموماً مقام و تاریخ، سیدھے ہاتھ پر لکھا گیا ہے۔ خاتمہ پر دستخط کی جگہ اکبر حسین یا صرف اکبر لکھتے ہیں۔ اور کہیں کہیں الف۔ ح یا A.H. بھی لکھ دیتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔ اکبرالہ آبادی کے خطوط میں املا کے متعلق مختار الدین احمد آرزو لکھتے ہیں:

"وہ اکثر لفظوں کو ملا کر لکھتے تھے۔ 'کسی کی جگہ' 'کسیکو' 'تیار' کا املا ان کے یہاں طیار ہے۔ اسی طرح 'پہنچا' کو 'پہونچا' اور 'کل' کو 'کلّ' لکھا کرتے تھے۔"۳۴

اکبرالہ آبادی کے خطوط کا اسلوبیاتی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ خطوط کی نثر صاف ستھری ہے۔ فارسی کے ضرب الامثال، محاورات، اشعار اور عربی فقروں کے کہیں کہیں استعمال کے باوجود نثر سلیس محسوس ہوتی ہے۔ القاب و آداب میں جدت و ندرت کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے اکثر بغیر القاب کے براہ راست گفتگو بھی شروع ہو جاتی ہے۔ خطوط کے نصف ملاقات ہونے کا تذکرہ بھی انھوں نے اکثر مکتوب الیہم سے کیا ہے۔ کہیں کہیں ادیبانہ رنگ پھڑک اٹھتی ہے۔ اور تکلف و آرائش کے حسن پر توجہ دینے لگتے ہیں۔ مگر یہ رنگ اکبرالہ آبادی کے یہاں فصیح و بلیغ انداز کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں کہ آپ ایسے امیر باتوقیر اور موحد روشن ضمیر اور عالم باعمل و مدبر اور حکیم شریعت و تفسیر کے دل میں میری جگہ ہے۔"۳۵

اکبرالہ آبادی کے خطوط میں ان کے عہد اور حالات پر تبصرہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ علمی مسائل و ادبی رجحانات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے ساتھ اکبرالہ آبادی کے تعلقات بہت شگفتہ تھے یہی صورت علامہ اقبال کے ساتھ بھی تھی۔ لیکن دونوں کے روابط میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب نظریاتی اختلافات کی پرچھائیاں ان کے دل و دماغ پر پڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس اختلاف سے دوستی تک کی داستان اکبرالہ آبادی کے خطوط میں پوشیدہ ہے۔ عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیرازی کو برا بھلا کہا ہے میری نظر میں

کھٹک رہے ہیں۔ ان کی مثنوی 'اسرار خودی' آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب مثنوی 'رموز بے خودی' شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہیں دیکھی دل نہیں چاہا۔ خط کتابت ہے لیکن میں ان کے انقلاب طبیعت سے خوش نہیں ہوں۔"۳۶

علی گڑھ تحریک کے مخالفین میں اکبرالہ آبادی کا نام بھی خصوصیت سے آتا رہا ہے۔ لیکن ان کی شاعری سے قطع نظر "سرسید، نیچر اور 'یونیورسٹی'" کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اکبرالہ آبادی نئی روشنی جدید تحریکات اور مغربی اثرات کو نئے موضوعات کی شکل میں قبول بھی کر رہے تھے۔ اس بات کا اظہار ان کے خطوط میں ملتا ہے کہ وہ مغربی تعلیم کے نفاذ اور یونیورسٹی کی تشکیل کے دل سے خواہاں تھے۔ اگر اکبرالہ آبادی کے خطوط کا مطالعہ نہ کیا جاتا تو ان کی شخصیت کا اہم گوشہ تاریک رہ جاتا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یونیورسٹی کا میں ایسا خیرخواہ ہوں جیسا انگریزی عمل داری کا۔ یونیورسٹی ہماری تکمیل نفسی بلکہ انسانیت کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جس طرح انگریزی عمل داری ہم کو مہذب انسان بنانے کے لیے ضروری تھی۔ یونیورسٹی قوم کے لیے ضروری نہ ہوتی تو دشمن سے یہ صدا کیوں اٹھتی اور ہمارے رئیس اس کے لیے کیوں دوڑتے۔"۳۷

خطوط کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اکبرالہ آبادی نے وقت اور ماحول کے مطابق کروٹ بدلی۔ انھوں نے اپنے بیٹے عشرت کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیجا اس بات کا ذکر بھی انھوں نے خطوط میں کیا ہے۔

اکبرالہ آبادی کے آخری خطوط میں زندگی سے بیزاری کا اظہار ملتا ہے۔ وہ دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے اکتا گئے تھے۔ محشر لکھنوی کے نام لکھے خطوط کیوں کہ زندگی کے آخری دور کے ہیں اکبر ان میں موت کے منتظر نظر آتے ہیں۔ محشر کے نام لکھے خطوں میں زندگی سے بیزاری کا مضمون زیادہ ملتا ہے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کے اظہار محبت نے دم بھر کے لیے زندگی کو لذیذ کر دیا۔ ورنہ کچھ نہ پوچھیے کیا گزرتی ہے۔

اس قدر زیست سے بیزار کیا ہے غم نے
ملک الموت نے پایا مجھے مشتاق اپنا" ۳۸

ان خطوط سے اکبرالہ آبادی کی خانگی زندگی اور ان کے مسائل و معاملات کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے۔ اہلیہ کی موت کا ذکر چھوٹے بیٹے کی پرورش کی پریشانیوں کا ذکر، بڑے بیٹے عشرت کی تعلیم اور ان کی شادی کا ذکر ان خطوں میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اکبر نے بے پردہ خواتین یا پردہ سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ انھوں نے خاموشی سے اپنا نقطۂ نظر بدل دیا۔ پردہ سے متعلق خطوط میں اکبرالہ آبادی کی ایک الگ شخصیت سامنے آتی ہے۔

عزیز لکھنوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری نظمیں پردے کے متعلق یکجا ہو کر شائع ہو جائیں۔ میں کہتا ہوں خواہ مخواہ بیگمات کے کوسنے کیوں کھاؤں۔ بہر حال اگر یہ انتخاب چھپا تو میری معذرت بھی ہوگی۔" ۳۹

اکبرالہ آبادی کے خطوط صرف خطوط ہی نہیں بلکہ وقت کا آئینہ ہیں۔ ان میں عالمانہ بصیرت اور فکری تو نگری کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ یہ خط حال سے ماضی تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔ ان میں علما کا ذکر بھی ہے۔ شہر و قصبات کی تہذیبی و تمدنی زندگی کا عکس بھی موجود ہے۔ بذلہ سنجی اور قوت بیانیہ کی مثالیں ملتی ہیں۔ اسلوب سادہ اور انداز بیانیہ ہے۔ دو ٹوک بات کہنے کا طرز اسلوب کو تازہ و شگفتہ رکھتا ہے۔ تاریخی اور معاشرتی حقائق نے ان کے نظریاتی رویے کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔

ان خطوط کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

"یہ خطوط انھوں نے خواجہ حسن نظامی، منشی دیا نرائن نگم، احسن مارہروی، مرزا محمد ہادی عزیز اور مولوی عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے ہیں۔ وہ چھپ گئے ہیں۔ ان سے ان کے اصلی مزاج کا رنگ اور بعض نج کے واقعات بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں اور ایک عمدہ سوانح عمری تیار ہو سکتی ہے۔ یہ خطوط نہایت دلچسپ اور لطیف مقولوں کی شان رکھتے ہیں۔" ۴۰



مہدی افادی

مہدی افادی اردو ادب کے کوئی باقاعدہ نثر نگار نہ تھے لیکن اپنی شگفتہ، رنگین، دلچسپ اور مخصوص و منفرد طرز کے لیے مشہور ہیں۔ وہ اردو کے عاشق اور اس کے چاہنے والوں کے شیدائی تھے۔ وہ بھی خاموش نہیں بیٹھے بلکہ اپنی ساحرانہ طرز تحریر اور گفتگو کے ذریعہ اردو زبان کی خدمت کرتے رہے اور دوسروں کو خدمت کرنے کے لیے آمادہ کرتے رہے۔

مہدی افادی شبلی نعمانی کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ حالانکہ انھوں نے باقاعدہ تصنیف و تالیف کی جانب توجہ نہ کی لیکن ان کے خطوں و تبصروں نے انھیں اردو ادب میں ایک ممتاز مقام بخش دیا۔ ان کے مکتوبات سے ادب کی ایک نئی روش کا آغاز ہوا۔ اس روش کا نقش اول شبلی کی تحریروں میں ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ مہدی افادی نے خطوط میں بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں سے علمی و ادبی گفتگو کی نجی زندگی کے احوال قلم بند کیے اور سرگوشیوں میں چہلیں کی ہیں۔ مہدی کے انداز میں رومانی اور شاعرانہ حسن بیان بہت ملتا ہے۔

مہدی افادی کی بیگم نے ان کے قیمتی خطوط کو جو انھوں نے اپنے عزیز دوستوں اور مشفقوں کو لکھے تھے یکجا کر کے دنیائے ادب کو دیے۔ وہ خطوط جو انھوں نے خود محفوظ رکھے تھے اور ان سے والہانہ محبت کرنے والے شوہر نے لکھے تھے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے "صحیفۂ محبت" کے نام سے مرتب کر کے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ مہدی افادی کے خطوط کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

مکاتیب مہدی

"مکاتیب مہدی" مرتبہ مہدی بیگم، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی

اور پیش لفظ ڈاکٹر محمود الٰہی کا تحریر کردہ ہے۔ ان خطوط پر سید سلیمان ندوی نے تبصرہ تحریر کیا ہے جو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ دو سو تین صفحات پر محیط اس مجموعے میں دو سو نو خطوط ہیں۔ یہ خطوط مئی ۱۸۹۶ء سے ۳۰ نومبر ۱۹۲۱ء تک پھیلے ہوئے زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ اس طرح یہ خطوط تقریباً پچیس سال کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ خطوط پندرہ حضرات کے نام ہیں۔ پچیس سال کے درمیان لکھے گئے ان خطوط سے اگرچہ مختلف موضوعات پر روشنی پڑتی ہے لیکن پوری فضا پر اردو زبان و ادب کا رنگ غالب ہے۔ کبھی رسائل کا ذکر کبھی کتابوں کی باتیں کبھی کسی اچھے ادبی کارنامے کو سراہا جا رہا ہے۔ کبھی مشورے دیے جا رہے ہیں۔ کبھی ادبی کام کے لیے اکسایا جا رہا ہے۔

صحیفۂ محبت

صحیفۂ محبت، مرتب: ڈاکٹر محمود الٰہی۔ اس مجموعے میں خطوط کی تعداد ایک سو بیانوے ہے۔ مقدمہ خود مرتب نے تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ زمانی اعتبار سے یہ مکاتیب ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۹ء سے ۱۶ نومبر ۱۹۲۰ء کے درمیانی عرصہ میں تحریر کیے گئے ہیں۔

مہدی افادی بہت محنت اور اہتمام سے خط لکھتے تھے۔ خط نویسی ان کا محبوب اور دل پسند مشغلہ تھا۔ شبلی کے نام مہدی افادی کے خطوط دستیاب نہیں ہوئے تو مہدی بیگم اظہار افسوس کرتے ہوئے "مکاتیب مہدی" میں لکھتی ہیں:

"اس کا افسوس ہے کہ مرحوم کے بہت سے خطوط حاصل نہ کر سکی، خاص کر مولانا شبلی مرحوم کو انھوں نے کیسے کیسے بہترین خطوط لکھے۔ لیکن مولانا مرحوم نے باوجود اتنے خلوص اور قدردانی کے ساتھ بھی خطوط کو محفوظ نہیں رکھا۔"۴۱

خود مہدی افادی اپنے خطوط سے متعلق رائے دیتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس خط کو محفوظ رکھیے گا۔ اس کا افسوس ہے کہ میرے خیالات پریشاں اور خاص کر خطوط کے انبار سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہو سکتا تھا کہ دنیائے ادب میں کچھ دنوں چرچا رہتا۔ ایک فانی ہستی کا بڑے سے بڑا کنگل ہے۔"۴۲

مکاتیب مہدی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود مہدی مرحوم خطوط نویسی کے بہت ہی

قدرداں تھے۔ وہ اکثر ادیبوں کے خطوط بہت ہی حفاظت سے رکھتے تھے۔ "مکاتیب شبلی" کے سلسلے میں اپنے ایک دوست کو مہدی افادی لکھتے ہیں:

"مکاتیب شبلی دراصل دیکھنے کی چیز ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس علم کے پتلے کا کوئی رونگٹا بیکار نہیں۔ خط لٹریچر کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئے گی۔ اس لیے سرسری اظہار خیال بھی اگر اس پایہ کا ہو کہ انشاپردازی اس کی بلائیں لیتی ہو تو یہ بھی کمال کا ایسا رخ ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔"۴۳

مہدی افادی فطرتاً احساس جمال سے سرشار اور مشرق و مغرب کی جمالیات سے ذہنی طور پر گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت کا رومانوی عنصر مکتوب الیہ سے رشتہ کی نوعیت کے لحاظ سے واضح ہو جاتا ہے۔ مہدی افادی کے قریبی دوستوں میں سید سلیمان ندوی، شبلی اور عبدالماجد دریابادی جیسی شخصیتیں بھی شامل تھیں۔ آل احمد سرور کے مطابق وہ بڑے بڑے مولویوں کی تقدس مآب بارگاہوں میں ادب کی شمع روشن کرتے تھے۔۴۴

"مکاتیب مہدی" میں سلیمان سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"وہ میری مولویت سے خار کھاتے تھے اگر ان کا بس چلتا تو اس "جامہ عاریت" کو وہ تار تار کر ڈالتے۔ مگر آگے چل کر ان کو تسکین سی ہو گئی کہ اس مولویت کی گرانی ان کے ذوق لطافت پر بار نہ ہو گی۔"۴۵

خطوط میں سید سلیمان ندوی کے علاوہ دیگر احباب کو بھی چھیڑتے نظر آتے ہیں۔ "مکاتیب مہدی" میں شامل خطوط ادبی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط میں وہ ادبی خوبیاں موجود ہیں جو اہل قلم کے خطوط میں ہونی چاہیے۔ ان کے خطوط میں جابجا شوخی، متانت اور دلچسپ فقروں کے ساتھ خطوط پر لطف ہیں۔ تلمیحات کا استعمال، نئی نئی تراکیب اور انگریزی اصطلاحات کے لیے نئے نئے الفاظ وضع کیے گئے ہیں۔ انشاپردازی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ تعزیت کا منفرد انداز ہے جگہ جگہ واقعہ نگاری اور مرقع کشی کی گئی ہے۔

مہدی افادی انگریزی اصطلاحات کے لیے فارسی و عربی کے نئے نئے الفاظ و تراکیب وضع

کرنے پر خوش ہوتے ہیں اور احباب کو اس خوشی میں شامل کرتے ہیں۔ خان بہادر ناصر علی کے نام ایک خط میں مہدی افادی لکھتے ہیں:

"بہت خوش ہوا آپ نے بعض اصطلاحات پسند فرمائیں۔ آجکل ثقافت کی زبان پر انگریزی الفاظ کی جگہ اصطلاحات مصریہ چڑھتی جاتی ہے۔ بہت ہوا تو انگریزی قوس میں لکھ دی جس سے ترکیب سمجھ میں آجائے۔ میں بھی اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں کئی لفظ مصر سے منگوائے مثلاً عوائد اسے بھی وہیں سے ملا۔ مصر میں "عوائد" انکم ٹیکس کی جگہ مستقل ہونے لگا ہے۔ کس قدر خوبصورت اور چھوٹا سا لفظ ہے۔ آپ کی زبان پر چڑھ جاتا تو ایک بات تھی۔ ہمارے ہاں آداب فرنگ اور جانے کیا کیا عامیانہ ترجمے ہوئے جن میں سے ایک بھی آپ کے روزمرہ اور لب ولہجہ کے لائق نہیں۔"[46]

مہدی افادی کی نجی زندگی کا عکس بڑی حد تک ان کے خطوط میں موجود ہے۔ خطوط میں ان سیرت و شخصیت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ مہدی افادی زندگی میں دورنگی کے قائل نہیں تھے۔ اس دورنگی کی شکایت انھیں اپنے دوست و احباب سے بھی اکثر ہوتی تھی۔ اپنے مکتوبات میں سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے جدت وندرت کا پہلو بھی نکال لیا کرتے تھے۔ شوخی فکر اور حکیمانہ نظر سے تحریر کو رنگین بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شیخ محمد کے نام ایک خط میں مہدی افادی لکھتے ہیں:

"تمہاری بھاوج بہت اچھی ہیں۔ زندگی باوصف وجوہ قناعت خوش آئند ہو رہی ہے۔ جمیلہ صالحہ بالکل تندرست ہیں۔ خاص کر صالحہ بالکل بھول گئی ہے۔ جمیلہ اس وقت ایک لیڈیز کلاک پہنے میرے پاس بیٹھی ہیں۔ اس کو سمجھ میں نہیں آتا حامد کہاں سے آ گیا۔"[47]

مہدی افادی کے خطوط میں ایسی باتیں بھی مل جاتی ہیں جس سے مکتوب الیہ کی شخصیت اس کی سوانح اور سیرت کی جھلکیاں بے اختیار ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ مولوی شیخ محمد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمہاری محبت، مہربانہ دل سوزیاں، جمیلہ کی علالت میں تمہاری الوقت

مستعدی غرض شب کو اکثر دلچسپ کہانیاں سنتا ہوں جس کے ہیرو تم ہوتے اور ہیرواین منو کی بھولی بھالی رہ جاتی۔"[48]

مہدی افادی کے قریب قریب تمام تر عادات وخصائل کی جھلکیاں ان کے خطوط میں محفوظ ہیں۔ وہ سگریٹ کے مداح تھے اور ان کے یہاں سگریٹ نوشی کا ذکر دلکش انداز میں ملتا ہے۔

شبلی کی سوانح کا بہت سارا معتبر مواد مہدی افادی کے مراسلوں میں محفوظ ہے جس سے شبلی کے عادات واطوار، کردار ومزاج کی کارفرمائی اور ادبیانہ ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ مہدی افادی دار المصنفین کی کتابوں اور شبلی کے تحریروں پر تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ مولوی عبدالباری ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"علامہ شبلی نے "فلسفہ یونان واسلام" کے سلسلہ میں فلسفہ قدیم وجدید کا موازنہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ کوشش ناتمام رہی۔ میری خواہش تھی کہ آپ کے ہاتھوں سے اس کی تکمیل ہوتی۔"[49]

ان کے اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رات دن علم وادب کے سمندر میں غوطہ زن رہتے تھے۔ اور جب کوئی نئی چیز ہاتھ لگتی تو اس کی طرف متوجہ کرتے تھے یا ان میں کسی علمی وادبی کام سے رغبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ مہدی افادی شبلی نعمانی کی تحریروں اور کتابوں کو کلمات تحسین سے نوازتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کے نام تحریر کردہ خطوط میں شعر العجم کے متعلق لکھتے ہیں:

"شعر العجم دیکھی ہی نہیں آنکھوں سے لگائی اگلے پچھلے بیتیرے نکتے یاد آ گئے اور صدمہ ہوا کہ یہ نعمت ہمیشہ کے لیے چھن گئی۔ صوفیانہ شاعری کی نزاکتیں جس نفاست سے دکھائی گئی ہیں۔ ان سے بہت متاثر ہوا۔"[50]

خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شبلی کے خطوط کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ شبلی نے گرچہ مہدی افادی کے خطوط کو حفاظت سے نہیں رکھا لیکن مہدی افادی نے ان کے ہر رقعہ کا ایک گراں قدر ادبی سرمایہ کے طور پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ مہدی افادی ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کے لائق ادب کارڈ بھی اس قدر جامع و مانع ہوتے ہیں جیسے چنے کی
دال پر قل ہو اللہ لکھی ہو۔'' ۵۱

مہدی کے خطوط سادہ بھی ہیں اور پرکار بھی، آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔ ان کے خطوط میں ان کا اپنا درد اور دوسروں کا غم، شوخی اور سنجیدگی، خطوط میں ادبی چاشنی بھی ہے۔ تنقید کی خشکی بھی۔ خطوط میں ان کا شگفتہ چہرہ، ہنستے لب اور چمکتی ہوئی آنکھیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے خطوط میں ان کے شب و روز سامنے ہوتے ہیں۔ ماحول کی عکاسی ہے۔ گھریلو زندگی کی جھلک اور گھر سے باہر کا سماں جھلکتا ہے۔ دوست، اقارب ملنے والے سب باری باری جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مہدی کے تمام خطوط اپنے زمانے کی ادبی تاریخ اور قابل رشک ادب پارے ہیں۔ ان کے مزاج، عادات، دلچسپیوں، وابستگیوں، پسند و ناپسند، تنقیدی شعور، جمالیاتی حس کی پوری ترجمانی ہوتی ہے۔

سرسید اور ان کی تحریک سے ذہنی وابستگی نے مہدی افادی کی فکر و نظر میں وسعت پیدا کی۔ مہدی افادی سرسید کی غرض و غایت سے بخوبی واقف تھے۔ تہذیب، معاشرت اور ادب کی جو تبدیلیاں آئیں، مہدی کے نزدیک یہ بہت ضروری تھیں۔ انھوں نے متعدد مقامات پر اپنے عہد کے ان اجتماعی مسائل پر جن سے مسلمان دوچار تھے، جس انداز سے تنقید کی ہے، اس سے ان کی وسیع النظری اور حقیقت پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ ''افادات مہدی'' میں لکھتے ہیں:

''آج ترقی اسلام کا اصل راز یہی ہے کہ مسلمان عقلی ترقیات کو مذہبی بندشوں سے بھی آزاد نہ کر سکے۔ ترکی اور ایران میں جو کچھ ہو کر رہے گا وہ اسی ''بے عقلی'' کے ثمرات پیش رس ہیں، دنیا میں کوئی قوم ترقی لو خیز، باقی بھی نہیں رہ سکتی۔ جب تک کہ وہ وقت کی کشش اور ارتقائے تدریجی کے ساتھ اپنے لیے کوئی مزاج عقلی نہ پیدا کر سکی ہو۔'' ۵۲

سرسید احمد خاں کی طرح مہدی افادی جہاں اسلام کی تعلیمات اور اصول کو عین فطرت خیال کرتے تھے۔ وہیں تمدن کے ارتقائی سفر میں مذہب کے دخل کو غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ ایک مقام پر مسلمانوں کی پستی و تنزلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے عام تنزل کے اسباب پر بہت بحث ہو چکی ہے۔ اس لیے صاف صاف سن لیجیے کہ تمدنی امور میں سرے سے مذہب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں ہمارے افعال کو صرف حیثیت افادی اور قواعد کا تابع ہونا چاہیے یہی اصول موضوعہ آج شائستہ اور مہذب دنیا کی ترقیات کا عنوان ہے۔'' ۵۳

خطوط میں بھی کئی مقامات پر مسلمانوں کی پستی و تنزلی کا ذکر ملتا ہے۔ سرسید کی تحریک اور ان کے رفقا سے مہدی افادی کی قربت کا حال بھی ان خطوط میں ملتا ہے۔ سرسید احمد خاں سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ابوالظفر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کانفرنس کے لیے سب کمیٹی کرنے والا ہوں۔ وہ ۲۰ کو ہو جائے گی۔ شہر کے رؤسا لوگوں کو شریک کروں گا۔ پچاس روپے صرف آپس کے دوستوں نے جمع کر لیے ہیں۔ غالباً اس سے زیادہ تعداد ہو جائے گی اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے آئندہ پرچے میں میرا لاکر تحریر دیکھو گے۔ سرسید سے راہ و رسم بڑی ہوئی ہے۔'' ۵۴

مہدی افادی کی زبان و بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

''مہدی صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ ان کی زبان آسان نہیں بلکہ مشکل الفاظ سے بوجھل ہے، اس کے باوجود اس میں رنگینی اور رومانیت بدرجہ اتم موجود ہے۔'' ۵۵

''مکاتیب مہدی'' میں زبان کے مشکل الفاظ سے بوجھل ہونے کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب مہدی افادی ثقیل یا تراکیب اور مترادفات کا استعمال کرتے ہیں اور کچھ خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشکل پسندی سے گھبراتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''رسائل عمادالملک'' پر آپ کے قلم کے سرسری جنبش بھی لٹریچر کا حق ادا کرے گی۔ ''طباطبائی'' کے ثقیل الفاظ کی ٹھوکروں سے میں اس قدر گھبراتا ہوں کہ اس سے قطع نظری بہتر ہے۔'' ۵۶

دوسری جگہ عبدالماجد دریابادی کو ہی لفظ ''متہامل'' سے ناپسندیدگی کا اظہار خیال کرتے

''مشاغل الغوا بالکل ٹھیک ہے لیکن ذرا مولوی کرامت حسین کا کاپ ہے۔ یعنی

روز مرہ پر بار ہوگا۔'' [۹۵]

دیگر خطوط سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ مغلق اور ثقیل الفاظ سے نہ صرف دوسروں کو روکتے تھے بلکہ اس پر خود بھی عمل کرتے تھے۔

مہدی افادی کے خطوط میں القاب و آداب کا جو انداز ملتا ہے وہ مغربی مکتوب نگاروں کی یاد دلاتا ہے۔ ان کے خطوط میں بھی دیگر مضامین کی طرح ہی روایت سے شعوری انحراف کا شدید میلان ملتا ہے۔ مہدی کے خطوط میں جناب من، جناب قبلہ، یا جناب والا جیسے القاب مشکل سے ہی نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف میرے پیارے، پیارے، پیارے ماجد، پیارے مولانا، پیارے جناب، پیارے بھائی، تیرا عاشق، میری پیاری بیوی اس قسم کے دوسرے القاب کا استعمال اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ وہ مکتوب نگاری کے مشرقی انداز پر مغربی لوازم نامہ نگاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی انداز انھوں نے خطوط کے اختتامیہ پر بھی اختیار کیا ہے۔ مہدی افادی کے خطوط میں شعر یا مصرع کا استعمال بھی ان کی شوخیِ طبع کی غمازی کرتا ہے۔ شعروں میں رحریت کے ساتھ مہدی کی مدعا نگاری کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ سید سلیمان ندوی یوروپ گئے ہوئے تو مہدی نے انھیں ایک شعر لکھ کر ہی خط روانہ کر دیا تھا:

''زاہد کچھ خیال فرض بھی ہے کعبہ سے پہلے عزم لندن کا۔''

''مکاتیب مہدی'' کے مقابلے میں ''صحیفۂ محبت'' کے خطوط زبان و بیان کے اعتبار سے زیادہ سلیس اور سادہ ہیں۔ لیکن ''صحیفۂ محبت'' کے خطوط کی یہ سادگی سپاٹ اور بے جان نہیں ہے۔ خطوط میں مہدی افادی کے جذبات ''رنگ و روغن'' کے بغیر لفظوں کے سانچے ڈھلے ہوئے ہیں۔

محمود الٰہی نے مہدی افادی کے خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صحیفۂ محبت کے خطوط میں اکثر انشا پردازی کے بہتر سے بہتر نمونے ملیں گے جو افادات کے مضامین کی یاد دلائیں گے، حالانکہ ان خطوں میں اس قسم کے اہتمام کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا، جو مضامین کے لیے ہوتا ہے۔ یہ تو نجی کے خطوط ہیں اور ایسے خطوط جن کے لیے کہا گیا ہے کہ ''کراما کاتبین راہم

خبر نیست'' اس کا مطلب یہ ہے ان کی قوت انشا پردازی خلوت و جلوت کا امتیاز روا نہیں رکھتی جو بولتے تھے وہی لکھتے تھے۔'' [۹۶]

عبدالماجد دریابادی سے مہدی افادی کی خط و کتابت زیادہ رہتی تھی۔ مولوی عبدالماجد دریابادی نے مہدی افادی کی تعزیت میں ایک مضمون بعنوان ''ہمدم'' نومبر ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا۔ خطوط کی نسبت اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''ارباب ذوق کے لیے ان کے مضامین سے بڑھ کر قیمتی ان کے خطوط ہوتے تھے۔ ایک ایک سطر ادب و انشا کی جان ہوتی تھی۔ اپنی بصیرت اور علم کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ دورِ موجودہ کے ادیبوں میں شاید بلا استثنا کسی کے بھی خطوط اس قدر دلچسپ و پُر لطف نہیں ہوتے تھے۔ جن خوش نصیبوں سے سلسلہ مراسلت قائم تھا وہ شوق و اشتیاق کے ساتھ جدید مکتوب کے منتظر رہتے اور پچھلے گرامی نامہ سے ہفتوں لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔'' [۹۷]



پریم چند

پریم چند اردو کے مشہور و معروف افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں پر
اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو فخر ہے۔ انھوں نے مختصر افسانہ نگاری کو رواج دیا۔ اور ناول کو بھی
آزادی، انصاف اور انسانی حقوق کے لیے ہندوستانی عوام کی جدوجہد کا ترجمان بنایا۔ ہر دل عزیز
افسانہ نگار اور ناول نگار کے خطوط ان کی نجی زندگی تصنیفی کارناموں اور ان کے عہد کا احاطہ کرتے
ہیں۔ پریم چند کے خطوط کا بڑا سرمایہ اردو ادب میں موجود ہے، جس میں وہ چھپتے پھرتے، بات چیت
کرتے، جابجا کہانیوں، ناولوں، افسانوں، مضامین اور رسائل و جرائد کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔

پریم چند کے خطوط کا مجموعہ "پریم چند کے خطوط" کے عنوان سے مدن گوپال نے مرتب کیا۔
یہ مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل خطوط زمانی اعتبار سے
۳۰ جنوری ۱۹۰۵ء سے ۱۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصہ پر محیط ہیں۔ خطوط کی کل تعداد
دو سو ساٹھ (۲۶۰) ہے۔ مجموعہ کے سرورق پر پریم چند کی تصویر اور خط کا عکس موجود ہے۔

ایک مشہور ادیب ہونے کے ناطے پریم چند کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی
جا چکی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ازدواجی زندگی سے متعلق لوگوں نے اپنی آرا کا اظہار بھی کیا ہے
اور اس پہلو کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی بیوی کو میکے بھیج دیا اور کنارہ کشی اختیار
کر لی تھی اور ایک بیوہ خاتون سے ربط و ضبط اور آشنائی کی وجہ سے انھیں شریک حیات بنا لیا تھا۔
اس سلسلے میں قمر رئیس لکھتے ہیں:

"شادی کے بعد بیوی سے ان کی نہیں بنتی تھی اور وہ انھیں پسند بھی نہیں تھیں۔
ایک بار وہ جھگڑا کر کے اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی۔ پریم چند نے پھر اسے

نہیں بلایا۔ اور ایک بیوہ سے جس کا نام شورانی دیوی تھا، انھوں نے دوسری
شادی کر لی۔" [۲۰]

پریم چند کے تمام دوستوں میں سب سے نزدیک اور ہمراز دیا نرائن نگم تھے اور اکثر خطوط میں
پریم چند اپنا حال دل انھیں سے بیان کرتے تھے۔ ایک خط میں دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں:

"عورتوں نے ایک دوسرے کو جلی کٹی سنائیں۔ ہماری خودسر نے جل بھن کر
گلے میں پھانسی لگائی۔ ماں نے آدھی رات کو بھانپا، دوڑیں ان کو رہا کیا۔ صبح
ہوئی میں نے خبر پائی، جھلایا، بگڑا، لعنت ملامت کی۔ بیوی صاحب نے اب ضد
پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی، میکے جاؤں گی۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا ناچار کھیت کا
منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی۔ وہ رو دھو کر چلی گئی۔" [۲۱]

دوسرے خط میں جو انھوں نے زندگی کے آخری ایام میں اندر ناتھ کو لکھا تھا، اپنی پہلی بیوی کا
ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"میری پہلی بیوی ۱۹۰۳ء میں انتقال کر گئی۔ بے چاری بد قسمت اور معمولی شکل و
صورت کی عورت تھی۔ گو کہ اس سے مطمئن نہ تھا۔ تاہم روایتی شوہروں کی طرح اس
سے نباہ کرتا رہا۔ اس کی وفات کے بعد میں نے ایک بال ودھوا سے شادی کر لی۔" [۲۲]

خطوط دراصل وہ آئینہ ہوتے ہیں جس میں لکھنے والے کا جیتا جاگتا عکس نظر آتا ہے جیسا کہ وہ
حقیقتاً ہوتا ہے۔ یعنی فاضل اور عظیم شخصیت کا مالک ہونے کے باوجود بھی انسانی کمزوریوں سے بھرپور
ایک شخص ہے جس کو بچپن، بڑھاپا، جوانی ایک عام انسان کی مانند متاثر کرتا ہے۔ پریم چند کے خطوط
میں ان کی سوانح اور سیرت سے متعلق مواد موجود ہے۔ مثلاً شادی، ملازمت مختلف شہروں میں ان کا
قیام، پریس کی ابتدا، اہل خاندان کے مسائل کی جھلکیوں کے علاوہ ان کے اپنے قد و قامت اور
خدوخال کا ذکر بھی ان خطوط میں مل جاتا ہے۔ پریم چند امتیاز علی تاج کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری وضع قطع اور شکل و شباہت کے متعلق آپ نے جو قیاس کیا ہے۔ اس سے
روحانی تعلق کا گمان اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ بیشک میرا سن ۴۰ سال ہے۔ میں
بند کالر کوٹ اور سیدھا پاجامہ پہنتا ہوں اور پگڑی باندھتا ہوں۔" [۲۳]

پریم چند نے اپنے خطوط میں نجی معاملات و مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے حقیقت پسندی کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنی زندگی معاشی بدحالی میں گزاری اس سلسلے میں انھیں دوستوں کے احسانات تلے دبنا پڑا اور اصولوں کی قربانی دینی پڑی۔ ایک وقت ایسا بھی رہا کہ انھوں اپنی کہانیوں اور ناولوں کو ذریعۂ معاش بنالیا تھا۔ ایک جگہ معاشی حالت سے پریشان ہوکر پریم چند لکھتے ہیں:

"میرے پریس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ سال بھر پورا ہوگیا۔ نفع اور سود کی تو
درکنار کوئی چھ سو روپے کا گھاٹا ہے۔" ۴۴

دوسرے خط میں پریم چند لکھتے ہیں:

"جو کچھ آمدنی ہوتی ہے وہ اوپر ہی اوپر اڑ جاتی ہے۔ ویشن تو پورا نہیں پڑتا۔ کاغذ
کے کئی سو روپے باقی پڑے ہوئے ہیں۔ خرچ ۵۰۰ روپے مہینے کا ہے۔ آمدنی
کل ملا کر ۴۰۰ روپے سے زیادہ نہیں۔" ۴۵

پریم چند نے تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا۔ ان کے خطوط میں تحریک آزادی سے متعلق مواد موجود ہے۔ اس وقت کی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ملک کے حالات کی تصویر ان کے خطوط میں ملتی ہے۔ ان کی سیاسی دلچسپیوں اور جوش کا اندازہ ان کے خطوط کے مطالعے سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ نینی تال کے سفر سے واپسی پر بنارسی داس چترویدی کے نام ایک خط میں پریم چند لکھتے ہیں:

"وہاں سے واپس آیا تو یہاں کانگریس کی الجھنوں میں پڑا رہا۔ شہر پر فوج پر
قبضہ ہے۔ امین آباد کے دونوں پارکوں میں سپاہی اور گورے ڈیرے ڈالے
پڑے ہیں۔ ۱۴۴ دھارا لگی ہوئی ہے۔ پولیس لوگوں کو گرفتار کررہی ہے۔" ۴۶

مندرجہ بالا خط اصل خط ہندی رسم الخط میں ہے۔ اور مدن گوپال نے مجموعہ "پریم چند کے خطوط" میں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی خطوط ہندی میں ہیں جس کی وضاحت مرتب نے حاشیے میں کردی ہے۔

پریم چند اور ان کی بیوی دونوں آزادی کی تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ پورے ملک میں ستیہ گرہ اور غیر ملکی سامان کی مخالفت چل رہی تھی۔ اس میں حصہ لینے والے ہزاروں مرد اور عورتیں

گرفتار ہورہے تھے۔ ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو خود شورانی دیوی گرفتار کرلی گئیں۔ شورانی دیوی کی گرفتاری کے بعد امبیشور بابو کو مطلع کرتے ہوئے پریم چند لکھتے ہیں:

"تمہاری موسی کو تاریخ کو ایک ودیشی کپڑے کی دکان پر پکٹنگ کرتے ہوئے
پکڑلی گئیں۔ میں ان سے جیل میں ملا اور ہمیشہ کی طرح خوش پایا۔ انھوں نے
ہم لوگوں کو پچھاڑ دیا اور میں اپنی آنکھوں میں چھوٹا لگ رہا ہوں۔" ۴۷

پریم چند نے اپنی کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۰۸ء میں "سوز وطن" کے نام سے کانپور سے شائع کیا۔ اس مجموعہ میں انھوں نے وطن کی محبت کے جذبات کو پیش کیا تھا۔ جب انگریز حاکموں کو اس بات کی خبر ہوئی تو انھیں یہ مجموعہ ضبط کرلیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کہانیوں میں حکومت سے بغاوت کے لیے اکسایا گیا ہے۔ اس لیے انگریزوں نے ان کی کتابیں نذر آتش کردیں۔ یہ کتاب نواب رائے کے نام سے لکھی گئی تھی۔ انگریز حاکموں نے پریم چند پر یہ پابندی عائد کردی کہ جو کچھ لکھیں انگریزوں کو دکھا کر لکھیں۔ ایک خط میں پریم چند لکھتے ہیں:

"میں کوئی مضمون لکھوں، خواہ کسی مضمون پر ہاتھی دانت ہی پر کیوں نہ ہو۔
لکھوں۔ مجھے پہلے وہ جناب فیض مآب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش
کرنا پڑے گا۔" ۴۸

اسی زمانے میں ان کے دوست دیانرائن نگم نے مشورہ دیا کہ وہ پریم چند کے نام سے لکھا کریں۔ پریم چند کے خطوط کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا نام "پریم چند" دیانرائن نگم جو "زمانہ" کے ایڈیٹر تھے، دیا ہوا ہے۔ اس بات کا اظہار پریم چند نے اپنے خط میں اس طرح کیا ہے:

"پریم چند اچھا نام ہے۔ مجھے بھی پسند آیا۔ افسوس یہ ہے کہ پانچ سال میں
نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی، وہ سب اکارت گئی، یہ حضرات
قسمت کے ہمیشہ تختہ رہے ہیں اور شاید رہیں گے۔" ۴۹

مختلف مقامات کے سفر کا ذکر بھی پریم چند کے خطوط میں ملتا ہے۔ مثلاً کانپور، نینی تال، مسوری، کاشی، گورکھپور، لکھنؤ، ممبئی، علی گڑھ وغیرہ۔ علی گڑھ کے سفر کے بعد مسلم یونیورسٹی کے متعلق لکھتے ہیں:

"علی گڑھ میں دو تین کھانے کے سوائے اور کچھ نہ ہوا۔ ہماری اسکیم کو لوگوں نے

پسند تو بہت کیا۔ مگر ان دنوں یونیورسٹی بند تھی۔ اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے

جلسے اور بے تھے۔" ۱۰؎

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"مجھے تعجب یہ ہوا کہ وہاں کتنی ہی مسلم لڑکیاں پردہ نہیں کرتیں۔ اور وہ سب میری

نئی سے نئی اردو پرکاشت کتاب "نمین" پڑھ چکی ہیں۔" ۱؎

پریم چند کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خطوط میں نہ صرف معاصر شعرا پر اظہار خیال کیا ہے۔ بلکہ اہم ادبی رسائل وجرائد پر پوری جرأت اور بے باکی سے تبصرے بھی کیے ہیں۔ خطوط کے مطالعے سے ان کے فنی نقطۂ نظر شاعرانہ ذوق اور علمی وادبی افکار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک خط میں پریم چند لکھتے ہیں:

"مجھے اشعار وہی اپیل کرتے ہیں جن میں کوئی جدت ہو۔ غالب کے رنگ کا

میں عاشق ہوں۔ عزیز لکھنوی کے گل کدہ کی خوب سیر کی لیکن بدقسمتی سے ایک

شعر بھی سوز وں نہیں کرسکا نہ دل چاہتا ہے۔" ۲؎

پریم چند کے خطوط سے ان کی بے جھجک اور غیر جانب دارانہ رائے بھی سامنے آتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق ان کے خیالات کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جس میں وہ لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف نظر آتے ہیں۔ پریم چند ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی میں تو تعلیم یافتہ لڑکیوں کی جانب سے خدا جانے کیوں بدگمان ہوں۔

ابھی تک تو لڑکوں کی لاپرواہی کے باوجود گرہستی چلتی رہتی تھی کیوں کہ لڑکیاں

عام طور پر دل سے گرہستی کا پالن کرتی تھیں لیکن جب دونوں ایک ہی رنگ میں

رنگ گئے تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔" ۳؎

۱۹۳۴ء میں پیسے کی تنگی کی وجہ سے پریم چند کو بمبئی کی ایک فلم کمپنی کی پیش کش پر کام کرنے کے لیے جانا پڑا۔ اس کمپنی کا نام اجنتا سنی ٹون تھا۔ اس پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بمبئی کی ایک کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں کنٹریکٹ کی بات ہے۔

آٹھ ہزار روپے سال۔ اس حالت میں پہنچ گیا ہوں کہ جب میرے لیے ہاں

کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" ۴؎

خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف پیسہ کمانا ان کا اصل مدعا نہیں تھا بلکہ وہ فلموں کے وسیلے سے اپنے خیالات لاکھوں لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن اس میں انھیں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور کسی بھی طرح وہاں کے حالات اور طرز زندگی سے سمجھوتہ نہ کرسکے۔ اور مایوس ہوکر وطن واپس چلے گئے۔ فلم انڈسٹری میں استحصال سے متعلق پریم چند لکھتے ہیں:

"جن ہاتھوں میں فلم کی قسمت ہے وہ بدقسمتی سے اسے انڈسٹری سمجھ بیٹھے ہیں۔

انڈسٹری کو مذاق اور اصلاح سے کیا نسبت۔ وہ تو اکسپلائٹ کرنا جانتی ہے۔ اور

یہاں انسان کے مقدس ترین جذبات کو اکسپلائٹ کررہی ہے۔" ۵؎

پریم چند نے "کربلا" کے عنوان سے ایک ڈرامہ لکھا تھا۔ اس ڈرامے سے متعلق خاصا مواد خطوط میں موجود ہے۔ یہ ڈرامہ واقعات کربلا پر مبنی تھا جس پر اپنے نقطۂ نظر سے غور کرنے والوں نے اعتراض کے بعض پہلو تلاش کرلیے۔ ان اعتراضات سے تنگ آکر پریم چند اپنے تاثرات کا اظہار ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

"اگر مسلمانوں کو یہ بھی منظور نہیں کہ کسی ہندو کے زبان و قلم سے ان کے کسی

مذہبی پیشوا یا امام کی مدح سرائے ہو تو میں اس کے لیے مصر نہیں ہوں۔" ۶؎

ڈرامہ کی تنقید کی وجہ سے اس خط میں تلخی نظر آتی ہے لیکن دوسرے خط میں پریم چند اس طرح لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندی سے خود ترجمہ نہیں کیا ہے۔ میرے ایک نارمل اسکول

کے دوست منشی منیر حیدر صاحب ترجمے ہیں انھیں سے کرایا ہے۔ اب بقیہ حصوں کا

ترجمہ میں خود کروں گا۔ تب جو خامیاں ہوں گی وہ ضرور نکال دوں گا۔" ۷؎

پریم چند نے اپنے خطوط میں جس اسلوب نگارش اور طرز تحریر کی جانب اشارہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن ادیبوں کا خصوصیت کے ساتھ، انھوں نے مطالعہ کیا ہو ان کا طرز تحریر ان کی اپنی نفسیات اور اسلوب نگارش پر اثر انداز ہوا۔ ایک خط میں طرز تحریر کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے اب تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کون سا طرز تحریر اختیار کروں۔ کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں، کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں۔ آج کل کاونٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں، تب سے کچھ اس رنگ کی طرف مائل ہوں۔" ۸ے

پریم چند کے خطوط زیادہ تر رواں دواں اور نسبتاً سلیس زبان میں لکھے ہیں۔ رائج الوقت اور ان کی زبان پر چڑھے ہوئے انگریزی اور ہندی زبان کے الفاظ ان کے خطوط کی زینت ہیں۔ ان کے خطوط میں محاورات اور ضرب الامثال کا بے تکلف استعمال ان کے زمانے کی ذہنی وادبی فضا کو بھی پیش کرتا ہے۔ ان کے خطوط میں عوامی لب ولہجہ اور زبان اس طرح ہے مثلاً "ڈیڑھ ہزار کا کاغذ باقی پڑا ہوا ہے، بس یوں سمجھیے کہ بدھیا بیٹھ گئی، بڑی کراری چپت پڑی۔

محاورات کا استعمال بھی خطوط میں خوب کیا ہے۔ مثلاً "کیا جہاں مرغا نہ ہوگا، وہاں صبح نہ ہوگی۔' کوٹھے پر آگ برستی ہے اور پسینہ چوٹی سے ایڑی کو چلا۔'

القاب وآداب بہت مختصر اور سادہ استعمال کرتے ہیں مثلاً محترم، عزیز، بھائی جان، برادرم، جناب مکرم و مشفق من، بندہ نواز وغیرہ۔ تقریباً تمام خطوط کے اختتام پر دھنپت رائے یا نیاز مند دھنپت رائے لکھتے ہیں۔

مجموعہ "پریم چند کے خطوط" کے علاوہ ان کے خطوط مختلف رسائل کی زینت بنے۔ اکثر ناقدین نے ان کے خطوط سے ان کی سوانح اور سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں اپنے متعدد ناولوں، کہانیوں اور اخبارات ورسائل کا ذکر کیا ہے اور دیگر افراد کے ڈراما اور کہانیوں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ بنارس میں انھوں نے اپنی پریس "سرسوتی پریس" کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کا ذکر بھی خطوط میں جابجا ملتا ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ان کے معاشی حالات کا علم بھی پریم چند کے خطوط کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جگہ جگہ اپنی بیماری کا ذکر، موسم کا ذکر، بچوں کی فکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پریم چند کے خطوط ادب میں اضافے کے طور پیش کیے جا سکتے ہیں۔



نیاز فتح پوری

رسالہ 'انشاء' کے نیاز فتح پوری نمبر کے اداریے میں نیاز فتح پوری کے متعلق لکھا ہے:

"نیاز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سرسید اور شبلی نعمانی کے علاوہ رابندرناتھ ٹیگور، مہدی افادی اور ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا اثر قبول کیا۔ تفصیلی مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ نیاز مذہب کے معاملے میں سرسید کے ہم نوا تھے اور شاعری اور نثر میں وہ علامہ شبلی سے متاثر نظر آتے تھے۔ اگرچہ سرسید علی رفتار مرتھے۔ ان کا مقصد اسلامی یونین تعلیم میں انقلاب برپا کرنا تھا۔ جب کہ نیاز سرسید کے برخلاف ایک ذہنی انقلاب پسند ثابت ہوئے۔ وہ سیاسی تبدیلی سے زیادہ افراد اور سماج کی فکر اور ذہنی تبدیلی میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی اجتہادی زندگی ذہنی ظلمت پرستوں کے خلاف ایک بغاوت تھی۔" ۹ے

اردو ادب کی مکتوباتی تاریخ میں نیاز فتح پوری کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ جس طرح انھوں نے دیگر اصناف ادب پر اپنے ذہنی اور شعوری تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح ان کے خطوط بھی ان کی تحریری کاوشوں کے شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کے مکاتیب کا بیشتر حصہ ان کی شخصیت، تخلیقی عظمت ورفعت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کے مجموعے تین جلدوں میں "مکتوبات نیاز" کے عنوان سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان مجموعوں کی اشاعت خود نیاز فتح پوری کی نگرانی میں عمل میں آئی کیونکہ یہ خطوط رسالہ "نگار" میں مسلسل شائع ہوتے رہے اس لیے ان کی ہیئت، انداز بیان اور مواد کو پیش کرنے میں نیاز فتح پوری کی شعوری کاوش کا دخل رہا۔ "مکتوبات نیاز" میں شامل خطوط میں نہ صرف مکتوب الیہ کا نام اور نہ ہی مقام تحریر درج ہے جس

کی وجہ سے ان کے خطوط کی تاریخی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ خطوط کی ظاہری صورت سے ایک لمحے کے لیے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خطوط نہ تو کسی کو لکھے گئے اور نہ ہی بھیجے گئے بلکہ انشائیے ہیں جنھیں نیاز فتح پوری نے خطوط کی طرز میں لکھا ہے لیکن خطوط کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خطوط میں کچھ اشخاص اور واقعات کا ذکر اس طرح کیا گیا جس طرح نجی خطوط میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ تمام خطوط فرضی نہیں ہیں بلکہ بیشتر خطوط مختلف لوگوں کے نام لکھے اور بھیجے گئے۔ خطوط کے اصلی ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے چند احباب نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ "مکتوبات نیاز" میں شامل خطوط کے وہ خود مخاطب ہیں۔ مثلاً مالک رام لکھتے ہیں:

> "ان کے جو خطوط مکتوبات نیاز کے نام سے تین جلدوں میں چھپے تھے۔ ان کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کسی شخص کے نام نہیں لکھے گئے ہیں پر نہیں جانتا کہ یہ شبہ کس حد تک درست ہے۔ البتہ اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے بعض ایسے خطوط ہیں جو خود میرے نام لکھے گئے تھے۔" ۵۰

حالانکہ نیاز فتح پوری نے مکتوب الیہم کے نام کو ظاہر کرنے سے اجتناب برتا ہے لیکن ان کے احباب کی پرچھائیوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔ سلام و دعا کے علاوہ ذاتی باتیں، مخاطب کی باتوں کا جواب، اپنا حال کہنا سننا اور اپنی شخصیت کی نمائش، اپنی رائے اور تبصروں کی شمولیت کے علاوہ مکتوب الیہ کی سیرت اور شخصیت کا اندازہ خطوط کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ بقول عبداللطیف اعظمی:

> "انھیں ضرور با "نگار" میں شائع کیا گیا۔ نیاز صاحب چاہتے تھے کہ ان کے مکتوب الیہ زیر بحث نہ آئیں، اس لیے خطوط کے تمام لوازمات کو حذف کر دیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ انھیں بہت پسند کیا گیا تو اسی حالت میں کتابی صورت میں شائع کر دیا۔" ۵۱

عبداللطیف اعظمی کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے اس کی تائید میں خطوط کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً:

> "صحیفۂ گرامی عزیزی یوسف کے ذریعے سے پہنچا۔ آپ کو یاد آئے یا نہ آئے لیکن جو احترام حضرت کا میرے دل میں ہے وہ قطعاً بیان و اظہار سے بے نیاز ہے۔ لفظ احترام میں نے اردو استعمال کیا ورنہ مجھے محبت کہنا چاہیے تھا۔" ۵۲

> "ایک بار مشاعرہ میں بھی دیکھا تھا۔ نواب مرحوم کو نیا نیا ذوق مشاعرہ ہوا تھا اور کئی کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ منشی امیر اللہ تسلیم کی نوبت آگئی تو وہ عصا ٹیک کر کھڑے ہو گئے اور غزل کسی اور نے پڑھنا شروع کی۔ نواب ان کے اشعار کی داد دیتے تھے تو لوگ ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر زور زور سے چیخ چیخ کر کہتے تھے کہ "سرکار آپ کے کلام کی داد دے رہے ہیں۔ وہ جھک جھک کر آداب بجالاتے تھے۔" ۵۳

> "مجھ سے اسلم صاحب نے خط و کتابت بند کر دی ہے اور اگر آپ یہ نہ لکھتے کہ وہ بمبئی میں ہیں تو مجھے یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے۔" ۵۴

> "ڈاکٹر صاحب حیدرآباد میں ہوں گے۔ کئی مہینے ہوئے ایک خط آیا تھا۔ ایران جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور مجھے بھی "دعوت ہمراہی" دے رہے تھے لیکن غالباً ابھی اس ارادے کی تکمیل نہیں ہوگی ورنہ ضرور اطلاع دیتے۔" ۵۵

مندرجہ بالا خطوط کی مثالوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیاز فتح پوری نے خطوط لکھے اور ارسال بھی کیے۔

نیاز فتح پوری کی تحریریں کا حسن صنف نازک کے جلووں سے روشن و تابناک ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنی کتاب "گہوارۂ تمدن" کے ابواب کی فہرست عورت کے پیشہ ورانہ کارناموں کے حوالے سے مرتب کی ہے اور تاریخی تناظر میں مستند حوالوں کی مدد سے بتایا ہے کہ جتنے بھی مشاغل و مظاہر حیات ہیں ان میں اکثر کی ابتدا و ترقی کا سرچشمہ عورت رہی ہے۔ خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تعلقات اور مکاتبت مختلف عورتوں سے رہی تھی۔ ان خطوط میں وہ خاصے بے تکلف نظر آتے ہیں۔ عائشہ خاں لکھتی ہیں:

> "ان کی خط و کتابت متعدد عورتوں سے رہی ہے۔ جن میں سے بعض کا علم مجھے بھی

ہے۔"۵۶

نیاز فتح پوری کے زمانے میں ہونے والے شیعہ سنی کے جھگڑوں اور کسی حد تک مخاطب کے استفسارات کے جواب بھی ان تحریروں میں موجود ہیں۔ ہم عصر شعرا اور ادبا نیز مشاہیر پر اظہار خیال بھی ہے لیکن اس قسم کے خطوط میں بے ساختگی نہیں بلکہ تکلف سے کام لیتے ہیں۔ خطوں میں اسلام ومذہب کا قضیہ اکثر اٹھاتے نظر آتے ہیں لیکن اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتے۔ خطوط کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مکتوب الیہم میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔

خطوط میں کثرت سے اپنے ادبی خیالات اور نظریات کی تبلیغ واشاعت کرتے نظر آتے ہیں اور اپنی بات منوانے کے لیے بحث ومباحثے پر بھی آمادہ نظر آتے ہیں۔ اپنے خیال کی تائید میں مختلف اور متعدد اشعار پیش کرکے تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ ان کے خطوط میں آرٹ، افسانہ نگاری، طنز ومزاح، انقلابی شاعری، فارسی شاعری، قدیم شعرا پر تنقید وتبصرہ بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں:

"فارسی غزل کے باب میں آپ سے بہتر سند اور کیا ہوسکتی ہے۔ آپ میری عزت بڑھاتے ہیں ورنہ ظاہر ہے میں کیا اور میری رائے کیا۔ آپ سے غالباً یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میں قدامت پرستی کا دشمن ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جس حد تک غزل کا تعلق ہے میں قدامت کا پرستار ہوں۔

نظیری، حافظ اور عرفی اس میں شک نہیں کہ "غزل" کے بادشاہ ہیں، لیکن رات کی تنہائیوں اور پچھلے پہر کے سکوت میں، سوائے سعدی کے مجھے کوئی یاد نہیں آتا، ہندی شعرا میں خسرو کے تغزل کا اسی لیے دلدادہ ہوں کہ اس کے کلام سے بھی وہی "بوئے خوش دلی" آتی ہے۔"۵۷

نیاز فتح پوری نے جگہ جگہ اپنے تنقیدی خیالات کو واضح کیا ہے۔ طنز ومزاح پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"صدیق محترم اردو لٹریچر میں ہیومر (Humaur) کہاں؟ اور ہو بھی کیسے سکتا

ہے جس دور سے ہندوستان اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان گزر رہا ہے۔ وہ مرثیہ کا طلب گار ہے نہ کہ ہوٹنگ کا۔ اس وقت اردو کے جتنے مزاحیہ نگار ہیں ان سب میں اس چیز کا فقدان ہے جسے فطری آمد کہتے ہیں۔ جو مضمون اٹھا کر دیکھیے معلوم ہوتا ہے کہ ہنسنے ہنسانے کے لیے خاص اہتمام کیا جا رہا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات غصہ آجاتا ہے۔ لٹریچر میں مزاح اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اقتصادی دور انتہائی عروج پر پہنچ جائے اور یہ سب عروج ذہن کی باتیں ہیں۔ آزادی کی برکتیں نہیں، بے فکری کے کھیل ہیں۔ تو بتائیے ان میں کون سی چیز ہمیں حاصل ہے؟"۵۸

نیاز فتح پوری کے خطوط میں بے ساختگی کے ساتھ اشعار کا استعمال ملتا ہے۔ جب وہ کسی شعر کا حوالہ دیتے ہیں یا نثر ہی میں کسی شعر سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقتباس بالکل اسی موقع کی چیز ہے۔ اردو اور فارسی اشعار کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔

"مکتوبات نیاز" کی اہمیت اپنے اسالیب اور انداز بیان کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ خطوط نہیں بلکہ نثر میں شاعری معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں کلام کی فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ نزاکتوں اور محاسن کا اہتمام بھی ہے۔ صنائع لفظی ومعنوی میں دلکش تشبیہات واستعارات، تلمیحات اور انوکھی تراکیب سے ان کی نثر حسین ہوگئی ہے۔ جوش بیان اور رومان پسندی کے امتزاج سے نثر کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ خطوط کی زبان کے متعلق سید شاہ رشید الرحمٰن ارشد لکھتے ہیں:

"نیاز کا کمال ہے کہ انھوں نے علم وادب اور تنقید وتحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے بھی اپنے خطوط کی زبان کو بوجھل نہیں بنایا۔"۵۹

القاب وآداب کے معاملے میں انھوں نے نہ تو کوئی خاص اہتمام کیا اور نہ ہی اس کی اہمیت اور ضرورت کی طرف توجہ کی۔ مکتوب نگاری میں القاب وآداب کی بہت اہمیت ہے کیونکہ اس سے مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے درمیان کا رشتہ واضح ہو جاتا ہے اور دونوں کی شخصیت کی پہچان بھی ہوتی ہے۔ نیاز فتح پوری کے خطوط عموماً اس طرح شروع ہوتے ہیں:

ا۔ آپ نے دیکھی اپنے دوست کی حماقت

359-358

۲۔ سنئے صاحب!

۳۔ تم سب باتیں کرو۔

انھوں نے خطوط میں القاب و آداب لکھے بھی ہیں تو محترم، صدیقی، عزیز من، بندہ نواز وغیرہ جیسے بے ساختہ عام فہم القاب کا استعمال کیا ہے اور دعائیہ کلمات بھی مختصر ہی ہیں۔ عام طور سے انھوں نے خطوط میں القاب و آداب سے گریز کیا ہے۔ خطوط سے ان کے مخاطب کا پتہ لگانا محال ہے۔ بعض خطوط سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے اور ان سے نیاز فتح پوری کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ بقول سید شاہ رشید الرحمن ارشد:

> "نیاز کے مکاتیب میں شوخی و رنگینی بھی ہے اور طنز و طعن بھی، وضع داری و ہوش مندی بھی ہے اور بحث و تکرار بھی لیکن مختلف اور متنوع کیفیات کے اظہار کے باوجود ان کے لب و لہجہ میں جو سنجیدہ دلکشی یا دلکش سنجیدگی ہے وہی نیاز کی انفرادیت ہے۔"۹۰

ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

> "نیاز کے خط ان کی عام افسانوی تحریروں کی طرح شراب و شعر میں ملفوف ہوتے ہیں۔ ایام شباب کے خطوں میں کہیں کہیں ابوالکلام کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ جس کا خاص وصف القاب کی عریت ہے۔ مگر "صدیقی الاعز" اور اس طرح کے القاب رفتہ رفتہ ترک ہو کر ان کے خط بے القاب بھی ہو گئے ہیں اور "معاف فرمایئے گا" اور "آپ کہاں ہیں" اور "کس رنگ میں ہیں" سے ہی خط کا آغاز ہو جاتا ہے۔ انھوں غالب کے سے انداز بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ ان کا بچاری رنگ نہیں ان کے خط مخصوص ذوق کے ترجمان تو ہیں مگر تفصیلات میں مکتوب الیہ کی شخصیت نگاری کے لیے اچھا مواد چھوڑ جاتے ہیں۔"۹۱

اقبال کے مکاتیب کا بیشتر موضوع علمی ہے اور نیاز فتح پوری کے مکاتیب بھی علمی و ادبی موضوعات سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ اقبال کے بعض خطوط ضرورت کے

تحت لکھے گئے بعض خطوط محض اخلاقی تقاضے کی تکمیل کے لیے اور بعض فرض کی ادائیگی کے ذیل آئے ہیں لیکن نیاز فتح پوری کے خطوط صرف جواب نہیں بلکہ خطوط بھی ہیں۔ غالب کے خطوط کی طرح ان کے خطوط ہوں یا نہ ہوں لیکن خطوط دل سے لکھے ہیں فرض اور اخلاق کی تکمیل کے خیال سے نہیں۔ ان کے خطوط کی نوعیت سرتاسر وہی ہے جو ایک شاعر کے کلام کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے خطوط میں ان کی شخصیت و سیرت کی بہت ساری جہتیں کھل جاتی ہیں۔

نیاز فتح پوری کے خطوط انشا پردازی اور شاعرانہ نثر طرازی کے نمونے ہیں اور ان میں اسلوب بیان کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ مطالعہ خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مکتوب نگاری کے جدید اصولوں سے پوری طرح واقف تھے اور رسمی باتوں کو مکتوب نگاری کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ بہر حال خطوط کسی کو بھیجے گئے ہوں یا نہ بھیجے گئے ہوں ایک بات مسلّم ہے وہ یہ کہ خطوط اپنی شوخی، ندرت بیان، لطف زبان اور ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے بالکل منفرد ہیں۔ بقول سید شاہ رشید الرحمن ارشد:

> "نقاد کے "مکاتیب نیاز" کی شخصی حیثیت کو Under Value کرتے ہیں۔ حالی کے خطوط حالی کی پاکیزہ سرشت کے عکاس ہیں۔ وحشت کے مکاتیب ان کی خاکساری و انکساری کے نمائندہ ہیں۔ شبلی کے نامہ ہائے شوق اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ انسان تھے اور ان کے پہلو میں دل اور دل میں جذب و شوق بلکہ ہوا و ہوس کی لہر تھی۔ غالب کے خطوط ایک دور کی تاریخ اور خود غالب کی زندگی کے فوٹو ہیں۔ اقبال کے مکاتیب محض علمی دستاویز ہیں لیکن نیاز کے مکاتیب میں یہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع ہیں۔ اور ان کے مطالعے کے بعد ان کی شخصیت کے بہت سارے پہلو اور ان کے عقیدے و نظریے کے تمام گوشے سامنے آ جاتے ہیں۔"۹۲



مولانا ابوالکلام آزاد

عبدالقوی دسنوی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "مولانا آزاد کی شخصیت پر ہمیشہ امام الہند کا پردہ پڑا رہا ہے۔ وہ جلوت میں کچھ اور ہوتے تھے خلوت میں کچھ اور۔ اس لیے ان کی شخصیت کو سمجھنا آسان نہیں رہا۔ وہ عام طور سے ایک خاص سطح سے بولنا پسند کرتے تھے۔ جہاں ان کی شخصیت ڈھکی چھپی ہوتی تھی۔ یا ان کی شخصیت کا رعب ایسا پڑتا تھا کہ محی الدین ابوالکلام دہلوی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ان کے خطوط ان کو جاننے پہچاننے میں بڑی مدد کرتے ہیں۔" ۹۳

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط مختلف علوم کا قیمتی ذخیرہ ہیں۔ ان کے خطوط سے اردو مکتوب نگاری میں نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں کی وفات کے تقریباً نصف صدی بعد ان کے دور کی منطقی اور افادی نثر کے خلاف ردعمل کو واضح طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کے خطوط میں مقصد اور طرز بیان دونوں کو اہمیت حاصل ہے۔ شاعرانہ انداز اور عالمانہ لب ولہجہ نے نثر کو شاعری کے رجحانات سے قریب تر کر دیا ہے۔ انھوں نے خطوط میں کثرت سے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ بقول محمد اجمل خاں:

> "قلعہ احمد نگر کے اکثر مکاتیب اسی طرز تحریر میں لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ اور جس مطلب کو ادا کیا ہے اس طرح لکھا ہے کہ جدت فکر نقش آرائی کر رہی ہے اور وسعت تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔" ۹۴

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ مجموعوں کے علاوہ مختلف رسائل اور نمبروں میں ابوالکلام آزاد کے خطوط بکھرے پڑے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے دستیاب مجموعے حسب ذیل ہیں:

غبارِ خاطر

یہ مجموعہ پہلی مرتبہ مئی ۱۹۴۶ء میں چھپا۔ محمد اجمل خاں اس کے مرتب ہیں اور اس کے شروع میں ان کا تحریر کردہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ تین مہینے بعد یہ کتاب دوسری مرتبہ اسی سال اگست میں شائع ہوئی۔ ان دونوں اشاعتوں کے ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی تھے۔ تیسری مرتبہ ۱۹۴۷ء میں آزاد ہند پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور نے اسے شائع کیا۔ اس مرتبہ اس میں ایک خط زائد تھا جو پہلی دو اشاعتوں میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ یہ خط موسیقی سے متعلق ہے۔ یہ مکتوبات قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران ۹ راگست ۱۹۴۲ء تا جون ۱۹۴۵ء کے زمانے میں تحریر ہوئے ہیں۔

کاروانِ خیال

اس مجموعہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے سترہ خطوط نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام ہیں۔ اس کے علاوہ نواب صاحب کے دس خطوط مولانا آزاد کے نام بھی موجود ہیں۔ یہ خطوط ۲ر ستمبر ۱۹۳۰ء سے ۱۲ر نومبر ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصے پر محیط ہیں۔ اس مجموعے کو محمد عبدالشاہد خاں شیروانی نے ۱۹۳۹ء میں بجنور سے شائع کیا۔

مکاتیبِ آزاد

دو سو صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۹۳۸ء میں 'ادبستان' لاہور سے شائع ہوا۔ ان خطوط کے مکتوب الیہم سید سلیمان ندوی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ثناء اللہ، مولانا محی الدین، احمد غلام رسول مہر، سید سلیمان ندوی اور دوسرے افراد ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصہ کو محیط ہیں۔

نقشِ آزاد

اس مجموعے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک سو چھیانوے خطوط شامل ہیں اور یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ایک سوانحی خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۱۳ء سے ۲۱ مئی ۱۹۵۷ء کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے۔ دوسرے حصے میں آزاد کی دیگر تحریرات شامل ہیں۔ مجموعہ کا تیسرا حصہ سولہ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط مختلف مکتوب الیہم کے نام ہیں۔ مجموعے کے مرتب غلام رسول مہر ہیں۔ تیسرے حصے کے خطوط زمانی اعتبار سے ۱۹۱۰ء تا ۱۹۳۳ء تک کے عرصہ پر محیط ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۸ء میں مطبع علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوا۔

میرا عقیدہ

یہ مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی سے فروری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ قاضی سید احمد حسین کا تحریر کردہ ہے۔ ان خطوط کے مکتوب الیہم مولانا غلام رسول مہر، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور حکیم سعد اللہ وغیرہ ہیں۔

تبرکاتِ آزاد

یہ مجموعہ چار مجموعہ ہائے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ مرتب غلام رسول مہر ہیں۔ اس مجموعے میں کل ستانوے مکاتیب اور آٹھ مقالات ہیں۔ پہلا مجموعہ مکاتیب مولوی محی الدین احمد قصوری اور ان کے والد کے نام ہیں۔ دوسرے مجموعہ میں اٹھارہ خطوط عبدالماجد دریابادی کے نام ہیں۔ تیسرے مجموعے میں اڑتیس خطوط سید سلیمان ندوی کے نام اور چوتھے حصے "میرا عقیدہ" میں شائع شدہ متفرق خطوط ہیں۔ مکتوب الیہم کی تعداد گیارہ ہے۔

ملفوظاتِ آزاد

یہ مجموعہ مولانا اجمل خاں نے ۱۹۵۹ء میں دہلی سے شائع کیا۔ اس مجموعہ میں مولانا آزاد

کے جوابات ہیں جو مولانا اجمل خاں نے اپنے قلم سے تحریر کیے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ادبی خطوط

اس مجموعہ میں مولانا آزاد کے وہ جوابات ہیں جو انھوں نے زبانی طور پر دیے ہیں۔ ان میں ادبی سوالات کرنے والی ہستیوں کے مکتوبات بھی موجود ہیں۔ اس کے مرتب مولانا اجمل خاں ہیں اور دہلی سے اکتوبر ۱۹۶۲ء کو زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔

مکاتیب ابوالکلام آزاد

یہ مجموعہ چار سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابوسلمان شاہجہانپوری نے مرتب کر کے فروری ۱۹۶۸ء میں کراچی سے شائع کیا۔

ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت ان کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ خطوط ہیں جو قطعی ذاتی اور نجی نوعیت کے ہیں۔ دوم وہ مکتوبات جہاں خود مکتوب الیہم کی ہستی کے برعکس اپنی ذات توجہ کا مرکز ہے۔ یہ مکتوبات اپنے اسلوبِ تحریر اور اندازِ نگارش کے اعتبار سے انشائیات یا علمی مضامین کے زمرے میں آتے ہیں۔

نجی اور ذاتی غرض سے لکھی گئی تحریریں اپنے دامن میں فلسفیانہ، سیاسی، تاریخی اور علمی مسائل ومباحث سمیٹے ہوئے ہیں۔ اور بے تکلفی اور اپنائیت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ ان خطوط سے انجمنوں، تحریکوں کے اصول ونظریات سے مصنف کی وابستگی اور کسی حد تک مخاطب سے نسبت کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ خطوط مختلف لوگوں کے نام ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ یہ خطوط ان کی عمر کے طویل حصے کا احاطہ کرتے ہیں۔ "غبارِ خاطر" میں وہ خط بھی شامل ہے جو انھوں نے مولانا عبدالرزاق کانپوری کو بارہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ اور وہ خطوط بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری زمانے میں لکھے تھے۔

نواب سید محمد علی حسن کے نام خط کے مطالعے سے ان کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مالک رام کے نام لکھے کاروباری خطوط بھی شامل ہیں۔ مولانا عبدالرزاق کے نام لکھے خطوط میں

اچھے خط کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ان میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ دونوں کے درمیان پوچھنے بتانے کا ماحول، کہنے سننے کی فضا اور اچھی خواہشات کا اظہار ہے۔ زبان عالمانہ ہے لیکن خشک نہیں ہے۔ پھر شعر اور مصرعہ کے برمحل استعمال نے بات میں بات پیدا کر دی ہے مثلاً:

> ''حضرت مجمع الفضائل مولانا صاحب مدظلہ۔ السلام علیکم مزاج شریف، والا نامہ وارد ہوا، شرف افتخار ہمراہ لایا۔ خادم آپ کی اس عنایت بے غایت کا حد درجہ مشکور و ممنون ہوا کہ اس نالائق پر نظر شفقتانہ فرمائی اور جواب عریضہ سے افتخار اور عزت افزائی بخشی:
>
> یہ لطف آپ کی عنایت ہے ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا'' ۹۵

سید سلیمان ندوی کے نام لکھے خطوط سے مولانا ابوالکلام آزاد کے دار المصنفین سے تعلقات کا علم ہوتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''دار المصنفین کا پراسپکٹس پہنچا۔ آپ مجھے اس سلسلے میں جو بنانا چاہیں مجھے منظور ہے۔ آزریری فیلو تو ایک محض بات ہے۔ اگر اس میں کوئی جگہ کلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں گا۔'' ۹۶

یہ خط مختصر اور نہایت سلیس زبان میں ہے۔ ورنہ ''مکاتیب ابوالکلام'' میں شامل تمام خطوط جو سید سلیمان ندوی کے نام ہیں۔ ان میں عربی اشعار اور قرآن کی آیتیں بے ساختہ تحریروں میں آ گئی ہیں۔ اور سارے خطوط عالمانہ ہیں۔

''غبار خاطر'' میں شامل خطوط ابوالکلام آزاد نے اپنے عزیز دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام اس وقت لکھے جب وہ اگست ۱۹۴۲ء سے لے کر جون ۱۹۴۵ء تک قید و بند کی زندگی جھیل رہے تھے۔ ابتدا میں احمد نگر کے قلعہ میں قید رہے بعد میں بانکوڑہ جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ اس دوران قید خانے سے جو پہلا خط اپنے دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھا وہ ۱۰ راگست ۱۹۴۲ء کا ہے اور آخری خط ۱۹ ستمبر ۱۹۴۳ء کا ہے۔ اور یہی آخری خط سب سے طویل ہے۔ کسی دوسرے مجموعے میں اتنے طویل خطوط نہیں ملتے جتنے غبار خاطر میں شامل ہیں۔

مولانا آزاد نے یہ خطوط اس لیے لکھے کہ رہائی کے بعد قید فرنگ کا ایک عظیم تحفہ دنیائے ادب کو پیش کر سکیں۔ اس مجموعے کے خطوط کے مطالعے سے نہ صرف مولانا آزاد کی جیل کی زندگی سے پردہ اٹھتا ہے بلکہ ہمیں یہ علم بھی ہوتا ہے کہ فرنگی حکمراں کس قدر احتیاط ہوش گوش اور رازداری سے کام کرتے تھے اور کس حد تک مستعد اور چاق و چوبند رہتے تھے۔ اس قسم کی معلومات فراہم کرنے کے لیے مجموعہ 'غبار خاطر' بہت اہم ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ہمیں یہاں رکھنے کے لیے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنی ۸ راگست کو سنٹرل جیل سے ایک سینئر جیلر یہاں بھیج دیا گیا۔'' ۹۷

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''اس مرتبہ سب سے زیادہ اہتمام اس بات کا کیا گیا ہے کہ زندانیوں کا کوئی تعلق باہری دنیا سے نہ رہے۔ حتیٰ کہ باہری پرچھائیاں بھی یہاں نہ پڑیں۔ غالباً اور اجل قیام بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔'' ۹۸

'غبار خاطر' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیل کے نئے نئے واقعات اور تجربات پر گہری نظر ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ انھیں نہایت دلچسپ انداز سے قلم بند کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ کہیں کہیں طنز و مزاح کی آمیزش سے تحریروں میں نیا لطف پیدا کر دیا ہے۔ 'غبار خاطر' کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جنگ آزادی کے سلسلے کے اہم واقعات کو محفوظ کر لیا ہے۔

قلعہ احمد نگر میں ان کے گیارہ رفیق بھی تھے لیکن خطوط میں انھوں نے صرف جواہر لال نہرو، سید محمود، آصف علی کا ذکر کیا ہے۔ باقی حضرات کے بارے میں بالکل خاموش رہے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ جن لوگوں کا ذکر نہایت شدت سے کیا ہے، وہ ان کی اہلیہ زلیخا بیگم ہیں۔ اہلیہ کے تذکرے میں انسانی جذبات کی شدت اور صداقت کا اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک اچھے شوہر اور وفا شعار بیوی کے احساسات، جذبات اور تاثرات کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ ان خطوط سے ایک منفرد انشا پرداز کی ازدواجی زندگی سے آگاہی ہوتی ہے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کے ایک خط میں اپنی

اہلیہ کی علالت اور انتقال کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا۔ تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزارا۔" ۹۹

۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو طویل علالت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ لیکن حکومت سے اپنی رہائی کی کوئی درخواست نہ کی۔ اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔" ۱۰۰

خطوط کے مطالعے سے ان کے مزاج، دلی کیفیات، تجربات، خیالات، عادتیں، خواہشیں، آرزوئیں، پسند ناپسند، دلچسپیاں، خوشیاں، ناراضگیاں اور ان کی مصروفیات وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں سحر خیزی کا اظہار بہت ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ سحر خیزی کے علاوہ چائے نوشی اور اس سے قلبی لگاؤ کا ذکر بھی کیا ہے۔ چائے کے پینے کا اہتمام، اس کا رنگ اور لذت، اس کے پتوں کی کیفیت اور اس کی تاریخ پر جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ معلومات افزا بھی ہے۔ ایک خط سے مثال ملاحظہ کیجیے:

"آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جام صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔" ۱۰۱

"سحر خیزی کا وقت ہے چائے کا دور چل رہا ہے اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ رمضان میں یہی میرے لیے جام صبوحی کا کام دیتا ہے اور سحر میں افطار کا بھی۔" ۱۰۲

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطوط میں مختلف موسموں، مختلف پھولوں کے رنگ و روپ کا

ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو کچھ وقت کے لیے رنگا رنگ اور خوشبودار پھولوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی معلومات، تجربات اور مشاہدات کس قدر وسیع اور متنوع ہیں۔ پھولوں کے علاوہ پرندوں کا ذکر کرتے وقت ان کی حرکات و سکنات ان کے مزاج اور عادتوں پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور قلم سے ایسی تصویریں اتارتے ہیں کہ نگاہوں کے سامنے پرندے اڑتے، چہکتے، پھدکتے اور اٹھکھیلیاں کرتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

احمد نگر کی جیل میں بیٹھ کر انگریزی الفاظ اور ان کے ترجمے کا اپنے خطوط میں استعمال کرنا مولانا ابوالکلام آزاد کی ذہانت اور یادداشت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ عربی، فارسی، اردو، انگریزی کے بہت سے اشعار اور مصرعوں کا اکثر برجستہ برمحل اور بامعنی استعمال کیا ہے۔ 'غبار خاطر' میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تقریباً اردو کے دو درجن شعرا کے تقریباً ایک سو دس اشعار اور مصرعے استعمال کیے ہیں۔ جن میں مرزا غالب کے اشعار سب سے زیادہ ہیں۔

وہ ہستی جو عالم، فاضل، مقرر اور فلسفی کی شکل میں اپنی تحریروں میں عظمت اور بلندی سے مخاطب ہوتی ہے جب ذاتی خط و کتابت میں اپنا مرقع پیش کرتی ہے تو ہمراز مکتوب الیہ سے اپنی باتیں من و عن بیان کر دیتی ہے کیونکہ یہاں اسے اشاعت کا کھٹکا نہیں رہتا۔ عہد طفولیت سے لے کر ایام اسیری کے لمحات زندگی کو ان کے خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا۔ اس لیے خلقت کا جو ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب اسی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔" ۱۰۳

اردو صحافت نگاری کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مرتبہ بلند ہے۔ ان کے جاری کردہ رسائل و جرائد کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ خطوط کے مطالعے سے رسائل جرائد کی ابتدا اور انتہا کا پتہ چلتا ہے۔ کچھ ایسے جرائد بھی ہیں

جن کا خاکہ ابوالکلام آزاد کے ذہن میں موجود تھا، مگر اسے تکمیل کے مراحل سے نہ گزار سکے۔ 'الہلال' اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور معیاری اخبار تھا۔ خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریس سے متعلق ان کے خیالات کیا تھا۔ وہ ذاتی پریس کے بھی خواہاں تھے لیکن ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ سے بہت سے منصوبوں کو تکمیل کی منزل تک نہ پہنچا سکے۔ 'الہلال' کی ادارت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''الہلال کے لیے قطعی ہے کہ ذاتی پریس ہو کم سے کم ایک لیتھو اور ایک ٹائپ کی مشین اور کافی لوازم۔''[۴]

'غبار خاطر'' اور'' کاروان خیال'' دراصل وہ ادبی تحریریں ہیں جن کو خطوط کے فارم میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ ضرورت اور مقصد کے تحت لکھے جانے والے مکتوبات نہیں ہیں۔ لہٰذا ان میں شاعرانہ، ادیبانہ اور علمی مباحث، فارسی و عربی، جملوں وتراکیب کی شان وشکوہ اور فراوانی انھیں انشائیہ اور مضامین کی صف میں لے آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب سے متعلق محمد اجمل خاں لکھتے ہیں:

> ''مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے علم وذوق کے تنوع کی طرح اپنے اسلوب تحریر بھی مختلف قسموں کا رکھا ہے۔ عام دینی اور مختلف مطالب کو وہ ایک خاص طرح کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ صحافت نگاری کے لیے انھوں نے ایک دوسرا اسلوب اختیار کیا ہے، اور خالص ادبی انشا پردازی کے لیے ان دونوں سے الگ طریق نگارش ہے۔''[۵]

''خطوط ابوالکلام آزاد'' مرتبہ مالک رام کے مطالعے سے مولانا آزاد کی وسعت مطالعہ اور اس پر مبنی مسائل سے متعلق آزادانہ رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں جو خطوط غلام رسول مہر کو لکھے ہیں وہ علمی اور ادبی اہمیت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ یہ خطوط مختصر اور طویل دونوں طرح کے ہیں۔ کسی خط میں مصرعوں سے متعلق بحث درج ہے تو کسی خط میں مشہور شخص کے مقولے کی دلنشیں انداز میں شعر کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے۔ کچھ خطوط میں سن ہجری سے متعلق مواد فراہم کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ مجموعہ خطوط سوانحی وتاریخی کے علاوہ ادبی اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔

مجموعہ 'غبار خاطر' کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں:

> ''یہ حقیقت ہے کہ غبار خاطر' مولانا آزاد کے خطوط کا نہ صرف خوبصورت مجموعہ ہے بلکہ اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے جس کے مطالعے سے ہندوستان کے ایک فرزند جلیل، جنگ آزادی کے بہت بڑے مجاہد اور اردو ادب کے منفرد نثر نگار کی زندگی، شخصیت، ماحول، فن اور فکر سے سب سے زیادہ آگاہی ہوتی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر مولانا آزاد اردو ادب کو غبار خاطر' کے علاوہ کچھ بھی نہ دیتے تو بھی اردو ادب میں ان کو نمایاں مقام ملتا۔''[۶]



حواشی

۱۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، مترجم مرزا محمد عسکری، ص ۳۲۰
۲-۳۔ مکاتیب امیر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب، ص ۱۳۹، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، جون ۱۹۹۲ء
۴۔ ایضاً، ص ۱۰-۹
۵۔ ایضاً، ص ۱۲
۶۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص ۳۴۵
۷۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص ۳۱۹
۸۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۳۶
۹۔ ایضاً، ص ۱۷۹
۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۹
۱۱۔ ایضاً، ص ۳۱۵
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۰
۱۶۔ مطالعۂ داغ، سید محمد علی زیدی، ص ۲۲۹، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۳ء
۱۷۔ انشائے داغ، مرتب احسن مارہروی، ص ۵۰، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۱ء
۱۸۔ داغ دہلوی: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر کامل قریشی، ص ۱۵۰، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۶ء
۱۹۔ انشائے داغ، ص ۱۰
۲۰۔ اردو ادب سہ ماہی، ماہ دسمبر ۱۹۵۶ء، ص ۵
۲۱۔ زبانِ داغ، ص ۱۳۸
۲۲۔ انشائے داغ، ص ۶۷-۶۶
۲۳۔ زبانِ داغ، ص ۹۱
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱۴
۲۵۔ اردو ادب سہ ماہی، ستمبر، ص ۶، ۱۹۵۶ء
۲۶۔ زبانِ داغ، ص ۲۱۱
۲۷۔ انشائے داغ، ص ۹
۲۸۔ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، خطوط اکبر، ص ۵، ۱۹۵۰ء
۲۹۔ ایضاً، ص ۵
۳۰۔ ایضاً، ص ۷
۳۱۔ ایضاً، ص ۷
۳۲۔ ایضاً، ص ۸
۳۳۔ از الہ آباد، ۶ راگست ۱۹۲۰ء
۳۴۔ از الہ آباد، ۱۱ رجون ۱۹۱۸ء
۳۵۔ از الہ آباد، مارچ ۱۹۰۵ء
۳۶۔ خط بنام عبدالماجد دریابادی
۳۷۔ از الہ آباد، ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۱ء، بنام عزیز لکھنوی

۳۸۔ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ص ۱۰
۳۹۔ از الہ آباد، یکم فروری ۱۹۲۰ء
۴۰۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ
۴۱۔ مکاتیب مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، ص ۲، اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء
۴۲۔ ایضاً، ص ۲۳۵
۴۳۔ ایضاً، ص ۱۸۵
۴۴۔ آل احمد سرور، ماہنامہ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۰ء
۴۵۔ مکاتیب مہدی، ص ۱۰
۴۶۔ ایضاً، ص ۱۵۶
۴۷۔ ایضاً، ص ۲۴۷
۴۸۔ خط بنام شیخ محمد، نومبر ۱۹۰۹ء
۴۹۔ مکاتیب مہدی، ص ۱۰۳
۵۰۔ ایضاً، ص ۳۱
۵۱۔ ایضاً، ص ۵
۵۲۔ افادات مہدی، ص ۸۸
۵۳۔ خط بنام مظفر، از گورکھپور، ۱۳ رنومبر ۱۹۰۱ء
۵۴۔ رسالہ نقوش، مکاتیب نمبر، ص ۳۲، لاہور، ۱۹۵۴ء
۵۵۔ مکاتیب مہدی الافادی، ص ۵۵
۵۶۔ ایضاً، ص ۴۷
۵۷۔ مہدی الافادی، فیروز احمد، ص ۲۳۳
۵۸۔ صحیفۂ محبت، ص ۳۰-۳۱
۵۹۔ مکاتیب مہدی، ص ۱۱-۱۰
۶۰۔ پریم چند، قمر رئیس، ص ۱۷، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۶۱۔ پریم چند کے خطوط، مرتبہ مدن گوپال، ص ۳۲، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جون ۱۹۶۸ء
۶۲۔ ایضاً، ایضاً، ص ۳۶۵، ایضاً
۶۳۔ ایضاً، ایضاً، ص ۸۲، ایضاً
۶۴۔ ایضاً، ایضاً، ص ۱۲۰، ایضاً
۶۵۔ ایضاً، ایضاً، ص ۲۸۳، ایضاً
۶۶۔ ایضاً، ایضاً، ص ۲۰۲، ایضاً
۶۷۔ بحوالہ پریم چند فن اور تعمیر فن، جعفر رضا، ص ۱۲۳، تاج آفسیٹ پریس، الہ آباد
۶۸۔ خط بنام دیا نرائن نگم، ۱۳ رمئی ۱۹۱۰ء
۶۹۔ ایضاً، پریم چند کی یادیں، ''زمانہ'' پریم چند نمبر، ۱۹۳۷ء
۷۰۔ پریم چند کے خطوط، ص ۳۰۸-۳۰۷
۷۱۔ ایضاً، ایضاً
۷۲۔ قلم کا مزدور پریم چند، مدن گوپال، ص ۳۰۷، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، مئی ۱۹۶۶ء
۷۳۔ پریم چند کے خطوط، ص ۳۵۳
۷۴۔ ایضاً، ص ۳۰۹
۷۵۔ پریم چند کے خطوط، خط بنام حسام الدین غوری، ص ۳۲۸
۷۶۔ ایضاً، خط بنام نگم، ۲۳ رجولائی ۱۹۲۳ء
۷۷۔ ایضاً، خط بنام نگم، ۲ راگست ۱۹۲۳ء
۷۸۔ ایضاً، خط بنام نگم، ۲ رمارچ ۱۹۱۳ء
۷۹۔ انشاء، نیاز فتح پوری نمبر، ۱۹۹۶ء، ص ۵
۸۰۔ سالنامہ ''نگار''، نیاز نمبر، ص ۵۸، ۱۹۶۳ء
۸۱۔ عبداللطیف اعظمی، رسالہ جامعہ، ص ۳۳۲، ۱۹۶۸ء
۸۲۔ مکتوبات نیاز، ص ۳
۸۳۔ مکتوبات نیاز، ص ۱۶

۸۴۔ مکتوبات نیاز، ص ۲۱
۸۵۔ مکتوبات نیاز، ص ۴۷
۸۶۔ سالنامہ ''نگار'' پاکستان نیاز نمبر، ۱۹۶۳ء
۸۷۔ مکتوبات نیاز، ص ۵۲-۵۱
۸۸۔ مکتوبات نیاز، ص ۱۱۴-۱۱۳
۸۹۔ تنقید و تلخیص، سید شاہ رشید الرحمٰن ارشد، ص ۱۲۱، عظیم الشان بک ڈپو، پٹنہ، اگست ۱۹۷۰ء
۹۰۔ ایضاً، ص ۱۹۰
۹۱۔ وجہی سے عبدالحق تک، ص ۳۰۶
۹۲۔ انشائے نیاز فتح پوری نمبر، ص ۲۷۴، دسمبر ۱۹۹۶ء
۹۳۔ مطالعہ غبار خاطر، عبدالقوی دسنوی، ص ۳۳، نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی، ستمبر ۱۹۸۱ء
۹۴۔ غبار خاطر، مرتب محمد اجمل خاں، تیسرا ایڈیشن، ص ۱۷، لاہور
۹۵۔ نقوش خطوط نمبر، حصہ اول، ص ۳۹۴
۹۶۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد، ص ۴۷
۹۷۔ غبار خاطر، مرتب مولانا اجمل خاں، تیسرا ایڈیشن، ص ۴۳، ستمبر ۱۹۸۱ء
۹۸۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۷۹-۸۷
۹۹۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۲۵۶
۱۰۰۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۲۹۳
۱۰۱۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۹۲-۹۳
۱۰۲۔ خط بنام حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، ۲۸ رجنوری ۱۹۳۲ء
۱۰۳۔ غبار خاطر، ص ۱۰۶-۱۰۵
۱۰۴۔ خط بنام سید سلیمان ندوی، ص ۴۹، مکاتیب آزاد، اردو بستان لاہور، ۱۹۴۸ء
۱۰۵۔ غبار خاطر، ص ۱۵
۱۰۶۔ مطالعہ غبار خاطر، ص ۱۶۳

■◆■

باب پنجم

اُردو مکتوب نگاری کی تاریخی اور ادبی معنویت

- سیاسی، سماجی و معاشرتی صورتِ حال
- ادبی مباحث و اصلاحات

سیاسی، سماجی و معاشرتی صورتِ حال

خط کی اہمیت اور افادیت کے کئی روشن پہلو ہیں۔ معلومات کے اعتبار سے ان میں ایسے ایسے نکات سامنے آتے ہیں جو تاریخ کی بڑی بڑی کتابوں میں بھی نہیں ملتے۔ خطا نجی حالات کے ساتھ ساتھ معاشرتی رویوں اور تہذیبی آثار و کوائف کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں۔ ان میں اپنے زمانے اور ماحول کی تصویریں جگہ جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے خطوط تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں۔ خطوں کے ذریعے کسی بھی عہد کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ ان میں تاریخی واقعات کی من وعن نشان دہی ہوتی ہے۔ کون سا واقعہ یا سانحہ کب وقوع پذیر ہوا خطوط میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہوتا ہے اور اس کی تاریخ درج ہوتی ہے۔ تاریخ کی ضخیم کتابیں کسی زمانے کی وہ عکاسی نہیں کر سکتیں جو خطوط کا مختصر مجموعہ کر سکتا ہے اس لیے کہ تاریخ بزعم حقیقت سہی لیکن مورخ کے ذہنی تحفظات اور قیاسات و نظریات سے یکسر خالی ہوتی۔ خط میں جب کسی واقعے کا ذکر ہو یا اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو تو اس کی تاریخی حیثیت و اہمیت مسلم ہو جاتی ہے۔ بقول خلیق انجم:

> "تاریخی واقعات معلوم کرنے کے ماخذ اور بھی ہیں لیکن یہ جاننے کے لیے کہ ان لوگوں کا ردِ عمل کیا تھا جو ان واقعات کے ذمہ دار تھے اور وہ لوگ کیا سوچ رہے تھے جن پر ان واقعات کا اثر ہوا تھا، ہمیں ذاتی خطوط، روزنامچوں اور آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ایک حساس ذہن پر کیا اثر ہوا، دلّی کی تباہی و بربادی نے ایک شاعر کے قلب و ذہن کو کس طرح متاثر کیا۔ اگر یہ معلوم کرنا ہے تو کوئی تاریخی کتاب آپ کا ساتھ نہیں دے گی۔ البتہ میر تقی میر کی "ذکرِ میر" میں یہ تاثرات جگہ جگہ بکھرے ہوئے

ہیں گے۔ میرزا مظہر اور شاہ ولی اللہ کے خطوط میں بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں کی بالتفصیل داستانیں تو نہیں ملیں گی لیکن ان کے پیدا کیے ہوئے حالات پر اس عہد کے ذہین انسان کے تاثرات ضرور ملیں گے۔"[1]

فن تاریخ نویسی کے نقطۂ نظر سے خطوط کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کوئی مورخ اس عہد میں لکھے گئے خطوط کو نظر انداز نہیں کر سکتا جس عہد کی وہ سیاسی اور سماجی تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہے۔ اورنگ زیب کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد کا دور سیاسی اعتبار سے ہندوستانی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے سترویں صدی کے آخری برسوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی منصوبوں اور علاقائی فتوحات پر خود لگام لگائی تھی۔ اٹھارہویں صدی کی پانچویں دہائی میں مغل اقتدار کی زوال آمادہ ساکھ نے اسے ایک بار پھر سر اٹھانے کا موقع دے دیا۔ حصول اقتدار کے لیے انگریزوں نے سازشی اور جنگی پالیسی اپنائی اور سارے ہندوستان کو ۱۸۵۷ء تک فتح کر لیا۔ خطوط کے متعدد مجموعے ایسے ہیں جن کے ذریعے ۱۸۵۷ء کے سانحات کی مکمل تاریخ ترتیب دی جا سکتی ہے۔

رجب علی بیگ سرور کے خطوط سے مصنف اور اس زمانے کے متعلق وافر معلومات فراہم کی جا سکتی۔ ۱۸۵۷ء کے سانحے کے بعد وہاں کے لوگوں پر کیا گزری، لوگ کس طرح زندگی سے عاجز ہو گئے تھے، خود سرور کی کیا حالت تھی۔ ان سب باتوں کا احوال ان کے خطوط میں موجود ہے۔ سرور کے خطوط کے ذریعے ان کے عہد سے متعلق معلومات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیر مسعود نے لکھا ہے:

"سرور کے خطوط سے ان کے عہد سے متعلق کچھ سیاسی اور عام معلومات بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تاریخی اور سیاسی معلومات نسبتاً کم اور غیر اہم ہیں اور زیادہ تر مولوی امیر علی اور مولوی غلام حسین کے واقعات اور انتزاع سلطنت اور ۱۸۵۷ء کے بعض معمولی حالات تک محدود ہے۔"[2]

انتزاع سلطنت سے قبل لکھنؤ میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کئی فسادات ہوئے۔ ان کا ذکر "انشائے سرور" میں موجود ہے۔ ایک صاحب مولوی امیر علی ساکن قصبہ امیٹھی نے اس موقع پر

جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس واقعے کی تفصیل سرور کے خط میں ملتی ہے۔ بابری مسجد کا مسئلہ جو آج بھی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے یہ مسئلہ سرور کے زمانے بھی تھا۔ اس کی طرف اشارہ ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ اگر آج اس واقعے کی تفصیلات جاننا ہوں تو سرور کا خط اس مسئلہ کا قریب تر ماخذ ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اودھ اجودھیا اسی کا نام ہندوؤں کے تیرتھ کا مقام ہے۔ وہاں کا حال تغییر، عالم گیری بڑی مسجد ہے اس کی یہ حقیقت کھلی ہے کہ اس کے صحن میں سیتا کی رسوئی ہے۔ کہیں سنکھ پھنکتا ہے۔ بم بم کی صدا ہے، کہیں تکبیر کی آواز ہے۔ تسبیح کا کھٹکا ہے۔ گنگا مدار کا ساتھ نیا انداز ہے۔ قریب ہنومان گڑھی ہے۔ اسی کے کھودنے کی خاطر مسلمانوں کی بھیڑ پڑی ہے۔ ابھی تک دریاباد میں کہ دو منزل لکھنؤ سے یہ مقام ہے مولوی امیر علی صاحب کا قیام ہے دو ہزار مسلمان کل ان کے ہمراہ ہیں اور ان کو گھیرے ہوئے کئی پلٹنیں سلطان ضرب توپ گرد و پیش لگتا ہے اور بہت سے ملازم بادشاہ میں سرکار سے ممانعت ہے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ ہاتھی گھوڑوں پر چڑھنے نہ پائیں اور مولوی صاحب کا یہ قول ہے کہ خدا کی راہ میں سر تذر کیا مرنا اختیار کیا۔"[3]

نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط سے اس وقت کے سیاسی حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد محلات بے سر و سامان نکل بھاگی تھیں۔ خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطوط ان سانحات کی روداد ہیں جب نواب واجد علی شاہ کو سرزمین لکھنؤ اور شاہی اقتدار سے معزول کر کے کلکتے کے مٹیا برج بھیج دیا گیا تھا۔ نواب واجد علی شاہ کی معزولی اور اودھ کی شاہی سلطنت کا خاتمہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر اس دور اور اس علاقے کی بھی تاریخی کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن جس صورت حال کی آئینہ داری واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط سے ہوتی ہے اور اس کی طرف بہت کم لوگوں نے اشارہ کیا ہے۔ ان خطوط میں بیان کیے جانے والے حقائق پر تبصرہ کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"معرکہ آزادی ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کی مصیبت و پریشانی مصیبت کی تگی اور

قرض کی تکمیل اور مکان کی تبدیلی وغیرہ کے امور کا بیان کیا گیا ہے۔" ؎

واجد علی شاہ کن کن تاریخوں میں موچی کھولی میں رہے اور کس زمانے میں قید نظر بندی سے گزرے۔ سانحات واموات وغیرہ کا ذکر ان کے خطوط میں بالتفصیل ہے۔ بیگمات جوان کے ساتھ کلکتہ گئیں ان کے خطوط سے تاریخی شہادتیں اور سیاسی حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ ایک خط ملاحظہ کیجیے:

"رجب کی پانچویں کو لکھنؤ سے چلے تھے۔ کانپور پہنچ میرا رودے رودے برا حال تھا۔ پرون صاحب کے بنگلے میں ہم لوگ مقیم ہوئے۔ رجب بھر مہینہ وہاں بیتا۔ شعبان کی پہلی کو الہ آباد رخصت ہوئے۔ بنارس سے دخانی جہاز پر سوار ہوئے۔ رمضان کی ۲۲ تاریخ کو ہمارا قافلہ کلکتہ پہنچا۔" ؎

مکتوب نگار کا مخاطب کوئی بھی ہو کسی عہد کا انسان ہو، اگر وہ فن خطاطی میں درک رکھتا ہے تو اس کے خطوط کو کسی بھی عہد میں پڑھا جائے ایسا ہی محسوس ہوگا کہ قاری اس کے عہد میں پہنچ گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود کو مکتوب الیہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سانحہ غدر میں دلی اجڑنے کے واقعات تاریخ کی بہت سی کتابوں میں درج ہیں۔ غالبؔ کے خطوط کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلی ۱۸۵۷ء میں نہیں بلکہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے اجڑ رہی ہے۔ مرزا غالبؔ کے خطوط تاریخی معلومات کا خزانہ ہیں۔ ان کے خطوط سے صرف حقائق پر ہی روشنی نہیں پڑتی بلکہ ان میں مکتوب نگار کا ذہنی اور روحانی کرب بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی اجڑی ہوئی دلی کی داستان، خاندان تیموریہ کی معاشی بدحالی، برطانوی سامراج کے ظلم و ستم کی داستان کو مختصر مگر جامع انداز اور موثر پیرائے میں جس خوبصورتی سے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے پیش کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ذہنی و روحانی کرب میں مبتلا تھے ہندوستانیوں سے اپنی ہمدردی اور برطانوی سامراج کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعے سے کچھ کہہ دیا۔ ایک خط میں مرزا غالب لکھتے ہیں:

"وہ دلی نہیں جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے

شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیر زن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپیہ روز کا پنشن دار، سو روپیہ مہینے کا روزینہ دار بن کر نامراد انہ مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا، بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو، ناظم حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے یک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر، کم و بیش تین لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے جو حکما کا حال کل لکھا ہے۔ وہ بیان واقع ہے۔" ؎

مرزا غالب کے دیگر خطوط میں بھی ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات موجود ہیں۔ خط سے ظاہر ہے کہ کسی مضمون یا مقالہ جیسی صراحت کی گنجائش نہیں مگر جو اشارے موجود ہیں وہ صورت حال کی نزاکت کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے سانحہ غدر سے متعلق یا اس کے اسباب و علل اور متعدد پہلوؤں پر غالب کے بیشتر خطوط دستیاب ہیں اور تفصیل سے "دستنبو" میں محفوظ ہیں۔ لیکن تفتہ کے نام ایک خط میں اس جملے سے کہ "مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں" حالات کی نزاکت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ مرزا غالب کو سب سے زیادہ ان دوستوں کے مرنے کا غم تھا جن میں کچھ انگریز تھے، کچھ ہندوستانی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو ہے

اس کا بیان تو معلوم مگر ان بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جوان رو سیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار۔ اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔" [7]

غالب کے خطوط اس اعتبار سے بھی اہم ہیں کہ انھوں نے برمحل اشعار کا استعمال کیا ہے اور تاریخی پس منظر بھی ہے۔ عبدالرزاق شاکر کے نام خط میں شامل مطلع سے ایک تاریخی واقعہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ مطلع ہے:

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

اس کی تشریح خود غالب نے ایک خط میں اس طرح کی ہے:

"ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے روبرو جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبارِ محض ہو موجب رنج و ملال ہے۔" [8]

اخلاق حسین عارف نے مندرجہ بالا خط کی تاریخی اہمیت یا تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قدیم عرب میں دستور تھا کہ خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر داد خواہی کا اعلان کیا جاتا تھا۔ عہدِ نبوی کے بعد تک اس رسم کا سراغ ملتا ہے۔" [9]

آزادی کے علمبردار ہندوستانی جیالوں کی فہرست بہت طویل ہے، وہیں ان آزادی کے متوالوں کے عزائم کو خاک میں ملانے والے غداروں کی فہرست بھی اچھی خاصی طویل ہے۔ ان میں کچھ تو وہ تھے جنھوں نے براہ راست انگریزوں کی عسکری مدد کی لیکن اس جدوجہد آزادی کی

ناکامی میں اہم کردار ان لوگوں کا ہے جو شاہی دربار اور حریت پسند لوگوں کا اعتماد حاصل کر کے ایک طرف تو مجاہدین کی جنگی مشاورتی کونسل میں شامل رہے۔ دوسری طرف ان کے منصوبوں کی اطلاع انگریز آقاؤں کو دے کر منصوبوں کو ناکام بنانے کے اسباب مہیا کیے۔ ایسے لوگوں میں مرزا الٰہی بخش، رجب علی، گوری شنکر اور جیون لال کے نام سرفہرست ہیں۔ عاشور کاظمی اور سلیم قریشی نے لکھا ہے کہ:

"مولوی رجب علی جنگ شروع ہوتے ہی اپنی چرب زبانی اور عیاری سے بادشاہ کی مشاورتی کونسل کا رکن اور بارود خانے کا داروغہ بننے میں کامیاب ہو گیا۔ بادشاہ پر اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ اس کے ۲۹ جولائی کے خط سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اس نے ہڈسن کو اطلاع دی کہ: میں نے بادشاہ سلامت کو مشورہ دیا تھا کہ ان کو چاہیے کہ خفیہ طور پر شہر کا دروازہ کھلوا کر انگریز فوج کو شہر میں داخل ہونے کا بندوبست کر دیں۔ اس طرح ان کی جان بخشی تو شاید نہ ہو سکے لیکن اس احسان کے بدلے انگریز ان کے ورثا کے ساتھ یقیناً بہتر سلوک کریں گے۔ بادشاہ سلامت تو راضی ہو جاتے مگر حکیم احسن اللہ خاں نے دخل اندازی کر کے معاملہ خراب کر دیا۔" [10]

اپنے منصوبے کے ناکامی کے بعد ۷ اگست کو رجب علی نے بارود خانہ برباد کر دیا۔ انگریزوں نے اس کی غداری کا صلہ جاگیروں اور خطابات کی شکل میں دیا۔ رجب علی کے بیشتر خطوط ہائی کمان کو جاتے تھے جس میں حریت پسندوں کے منصوبے، ان کے سامان حرب اور دیگر تفصیلات ہوتی تھیں۔ ۲۱ جولائی ۱۸۵۷ء کا ایک خط جو جی سی بارنس کمشنر اینڈ سپرنٹنڈنٹ چیف انبالہ کے نام رجب علی نے بھیجا تھا۔ اس میں گوالیار اور بے پور کی فوجوں کی نقل و حرکت کی تفصیلات درج ہیں۔ ۳ اگست ۱۸۵۷ء کو رجب علی نے براہ راست ایک خط کمانڈر ان چیف کو لکھا اور دونوں محاذ کی تفصیلات بہم پہنچائیں۔ خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"کل شام کی جنگ انگریزی مورچوں پر ہندوؤں کے حملے سے شروع ہوئی۔ [11] بیچ میں کچھ دیر کے لیے وقفہ بھی رہا۔ انگریزی فوج اپنے مورچوں میں جمی رہی

اور جب باقی فوج قریب پہنچ گئی تو انھوں نے اس پر توپوں اور بندوقوں سے گولہ باری شروع کردی۔ یہ سلسلہ رات کے نو بجے تک جاری رہا۔''[11]

اس طرح غداروں کے خطوط ایک مورخ کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان خطوط سے ۱۸۵۷ء کے سیاسی پہلوؤں پر مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سرسید احمد خاں کے خطوط بھی تاریخی معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ جب ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو سریندر ناتھ بنرجی (۱۸۴۸ء–۱۹۲۵ء) نے سرسید احمد خاں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی لیکن سرسید احمد خاں نے اس کے متعلق کوئی بیان نہیں دیا بلکہ خاموشی اختیار کی۔ کانگریس کا اول اجلاس بمبئی میں دوسرا اجلاس ۱۸۸۶ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا اور تیسرے اجلاس کا صدر بدرالدین طیب جی کو بنایا گیا۔ ایسے میں سرسید احمد خاں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا اور کانگریس کی مخالفت میں کمربستہ ہوگئے۔ اس اجلاس کے خاتمہ پر بدرالدین طیب جی نے سرسید احمد خاں اور سید امیر علی کو ایک ہی مضمون کے خطوط لکھے جس میں انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں عدم شرکت پر افسوس کا اظہار کیا۔ سرسید احمد خاں بدرالدین طیب جی کے خط کا جواب لکھتے ہیں:

> ''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ''نیشنل کانگریس کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس سے یہ فرض کرلیا جائے کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف ذاتوں اور مسلکوں کے لوگ ایک نیشن ہیں۔ یا ایک (نیشن) بن سکتے ہیں۔ اور ان کے مقاصد اور تمناؤں میں وحدت اور یکسانیت ہے؟ میرے خیال میں یہ بالکل ہی ممکن نہیں اور جب یہ بات ناممکن ٹھہری تو پھر نیشنل کانگریس قسم کی کوئی چیز ہی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس سے تمام لوگوں کو یکساں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔
>
> آپ غلط نام دیے گئے نیشنل کانگریس کے کاموں کو ہندوستان کے حق میں سودمند جانتے ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں اسے نہ صرف اپنے فرقے ہی کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے حق میں بھی مضر خیال کرتا ہوں۔

> میں ہر کانگریس کے خلاف ہوں اس کی شکل و صورت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جو غلط اصولوں پر پورے ہندوستان کو ایک نیشن سمجھتی ہو۔''[12]

سرسید احمد خاں کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سیاسی معتقدات رد و قبول کے مراحل سے ایک ساتھ گزرے ہیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے حق میں نہیں تھے۔ اس لیے ''تمام ہندوستانی اسلامی انجمنوں کے نام ایک خط میں مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کانگریس کے مقاصد کل مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور اس لیے اس میں مسلمانوں کو اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ میری یہ رائے قرار پائی ہے کہ کانگریس مذکور کے مقاصد ملک کے لیے، ملک کے امن کے لیے، ملک کی ترقی کے لیے، گورنمنٹ کے لیے اور خاص مسلمانوں کے لیے ان کی موجودہ حالت میں اور نیز آئندہ کو بھی گو کہ ان کی تعلیم میں کتنی ترقی ہوجائے نہایت درجہ مضر ہے۔''[13]

سیاسی ایجی ٹیشن کی وجہ سے محمڈن نیشنل کانفرنس کے مقاصد سے بھی سرسید احمد خاں کو اختلاف ہے۔ ایک خط میں نیاز محمد خاں وکیل پنجاب کو لکھتے ہیں:

> ''میں محمڈن نیشنل کانفرنس کے خاص مقاصد سے متفق نہیں ہوں۔ میری رائے مسلمانوں کو کسی قسم کا پولیٹیکل ایجی ٹیشن اختیار کرنا مناسب نہیں ہے اور نہ کوئی شخص ہندوستان میں پولیٹیکل ایجی ٹیشن اختیار کرسکتا ہے۔''[14]

سرسید احمد خاں کے غیرسیاسی نظریات بھی دیگر معتقدات کی طرح قابل اعتراض قرار پائے۔ لکھنؤ سے طالب علمی کے زمانے کا لکھا ہوا ایک خط پیش خدمت ہے جو مظہرالحق نے سرسید احمد خاں کے سیاسی عقیدہ کی مخالفت میں لکھا تھا:

> ''تین روز سے اس شہر میں نہایت دھوم دھام ہے۔ محمڈن کانگریس کے اجلاس نہایت دھوم دھام سے ہوئے۔ ہر شہر سے لوگ یہاں جمع ہورہے ہیں۔ علی گڑھ سے سرسید صاحب بہادر شمس العلماء اور پنجاب کے بڑے بڑے مسلمان آئے

ہیں۔ ہمارے پٹنہ سے مولوی احمد حسن صاحب بھی تشریف لائے ہیں۔ منشی
امتیاز علی وکیل نے ان لوگوں کو نہایت دریادلی اور ہمت کے ساتھ چار روز تک
ہر قسم کا کھانا کھلایا۔ اس جلسے میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ سرسید احمد خاں کی
مخالفت پورے طور پر کی گئی۔ انشاء اللہ اب مسلمانوں کی ترقی نہایت عمدہ طور پر
ہوگی۔"[15]

سرسید احمد خاں کے وہ خطوط جو انگریزی حکام کے نام لکھے گئے ہیں، ان خطوط میں حکومت وقت سے مسلمانوں کی وفاداری کی تفصیلات درج ہیں۔ ہوم سیکریٹری ہز ایکسیلنسی وائس رائے و گورنر جنرل ہند شملہ کے نام ایک خط میں ۱۸۵۷ء میں برطانوی حکومت کے ساتھ سردار محمد حیات کی وفاداری کا حوالہ ان الفاظ میں رقم ہے:

سردار محمد حیات خاں بہادر سی ایس آئی یا فصل ڈویژنل جج جالندھر کے ہیں اور
گورنمنٹ ان کی خدمات سے جو انھوں نے ایام غدر ۱۸۵۷ء اور جنگ کابل
میں کی ہیں، بخوبی واقف ہے...ان کے دادا سردار فتح خاں کھیپہ نے ۱۸۴۸ء
میں پنجاب کی دوسری لڑائی میں اور نیز ۱۸۵۷ء میں گورنمنٹ کی نہایت عمدہ
خدمتیں کی ہیں۔"[16]

تاریخی نقطہ نظر سے سرسید کے جملہ مکاتیب توجہ طلب ہیں۔ انگریز حکومت میں زوال آمادہ مسلم معاشرت کا یہ نقیب نہ صرف مسلمانوں کو ان کی گم شدہ عظمت و وقار کی طرف مراجعت پر آمادہ کرتا ہے اور زوال کے اسباب و محرکات تلاش کرتا ہے بلکہ عملاً تعلیم، اصلاح اور دیگر پہلوؤں پر پوری قوت صرف کرتا نظر آتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں نے تعلیمی محاذ پر جن شخصیات کو اپنا ہم خیال بنایا۔ انھیں مختلف محاذ پر لگایا اور ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ یہ رہنمائی تجاویز اور مشورے عموماً خطوط کے توسط سے انجام پاتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے خطوط نہ صرف سرسید کی ذہنی و فکری رویہ کی تفہیم کے زاویہ سے اہم ہیں بلکہ ان میں علی گڑھ تحریک کا تاریخی حوالہ بھی ملتا ہے۔

سرسید احمد خاں کے مکاتیب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں عورتوں کے

لیے پردے کے حامی تھے۔ خط میں تعلیم نسواں سے متعلق بے لاگ تبصرہ بھی ملتا ہے۔ ایک خط میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پس ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو کون منع کرتا ہے کہ خود بلا مداخلت
لڑکیوں کے پڑھانے کا انتظام کریں اور تمام مذہبی اخلاق اپنے اپنے مذہب
کے موافق تعلیم دیں۔"[17]

پردہ سے متعلق سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

بیشک میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتخصیص
ہندوستان میں اس میں میرا ایک اجتہاد نہیں۔ نہ میں نے اس پر کبھی غور کیا۔"[18]

سرسید احمد خاں کا ایک خط 'نکاح میں کفو' کے خاص مسئلہ سے روبرو کراتا ہے۔ نواب عماد الملک کو لڑکی کی شادی پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ نے جو اپنی لڑکی کی شادی کردی اس سے مجھے کمال خوشی ہوئی۔ خدا
مبارک کرے اور اس بات سے زیادہ خوشی ہے کہ لڑکا نیک اور سعادت مند
ہے۔ 'کفو' کی پابندی نہ کرنا اگرچہ باعث افسوس ہے مگر کیا کیجیے جب کہ ہماری
قوم کے لڑکے بالکل نالائق اور نا سعادت مند ہیں۔"[19]

اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں تعلیم نسواں کا فقدان تھا۔ عورتوں کے تعلق سے پیدا شدہ تشویشناک پہلوؤں، سماجی آزادی، انفرادی حقوق ایک سے زائد شادی، بیوہ کی خانہ آبادی، ستی پرتھا، جہیز کی رسم وغیرہ پر اصلاحی جدوجہد کے ضمن میں طبقہ نسواں کی معاشرتی حیثیت اور اس کی شرمناک جہالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ تعلیم نسواں کی ضرورت پر سرسید کے خیالات کی تائید مولانا مظہر الحق کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے۔ جو لندن اور ہندوستانی عورت کے تقابل کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ البتہ اس خط میں سرسید احمد خاں کی سی شدت نہیں۔ لکھتے ہیں:

"چونکہ عورتیں یہاں پڑھی لکھی ہیں۔ اس وجہ سے ان کے بچے بچپن ہی سے
اخلاقی، تمدنی اور مذہبی تعلیم پاتے ہیں۔ کاش کہ ہمارے یہاں کی عورتیں بھی

پڑھی لکھی ہوتیں۔''[۲۰]

مولوی نذیر احمد، حالی اور شبلی تعلیم نسواں کے حامی تھے۔ نذیر احمد کے یہاں عورت کے لیے تعلیم کی ضرورت کی وجہ ان کی خانگی زندگی میں ذاتی کمیوں کا ازالہ ہے تاکہ ذاتی اور انفرادی طور پر وہ سلیقہ مندی اور حسن خلق جیسی خوبیوں سے متصف ہو جائے تاہم عورتوں کے لیے تحصیل علم کی ضرورت اس وقت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب اس کی زندگی میں اولاد کی تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اولاد کی عمدہ تربیت کے لیے عورت کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔ ایک خط میں عورتوں کی تعلیم اور ساتھ ہی رواج پردہ کے سخت حامی نظر آتے ہیں:

''دنیا کے سارے کام جو مرد کر سکتے ہیں عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ مگر خوب سمجھے رہو کہ مجھ کو اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ ہندوستانی عورت کو ان کی حالت کے مناسب تعلیم کرنا نہایت ضروری ہے۔ مگر ساتھ ہی رواج پردہ کی موقوفی کا میں سخت مخالف ہوں۔''[۲۱]

مولوی نذیر احمد کے خطوط کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''مولوی نذیر احمد کے خطوط کو انیسویں صدی کے تاریخی ماحول سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس وقت کے ہندوستان اور عہد وکٹوریہ کے انگلستان میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ جمہوریت دبے پاؤں آ رہی تھی۔ اس کے قدموں کی آواز ان خطوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ پرانی روایات متزلزل ہو رہی تھیں۔ ان کو قائم رکھنے اور جاہی سے بچانے کی آرزو یہاں بھی موجود ہے حالانکہ ان خطوں کا دائرہ وسیع نہیں ہے۔ لیکن مصنف کے ساتھ اس زمانے کو سمجھنے میں ضرور معاون اور مددگار ہیں۔''[۲۲]

نواب وقار الملک اور محسن الملک کے خطوط سے کچھ مدرسۃ العلوم حیدرآباد اور علی گڑھ کے سیاسی سماجی و معاشرتی حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ کیونکہ دونوں نے حیدرآباد میں نوکری کی اس لیے ان کے خطوط سے حیدرآباد کے سماجی و معاشرتی حالات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

سرسید احمد خاں کے انتقال (۱۸۹۸ء) کے بعد محسن الملک ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج کے

سکریٹری منتخب ہوئے۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں سر انتونی میکڈانل کی گورنمنٹ نے جب سرکاری دفاتر میں ناگری حروف جاری کرنے کا فیصلہ کر دیا اور مسلمانوں کی قومیت پر ایک کاری ضرب لگائی تو محسن الملک نے مسلمانوں کے لیڈر کی حیثیت سے علی گڑھ میں ایک جلسہ کیا اور ایک ڈیفنس ایسوسی ایشن بنائی گئی۔ اس کے بعد لکھنؤ میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ لیکن سیاسی معاملات میں کالج کے سکریٹری کی شمولیت کو قابل اعتراض قرار دیا گیا تو محسن الملک نے سکریٹری کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے مضامین لکھے اور بحثیں کیں۔ اس طرح قوم میں سیاسی تحریک کا آغاز ہوا اور تعلیم یافتہ مسلمان اس سوال پر غور کرنے لگا۔ محسن الملک دوسرے لیڈران کے ساتھ مشورہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری امید علاحدہ مسلم تنظیم کے قیام سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔ ہم ایک قوم کے درمیان ایک قوم ہیں اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو الگ سے سیاسی منظوری ملنی چاہیے۔ محسن الملک نے اسی سلسلے میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل ڈبلیو اے جے آرچبولڈ (W.A.J.Archbold) کو ایک خط لکھا وہ اس وقت شملہ میں گرمیوں کی چھٹی گزار رہے تھے۔ ۱۴ر اگست ۱۹۰۶ء کے اس خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے کئی خطوط ملے ہیں جو میری توجہ کو خصوصی طور پر لیجسلیٹو کونسلوں میں منتخب نمائندوں کی نئی تجویز کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ قاعدے کے تحت مسلمانوں کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے اور کوئی بھی مسلمان کونسلوں میں الیکشن کے ذریعہ داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر نئے قاعدے کے مطابق... زیادہ وسیع پیمانے پر الیکشن کرائے گئے تو مسلمانوں کو بڑی مشکل سے ایک جگہ ملے گی اور کوئی بھی مسلمان الیکشن کے ذریعے کونسلوں میں داخل نہیں ہو سکے گا۔''[۲۳]

محسن الملک نے آرچبولڈ کے ذریعہ وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے مسلمانوں کے وفد کے ملاقات کی اجازت لے لی اور یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو دن کے گیارہ بجے پینتیس منتخب معزز مسلمانوں کا ایک وفد آغا خاں کی قیادت میں لارڈ منٹو سے ملا۔ حکومت نے شملہ ڈیپوٹیشن میں شامل ممبران کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا نمائندہ قرار دیا۔ بہر حال اس بات کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں کی

ابتری کی بنیادی وجہ سیاست میں ان کی عدم شرکت تھی۔ اس شملہ ڈیپوٹیشن سے متعلق کئی خطوط محسن الملک نے وقار الملک کے نام لکھے ہیں:

''میں نے خاص خاص لوگوں کو معاملہ متعلق کی نسبت لکھا اور سب سے زیادہ ضروری تحریر آرچبولڈ صاحب کو لکھی کہ وہ وائسرائے کا منشا دریافت کریں کہ مسلمانوں کا میموریل اگر ڈیپوٹیشن لے کر آوے تو وہ اسے قبول کریں گے۔ چنانچہ یہ امر طے ہو گیا ہے جیسا کہ آپ کو آرچبولڈ صاحب کی چٹھی سے معلوم ہوگا۔''

دوسرے خط میں ڈیپوٹیشن سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں احمد عبدالعزیز وقار الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بجز آپ کے پاس سے ڈیپوٹیشن کا نتیجہ کیا ہوا، اس کا سخت انتظار ہے اور سچ یہ ہے کہ اس ڈیپوٹیشن سے میں سخت مخالفت رکھتا ہوں۔''

مندرجہ بالا خط میں غالباً اس ڈیپوٹیشن کی طرف اشارہ ہے، جو یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سر آغا خاں کی زیر سرکردگی بمقام شملہ وائسرائے ہند لارڈ منٹو کی خدمت میں پیش ہوا تھا:

''جس کو ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا آغاز سمجھنا چاہیے۔''

شملہ ڈیپوٹیشن میں مسلمانوں کی طرف سے جو مطالبات پیش کیے گئے تھے، ان کے بہت کچھ پورا کیے جانے کے سرکار کے اعلان کا تذکرہ کرتے ہوئے محسن الملک ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جو کچھ مسلمانوں نے درخواست کی تھی اور جس پر خیال کرنے کا وعدہ وائسرائے نے فرما لیا ہے، وہ بہت کچھ پورا کیا گیا ہے اور جو حصہ ان کا وائسرائے کی کونسل کی متعلق تھا وہ تو بالکل صاف ہو گیا۔ مسلمانوں کے لیے چار سیٹ رکھی گئی ہیں جس میں سے دو ممبر گورنمنٹ نامزد کرے گی اور دو ممبروں کا انتخاب مسلمان کریں گے۔ مگر طریقہ انتخاب کا قطعی فیصلہ ابھی نہیں ہوا اور نیز لوکل گورنمنٹوں میں اور لوکل بورڈ وغیرہ میں اپنے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اور اس کے لیے یہ وقت کوشش کرنے کا ہے اور کوشش باضابطہ اور منظم ہوتی

چاہیے جو ڈیپوٹیشن شملہ گیا تھا، وہ کسی نہ کسی طرح باقاعدہ ہو گیا تھا اور ہندوستان کے ہر صوبہ کے مسلمان شریک ہو گئے تھے۔ گورنمنٹ نے بھی ان کو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا قائم مقام سمجھا تھا اور اسی واسطے اس کا اثر بھی ہوا اور نتیجہ بھی اچھا نکلا۔ اگر اس اصول کی پابندی کی جائے تو یقین ہے کہ اس کا اثر اب بھی اچھا ہوگا اور اگر یہ اثر اب بھی محفوظ نہ رہا اور ہر ایک صوبے کے مسلمانوں نے بغیر صلاح و مشورہ کے علاحدہ علاحدہ کارروائی شروع کر دی تو اس کا وزن اس قدر نہ ہوگا جیسا کہ ڈیپوٹیشن کا ہوا تھا۔ اب رہا یہ امر کہ آئندہ کارروائی اتفاق سے کیونکر ہو۔ تو یہ آل انڈیا مسلم لیگ پر منحصر ہے۔ مگر اس کا انعقاد باضابطہ اب تک نہیں ہوا۔ اس میں آپ کی توجہ اس ضروری امر کی طرف چاہتا ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے کہ جب تک مسلم لیگ باقاعدہ قائم ہو کر کارروائی شروع کرنی چاہیے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایسے نازک اور تنگ وقت میں کسی صوبے کے کسی سمجھ دار مسلمان کو اعتراض نہ ہوگا کہ موجودہ حالت میں آپ کی طرف سے بحیثیت سیکریٹری مسلم لیگ کا کام شروع کر دیا جائے۔''

اپنا کوئی سیاسی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو جو نقصانات پہنچ رہے تھے، ان کے تدارک کے لیے نواب وقار الملک نے جو ابتدائی روز دھوپ پولیٹکل ایسوسی ایشن کے قیام کے لیے کی تھی، بالآخر اس ایسوسی ایشن کو نواب وقار الملک نے لکھنؤ میں قائم کیا۔ اس ایسوسی ایشن کے قیام کے لیے کی گئی کاوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وقار الملک مولوی بشیر الدین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں غالباً ۱۱ اکتوبر سے پہلے ہی احمد آباد سے لوٹ کر وطن پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ نومبر کے مہینے میں شرقی اضلاع کا دورہ ختم کرتا ہے تاکہ پولیٹکل ایسوسی ایشن کے ممبروں کا انتخاب تکمیل کو پہنچے اور زیادہ سے زیادہ آخر موسم سرما میں بمقام لکھنؤ ایسوسی ایشن کا پہلا اجلاس منعقد ہو سکے۔''

حسرت موہانی مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ''سودیشی تحریک'' کی رہبری کی اور

اس تحریک میں عملاً حصہ لیا۔ ''سودیشی اسٹور'' کے نام سے کپڑوں کی دکان قائم کی اور خواہش تھی کہ ملک میں اس کی شاخیں جابجا قائم کی جائیں۔ ان کے اس کام میں وقار الملک اور مولانا شبلی نے مدد کی۔ ''ان کی تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مولانا شبلی نے ان سے کہا تھا کہ:

''تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے پھر پولیٹیشن بنے اور اب بنئے ہوگئے۔'' [۳۲]

فاضل اللہ بھائی، کریم اللہ بھائی کے نام ایک خط میں حسرت موہانی کی سفارش کرتے ہوئے وقار الملک لکھتے ہیں:

''مولوی سید فضل الحسن حسرت موہانی نے حال میں ایک اسٹور دیسی ساختہ اشیا کا علی گڑھ میں کھولا ہے اور ان کی تمنا ہے کہ جناب کے کارخانوں سے بطور ایجنسی کے ان کو مال ملا کرے اور جناب کے قواعد کے مطابق جو ضمانت ان سے مطلوب ہوگی وہ اس کے داخل کرنے پر آمادہ ہیں۔'' [۳۳]

۱۸۵۷ء کے بعد سیاست میں قیام کانگریس (۱۸۸۵ء) اور بعد میں مسلم لیگ کے قیام نے بڑی حد تک دو مخصوص طبقہ اور فکر کی نمائندگی کی۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ جس نے ہندو مسلم اتحاد کی دیرینہ روایت کی نہ صرف شبیہ مسخ کر دی بلکہ سر سید احمد خاں جیسے متحدہ قومیت کے علم بردار کا ایقان بھی متزلزل کر دیا اور بالآخر یقین ہو گیا کہ اب ہندو اور مسلمان میں اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت کا باقی رہنا بعید از امکان ہے۔ اردو مکاتیب میں سیکڑوں شواہد موجود ہیں کہ کن کن حالات میں دونوں طبقوں کا اعتماد ایک دوسرے فرقہ پر کمزور شبہات کی زد میں آیا ہے۔ چند مسلم اتحاد و یگانگت کو پارہ کرنے والے حقائق کی طویل فہرست کی ابتدا میں اردو فارسی رسم الخط کو موقوف کرانے اور اس کی جگہ ہندی رسم الخط اور سنسکرت رسم الخط کی بحالی کی صورت میں سامنے آیا۔ اسکے بعد بنگال کی تقسیم اور پھر اس کی تنسیخ کے مطالبہ نے دونوں فرقوں کو دو متضاد راہوں پر گامزن کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد ''جداگانہ انتخاب'' کا مطالبہ ۱۹۲۰ء کی 'ترک موالات' کی تحریک ہندو مسلم فسادات ان سب سے ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا نہ صرف مطلع صاف ہوتا ہے بلکہ اکثریتی طبقہ میں خود اعتمادی کے ساتھ اقلیتی طبقہ بالخصوص مسلمانوں میں وسیع تر عدم تحفظ کے احساس کو پیدا کر رہا ہے۔ دونوں فرقوں میں نااتفاقی اور اس کے برے نتائج کی پیشین گوئی پہلی

متعدد اردو خطوط کی شہادت موجود ہے۔ اقبال کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دور بین نگاہیں آنے والے طوفان کو کس طرح دیکھ رہی تھیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بمبئی کے فسادات نے جو ابھی تک فرو نہیں ہوئے ہیں، بے حد پریشان کر رکھا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا آغاز ایک خونریزی کی صورت اختیار کرے گا اور یہ بدامنی نتائج پیدا کرے گی جو بے حد ناگوار ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہترین برطانوی واقف کار کو بھی اس امر کا قطعاً اندازہ نہیں کہ اس بظاہر پرسکون سمندر کی گہرائی میں کیسے کیسے طوفان بے تاب ہیں۔'' [۳۴]

ٹھیک اس وقت جب آزادی کی صبح امید طلوع ہونا چاہتی تھی، انگریز رخت سفر باندھ رہے تھے، مسٹر جناح کے نام اقبال کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح اکثریت سامراجی عزائم کے ساتھ مسلمان اقلیت پر عرصہ حیات تنگ کرنے میں کوشاں تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''گذشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم سا ہو چکا ہے۔ صرف شمالی مغربی ہندوستان کے اندر ایک ماہ کی مدت میں کم از کم تین فرقہ وارانہ فساد رونما ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسول اللہ کی کم سے کم چار وارداتیں پیش آچکی ہیں۔ توہین رسول اللہ کی ان چاروں وارداتوں میں مجرم فی النار کر دیا گیا ہے۔ سندھ میں قرآن کریم کے نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے۔ صورت حال کا نظر غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں، نہ معاشی بلکہ سیاسی ہیں۔'' [۳۵]

تقسیم ہند سے پیدا شدہ حالات کی نزاکت پر اردو مکاتیب میں جو تفصیلات مندرج ہیں، وہ مختلف نوعیت کی ہیں۔ جان و مال کے اتلاف کا ماجرہ ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے کا غم ہے تو کہیں دلی کے کشیدہ حالات کی ناقابل بیان خبروں کے ساتھ مسلمانوں کے قتل عام کی اطلاع بھی موصول ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام ایک خط جو ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لکھا گیا تھا۔ اس میں اپنے دورے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''بھوپال ۲ ستمبر کی شب کو پہنچا اس ارادے سے کہ ایک روز قیام کر کے ہوائی جہاز سے دلی چلا جاؤں گا۔ اسٹیشن پر شعیب قریشی آئے اور مجھے الگ لے جا کہنے لگے کہ اب آپ دلی نہیں جا سکتے وہاں کی حالت اب بہت خراب ہو گئی ہے۔ میں نے کہا یہ سب پروپیگنڈہ ہے۔ اخبار والے خواہ مخواہ اس قسم کی باتیں لکھا کرتے ہیں لیکن انھوں نے اس شدت سے اصرار کیا کہ مجھے مجبوراً بھوپال میں ٹھہر جانا پڑا۔ اس کے بعد جو خبریں آئیں وہ ناقابل بیان ہیں، میں اپنے پروگرام کے حساب سے اس روز دلی پہنچتا جو مسلمانوں کے قتل عام کا دن تھا۔''۲۶

ملک کی تقسیم اور اس سے پیدا شدہ حالات کی ذمہ داری کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''گاندھی جی کا کھیل قبل از وقت ختم ہو گیا۔ یہ بھی ایک سیاسی چال تھی، جس اس وقت فقہ شروع کیا ہوا جب کہ معاملہ ایوان (یو این او) میں پیش ہونے والا تھا لیکن چار دن سے زیادہ نہ سہار سکے بحت بگڑ گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو نیک ہدایت دے۔''۲۷

مولوی عبدالحق کے خطوط سے قیام پاکستان کے بعد کے ان حالات یا حقائق سے پردہ اٹھتا ہے کہ کس بے دردی سے مال و اسباب کو بلوائیوں نے لوٹ لیا اور وسیع پیمانے پر آدمی، بچے، بوڑھے اور عورتیں ان کے ظلم و بربریت کا نشانہ بنے۔ ان کے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے بیشتر خطوط میں جان و مال کے نقصان کا ذکر ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''دلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے ظالم بلوائیوں نے سب کچھ لوٹ لیا۔''۲۸

انجمن ترقی اردو کے اس وقت کے صدر اور اردو دوست سر تیج بہادر سپرو کے نام ایک تفصیلی خط میں انجمن کے لٹنے اور اس کی تباہی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انجمن کا دفتر تباہ کر دیا گیا۔ اس کے رجسٹر اور دوسرے کاغذات تلف کر دیے گئے۔ میرا ذاتی سامان سب کا سب لوٹ لیا گیا ہے۔ موٹر توڑ پھوڑ دی گئی ہے۔ باورچی خانہ، گودام، دوالانوں اور ایک کمرے میں ردیوں کے بڑے بڑے

ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۴۷ء سے اب تک بچے کچھے سامان کی درستی اور تلاش اور معمولی دفتر کے کام میں لگے رہے۔ ردیوں کے انباروں کی چھانٹی میں کئی مہینے لگ گئے۔''۲۹

تقسیم ملک نے جن حالات و مسائل کو پیدا کیا ان میں نقل مکانی اور وسیع پیمانہ پر ہجرت کا المیہ سرفہرست ہے۔ اردو مکاتیب میں ان حالات کی تفصیل تو نہیں ملتی لیکن بعض امور میں ضمناً اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

تقسیم ملک کے پس منظر میں ہندی اردو مخاصمت کا پہلو بھی اردو خطوط میں خاصا نمایاں ہے۔ ملک کی تقسیم میں کارفرما دیگر سیاسی عوامل کے ساتھ زبان کا پہلو بھی خاصا اہم رہا ہے۔ سرسید احمد خاں کا وہ تجزیہ بالکل درست تھا کہ زبان ہی وہ قدر مشترک ہے جو متضاد تہذیب و تمدن کے حامل طبقوں کو دو مخالف سمت میں لے جائے گا۔ اس تنازع سے جو حالات پیدا ہونے والے تھے ان کی پیشین گوئی اردو خطوط میں بھی موجود ہے۔ تنازع رسم الخط کا تھا۔ ہندو ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ دفتری حیثیت دلانا چاہتے تھے اور اہل اردو، اردو اور فارسی رسم الخط پر مصر تھے۔

اس تنازعہ کا پہلا مظہر اس وقت سامنے آیا جب آگرہ اور اودھ کے متحدہ صوبوں کے چند ہندوؤں نے اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ شروع کیا تھا۔ بنارس کے بابو شیو پرشاد اس تحریک کے روح رواں تھے۔ ۱۸۶۸ء میں عدالت میں داخل ایک عرضداشت میں شمالی ہند کے سابق حکمرانوں پر الزام عائد کیا کہ انھوں نے انھیں فارسی سیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ پرشاد نے حکومت سے یہ درخواست کی کہ کورٹ سے فارسی رسم الخط کو ہٹا کر اس کی جگہ ہندی بحال کی جائے۔ اس تفریق کے بڑھتے رجحان پر محسن الملک کے نام سرسید کا ایک خط پیش خدمت ہے جو اس قضیہ کے جاں گسل انجام کی پیشین گوئی پر مبنی ہے۔ لکھتے ہیں:

''بابو شیو پرشاد کی تحریک سے عموماً ہندوؤں کے دل میں جوش ہے کہ زبان اردو اور رسم الخط فارسی کو کہ مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے کہا ہے کہ بجائے اردو اخبار کے ہندی میں ہو اور ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایسی تدبیر ہے کہ

ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں
گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علاحدہ اور مسلمان علاحدہ ہو جائیں گے۔" [illegible]

۱۸۶۸ء میں جب اردو زبان اور اس کے فارسی رسم الخط کے متعلق مخالفت شروع ہوئی اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ عدالتوں کی زبان بھاشا اور خط دیوناگری ہو تو اس مسئلے میں مختلف جگہوں پر مختلف کمیٹیاں بنیں۔ صدر کمیٹی الہ آباد میں قائم ہوئی اور اس کمیٹی کے سکریٹری سرو داپرشاد مقرر ہوئے۔ انھوں نے اسی مسئلے سے متعلق سرسید احمد خاں خط و کتابت کے ذریعہ کافی اعتراضات قائم کیے۔ ان کے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے سرسید احمد خاں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری دانست میں اس طرح پر بیان کرنا کہ ہندی زبان اضلاع شمال و مغرب
کی موجودہ مخلوط زبان ہے جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے، دو مختلف
باتوں کا ملا دینا ہے۔ اس لیے کہ زبان فی نفسہ اور چیز ہے اور کسی قسم کے خاص
حروف میں اس کا لکھا جانا اور بات ہے۔ میرے نزدیک اضلاع شمال و مغرب
و صوبہ بہار کی عدالتوں میں وہی زبان شائع ہونی چاہیے جس کو آپ ہندی یعنی
موجودہ مخلوط زبان کہتے ہیں۔ لیکن میں اس کو اردو کہنا پسند کرتا ہوں۔" [illegible]

دوسری جگہ اردو زبان سے متعلق لکھتے ہیں:

"جب آپ کے نزدیک ہندی زبان ان اضلاع کی موجودہ مخلوط زبان ہے تو
پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس میں اور اردو میں کیا فرق ہے۔ پس جب ان دونوں
میں امتیاز نہیں ہے تو پھر تبدیلی کے کیا معنی ہیں اور ایک زبان کے بجائے دوسری
زبان کے کیسے رائج ہوگی۔" [illegible]

بالآخر ۱۸ راپریل ۱۹۰۰ء کو بعض سرکاری اغراض دے دی گئی اور ہندی رسم الخط کو سرکاری سطح پر اردو کے برابر درجہ مل گیا۔ اس تنازعے نے اردو کی ساکھ کو خاصا نقصان پہنچایا۔ "زمانہ" کی ادارت کی پیش کش پر پریم چند ۲۲ رمئی ۱۹۳۱ء کو دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں:

"اردو کی ہوا آج کل بگڑی ہوئی ہے۔ اخبار تو یوں بہت مشکل ہو گئی ہے جتنے
موجودہ رسالے ہیں ان میں کسی کو فروغ نہیں۔ سب کتے کی زندگی جیتے ہیں

ایسے حالات میں کیا حوصلہ۔" [illegible]

اردو کے روز بروز زوال پذیر صورت حال نے ہندی میں لکھنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ دیا نرائن نگم کے نام ایک خط میں پریم چند لکھتے ہیں:

"اب ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں۔ اردو میں اب گزر نہیں..."

ساتھ میں یہ بھی لکھتے ہیں:

یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالمکند گپت کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف
کروں۔ اردو لکھنے میں کس ہندو کو فیض ہوا جو مجھے ہوگا۔" [illegible]

پریم چند کے خطوط سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی بساط کی طرح اردو زبان جو صرف مسلمانوں سے متعلق کر دی گئی تھی، کی بساط بھی بچھی جاری تھی۔ ہندوستان میں جہاں ہندی کا مطلع زیادہ صاف اور بااتھاہ ہیں اردو کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ مولوی عبدالحق کے خطوط میں اس عہد کی لسانی سرگرمیوں کا مصدقہ ریکارڈ موجود ہے جو لسانی سیاست، ترویج ہندی اور اردو حمایت جیسی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

مسلم معاشرے میں علما کا آپسی اختلاف کوئی نئی یا غیر متوقع چیز نہیں بلکہ ہر دور اس ناخوشگواری سے آشنا رہا ہے۔ سرسید احمد خاں نہ صرف ان اختلافات پر دل برداشتہ ہوتے ہیں بلکہ انھیں متحد کر کے ان کی اصلاح کی بھی کوشش کرتے رہے ان کی ان کوششوں کا ذکر ان کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔

مکتوباتی سرمایہ میں دینی اور مسلمانوں کے معاشرتی مسائل کا ایک ذخیرہ موجود ہے جو مختلف النوع امور اور پہلوؤں پر بنی ہے۔ اس ضمن میں سرسید احمد خاں کے خطوط جن مسائل سے روشناس کراتے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے مسلم معاشرت سے مربوط ہیں۔ خط میں مندرج مسائل کے پہلو میں مکتوب نگار کا نقطہ عروج اور کسی مسئلے پر اس کی تردید و توثیق کا بھی علم ہوتا ہے۔

شادی کو لے کر مسلم سماج میں رائج غیر اسلامی رسم و رواج اور روایات کا اندازہ شبلی کے خط سے لگایا جا سکتا ہے۔ اپنے بیٹے کی شادی میں معاشرتی رسوم کو روکنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دسمبر میں حامد کی شادی ہے۔ میں اس دن شادی کی حقیقت اور اس کے مراسم
پر نہایت وسیع اور پرزور لیکچر دوں گا اور انشاء اللہ بے ہودہ رسموں کی جڑ کاٹ
دوں گا۔''۵۳

دینی اور شرعی مسائل کی تفہیم میں مولانا مودودی کے مکتوبات بہت اہم ہیں۔ ان میں زیر بحث مسائل نہ صرف دینی نوعیت کے ہیں بلکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے عمومی مسائل پر دینی اور اس کی شرعی حیثیت سے بھی بحث کی گئی ہے۔ دسمبر ۱۹۶۷ء میں رومن کیتھولک چرچ کے پوپ کا ایک پیغام جو تمام دنیا کے دینی جماعتوں کے سربراہوں کے نام جاری کیا گیا اس میں مولانا مودودی بھی شامل تھے۔ مولانا مودودی نے ایک تفصیلی جوابی خط لکھا۔ اس خط کا ایک حصہ جو مسلمانوں کے لیے ایک مستقل درد کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ہے بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا قبضہ۔ اس سے ایک اہم واقعہ کی تفصیل ملتی ہے۔ اس لیے یہ خط تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں چھ مرتبہ انگریزوں کی قید و بند کی زندگی گزارنی پڑی۔ احمد نگر کے قلعہ میں آخری یعنی چھٹی بار گرفتار کر کے رکھے گئے تھے۔ انھوں نے وہاں کی زندگی، مشاغل، وہاں کے شب و روز کے بارے میں جس قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس سے پہلے سیاسی قید خانے کے حالات اس طرح کہیں نہیں ملتے۔ ان کے خطوط کے مجموعے ''غبار خاطر'' میں جیل کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ فرنگی حکمراں کس قدر احتیاط، ہوش گوش اور رازداری سے کام لیتے تھے اور اپنے کام میں کس حد تک چاق و چوبند تھے۔ ایک خط میں قید خانے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''۹ مہینے ہوئے ۳ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانے کا دروازہ میرے لیے
کھولا گیا تھا۔ کل ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے حصار کہنہ کا
نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا ہے۔''۵۴

مولانا ابوالکلام آزاد کو تاریخ سے بہت دلچسپی تھی چنانچہ ان خطوط میں انھوں نے تاریخ سے متعلق بھی بحث کی ہے۔ خطوط کے مطالعے سے قلعہ احمد نگر کی تاریخ سے واقفیت ہوتی ہے۔ ان خطوط میں چائے اور موسیقی سے متعلق دلچسپ حقائق کو پیش کیا ہے اور پانچویں صلیبی جنگ کا تفصیلی

جائزہ لیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطوط میں تاریخ کے اہم واقعات کو قید کر لیا ہے۔ اس لیے ان کے خطوط تاریخی دستاویز قرار دیے جا سکتے ہیں۔

خطوط میں ایک طرف روزنامچے کی باتیں آجاتی ہیں۔ وہیں زندگی میں پیش آنے والے واقعات بیان کرتے ہوئے مکتوب نگار اپنے عہد کی تاریخی پرچھائیاں صفحۂ قرطاس پر منعکس کرتا چلا جاتا ہے جن سے اس زمانے کی سیاسی، سماجی، معاشرتی صورت حال کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کے خطوط میں بھی کئی ایسے مقامات ہیں جہاں ان کے عہد کی تصویر ملتی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ سن کر انگریزی ڈپٹی کمشنر صاحب کچہری میں قتل کر دیے گئے۔ بہت تردد ہوا
ہے۔ اللہ خیر کرے۔''۵۵

مہاتما گاندھی نے جب ستیہ گرہ، سول نافرمانی اور بائیکاٹ کا آندولن شروع کیا تو اس آندولن میں ہزاروں طالب علموں نے سرکاری اسکولوں، سرکاری ملازمتوں اور بدیسی چیزوں کا بائیکاٹ کیا۔ ہر ایک کے دل میں آزادی حاصل کرنے کا جوش تھا۔ پریم چند اور ان کی بیوی شورانی دیوی کے دل میں بھی آزادی کے جذبات مچل رہے تھے۔ پریم چند نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر ۱۵ر فروری ۱۹۲۱ء کو چھٹکارا پالیا اور کانگریس میں شامل ہو کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ ان کے خطوط میں ان کے اور ان کی بیوی شورانی دیوی کے جیل جانے کا ذکر ملتا ہے۔ جینندر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''شاید پھر جائیں، ابھی انھیں تسلی نہیں۔ سارا سوراج ایک بار میں لے لیں گی۔
قسطوں میں نہیں چاہتیں۔''۵۶

سرکاری نوکری سے آزاد ہو کر پریم چند کانگریس کے جلسوں میں حصہ لیتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی آندولن میں آگے آنے اور قربانیاں دینے کے لیے حوصلہ بڑھاتے تھے۔ ایک بار پولیس لاٹھی چارج میں جواہر لال نہرو کی بوڑھی والدہ محترمہ سروپ رانی نہرو بیہوش ہو کر سڑک کے کنارے گر پڑیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے دیانرائن نگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''گورنمنٹ کی زیادتیاں ناقابل برداشت ہو رہی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو

کی ضعیف ماں کے ساتھ کیسی بدسلوکی کی گئی۔ اب باہر رہتے میں مجھے بھی بے حیائی معلوم ہو رہی ہے۔''۳۹؎

ہندوستان کے لیے دستور بنانے سے متعلق کیشو رام سبھر وال کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس وقت لکھنؤ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس ہو رہی ہے جس میں ہندوستان کے لیے ایک دستور تیار کیا جائے گا۔ تاکہ اسے سائمن کمیشن کے سامنے رکھا جا سکے۔ امید ہے کہ آپ ہندوستان کی سیاست سے رابطہ قائم رکھے ہوں گے۔''۴۰؎

دیا نرائن نگم کو سیاسی حالات سے آگاہ اس طرح کرتے ہیں:

''شہر فوجی کیمپ بنا ہوا ہے۔''۴۱؎

پریم چند کے خطوط میں تاریخی واقعات اور اس وقت کے سیاسی حالات کا ذکر موجود ہے۔ پریم چند نے جس طرح اپنے ناولوں میں معاشرے کی عکاسی کی ہے اسی طرح اپنے خطوط میں ہندوستانی سماج کی برائیوں اور بے ہودہ رسموں کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت کی معاشرتی برائیوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''غربا اور مزدور پیشہ لوگوں میں طلاق کا رواج عام ہے۔ اس مسئلے نے ان نام نہاد اونچی ذاتوں اور طبقوں میں خوف ناک صورت اختیار کی ہے۔ شادی دراصل سمجھوتے اور سپردگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ اگر جوڑا خوش رہنا چاہے تو اسے ایک دوسرے کی بات ماننا ہی ہوگی لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی بھی حالت میں خوش نہیں ہو سکتے۔''۴۲؎

دوسرے خط میں کچھ پجاریوں مہنتوں اور مذہبی لوگوں کی مکاری اور ان کو لوگوں کے زوال کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک برہمن وہ ہے جو سیوا اور تیاگ کو اپنا شیوہ بنائے۔ خواہ وہ کسی ذات میں پیدا ہوا ہو۔ میں ان پجاریوں اور پنڈتوں کو جو تصنع اور اندھی اصول پرستی کو اپنا شعار بنا کر سادہ لوح ہندوؤں کے عقائد سے کھیلتے ہیں، ہندو سماج پر ایک لعنت سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں یہی لوگ ہمارے زوال کا سبب ہیں۔''۴۳؎

خطوط کی تاریخی معنویت قابل توجہ ہے۔ خط جو بنیادی طور پر ترسیل اور نقل مطالب کا مقصد رکھتا ہے، زبردست دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ کے اوراق کی ترتیب میں مورخ کی رہنمائی کرتے ہیں۔ خط کے بیچنے میں واقعہ اس کی تفصیل، سال، سن، تاریخ اور عوامل اور محرکات کے ساتھ محفوظ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ان کے اثرات کی تفصیلات بھی موجود ہوتی ہیں۔ مکتوبات میں دستیاب بعض تاریخی احوال کی اہمیت اس وقت دو چند ہو جاتی ہے۔ جب عام حالات میں اس واقعہ کا ذکر کرنا مورخ کے لیے ممکن نہ رہا ہو اور اسی سبب تاریخی کتب میں موجود نہ ہو۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۷ء کے پر آشوب عہد کی پریشانیوں کو قلم بند کرنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ نجی خط میں اس کی گنجائش ضرور تھی۔ متعدد خطوط محض حقائق کا ریکارڈ ہی نہیں ہے بلکہ مکتوب نگار کے ذہنی کرب کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ خطوط کی تاریخی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی رقمطراز ہیں:

''ان سے ہم تاریخی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈائری، خود نوشت اور خطوط سے جتنے مستند تاریخی معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اتنے کسی اور ذریعے سے نہیں معلوم ہو سکتے۔ انگلستان کے عہد اٹھارہ شاہی کی تاریخی کو اور اٹھارہویں صدی کے فرانس کو Simon کی تحریروں کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ اسی طرح سلاطین ترکی اور شاہانِ صفویہ کے تعلقات ''مکاتبات سلاطین'' یا ''مکاتبات فریدون'' کے بغیر واضح نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ براؤن نے ان کو 'تاریخ ادبیات ایران' میں بہت فراخ دلی سے استعمال کیا ہے۔ لیکن ان چیزوں سے اس وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جب لکھنے والے کا مشاہدہ وسیع ہو۔ اس میں قوت نقد اور تمیز موجود ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ بے لوث، غیر جانب دار اور بے تعصب ہو۔''۴۴؎



زمانہ ترقی کرتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ چیزوں کی قدر و قیمت میں بھی فرق آ جاتا ہے۔

آج کے اس ترقی پذیر یا ترقی یافتہ دور میں انسان کی نگاہ میں کچھ ایسی قدریں یا معیار کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے جو اس کے بزرگوں کی زندگی کے مقاصد تھے۔ آج انسان کی زندگی کا رجحان قرض اور عمل کی جدید تعبیروں کی طرف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج انسان ایسے دور سے گزر رہا ہے جس میں تمام آسائشوں کے ساتھ بھی اختلافات کی افراط اور مستقل ذہنی ناآسودگی اور بے اطمینانی ہے۔ انسان کو پھر بھی اس بات کا احساس ہے کہ وقت کا بہاؤ اس کی زندگی کی کشتی کو کناروں تک نہیں آنے دے گا۔ آج کا دور سائنس کا دور ہے اس لیے انسان کے اس ذہنی تغیر کا راز ان کارگزاریوں میں ہے جن کے ہمہ گیر اثرات کو سائنس کی ایجاد کے وسیع تر مفہوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آج مختلف ملکوں، قوموں اور فرقوں کی تہذیبیں اور نظریے ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایسے تمدن کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں جو ان کی حیات کو پوری طرح اپنے قبضۂ قدرت میں لے سکیں۔

زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی نئی نئی صنفیں اپنی مختلف خصوصیتوں کی وجہ سے مقبول عام ہو رہی ہیں۔ آج کا دور کیوں کہ سائنس کا دور ہے اس لیے مکاتیب کی اہمیت روز مرہ یا عام زندگی میں وہ نہیں رہی جو ٹیلی فون، فیکس، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن یا موبائل کی ایجاد سے پہلے تھی۔ آج کے دور میں روابط کی ان بے مثال اور آسان سہولتوں سے خط نویسی کی روایت کو نقصان پہنچا ہے یہاں تک کہ ان سہولتوں نے مطالعے کے شوق کو بھی کم کر دیا ہے۔ لیکن جہاں تک تاریخ و ادب کا تعلق ہے، مکاتیب کی اہمیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں ہے کیوں کہ ادبی صورت حال

پر مصنف کی ذات اور ماحول کے نقوش بہت گہرے ہوتے ہیں۔ بقول غلام رسول مہر:

"اس حقیقت سے غالباً کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ شخصیت کا زیادہ سے زیادہ صحیح تعلق اور قابل اعتبار اندازہ مقصود ہو تو ان افکار و خیالات اور عوامل کا ذخیرہ فراہم کرنا چاہیے جو شخصیت کے قلب و دماغ میں زندگی بھر موجزن رہے۔ ان میں سے صرف تھوڑے ہی عمل کا لباس پہن کر محسوس و مشہود شکل میں منظر عام پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اکثر ضروری اسباب کے فقدان یا مواقع کی فراوانی اور مساعدت کی ناسازگاری کے باعث بطون قلب و دماغ میں ہی مصروف سیر و گردش کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری منزل پیش آ جاتی ہے۔ بلکہ اعمال کی حقیقی حیثیت متعین کرنے کے لیے بھی تو ہمیں انسان کے افکار و احساسات کا ہی پیمانہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔"[55]

خطوط کے ذریعہ لکھنے والے کی زندگی کے ذہن مختلف عناصر کو جدا جدا کر کے دیکھ سکتے ہیں اور اس کے ذہن کے ارتقا کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خطوط میں ادبی مسائل کا ذکر، فنکاروں کے شخصی نظریات و افکار کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے۔ ادبی افادیت، ادبیت اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان خطوں کے وسیلے سے فنکار کی تخلیقات و تصانیف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے خطوط کو ادبی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو عام لوگ اور بھی فنکار اپنی زندگی میں خطوط لکھتے ہیں لیکن ان سب کو ادبی خطوط کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ صرف ایسے ہی فنکاروں کے خطوط ادبی اہمیت رکھتے ہیں، جو حقائق کے انکشافات کے ساتھ خطوط میں دلکش اسلوب بھی اختیار کرتے ہیں۔

خطوط کے ذریعے اس عہد کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے جس دور میں خطوط لکھے گئے ہیں اس دور کے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور دیگر تمام حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے مکتوباتی ادب کو تاریخ کا ایک اہم جز قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کی ترتیب صحیح میں جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ان میں تاریخ کی کتابوں سے کہیں بڑھ کر ان چیزوں اور باتوں کو دخل حاصل ہے جو تاریخ کے طور پر نہیں لکھی گئیں لیکن کسی نہ کسی طور پر اس زمانے کے حالات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں شاہی فرامین سیاسی تحریرات اور مکتوبات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی

نے لکھا ہے:

"شاہی فرامین، سیاسی تحریرات، اور مکتوبات خصوصیات کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اس لیے پروفیسر براؤن نے "تاریخ ادبیات ایران" جلد چہارم کی تالیف میں "منشآت فریدوں" کا استعمال فراخ دلی سے کیا ہے اور سرکار نے اورنگ زیب کی تاریخ لکھتے وقت "مکاتیب عالم گیر" سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔"۷۶

خطوط کی ادبی اہمیت کسی بھی تخلیقی کارنامے سے کم نہیں ہوتی۔ پروفیسر گیان چند نے رام لعل کے خطوط کے مجموعے 'حرف شیریں' کے مقدمے میں خطوط کی اہمیت وافادیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ادبی خطوط میں اس (مراد ادیب) کی ادبی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ متعدد ادبی مسائل پر اس کی مختصر رائے معلوم ہوتی ہے۔ بعض ادبی خطوط میں تنقید و تحقیق کے جواہر پارے بھرے ہوتے ہیں کسی ادیب کے ذہنی ارتقا، ادبی سفر کی تصانیف کو سمجھنے میں اس کے مکاتیب سے جو مدد ملتی ہے وہ سب سے مستند تحقیقی ماخذ ہے۔"۷۷

خطوط سے علمی وادبی معلومات کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ اکابرین و مشاہیر کے خطوط کی اہمیت کی بڑی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں ادبی مواد بکثرت ہوتا ہے جو ادیب، فن کار یا شاعر کو صحیح مرتبہ تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جب کسی مشہور ادیب یا شاعر کا مجموعۂ خطوط شائع ہوتا ہے تو ان خطوط کی وجہ سے اس ادیب کا ادبی مرتبہ بڑھ جاتا ہے۔

ادبی مباحث واصلاحات

مشاہیر کے خطوط ان کی سوانح حیات اور شخصیت کے ارتقا کے متعلق بہت قیمتی مواد فراہم کرتے ہیں۔ خطوط میں بیشتر ایسے نکات ہوتے ہیں جو متعلقہ فن کار کے فن کو سمجھنے اور سمجھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مرزا غالب کے یہاں ایسے خطوط کی کمی نہیں جن میں ادبی مباحث اور دیگر لوگوں خاص طور سے شاگردوں کے کلام پر اصلاح کی گئی ہے۔ بیشتر خطوط غالب کے ایسے ہیں جن میں مکتوبیت برائے نام اور ادبیت بھرپور ہے۔ مرزا غالب کے خطوط کا بڑا حصہ ایسا ہے جو ذاتیات سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ادبی کیف کا حامل ہے اور غالب کو اردو ادب کا اہم ترین مکتوب نگار تسلیم کرنے کے لیے کافی ہے۔ مرزا غالب نے اپنے کلام کے کچھ حصے کی تشریح اپنے خطوط میں کر دی ہے۔ بہت سے اشعار جن میں کوئی تلمیح پائی جاتی ہے اس کا مطلب واقعہ کی تشریح کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے۔ مکتوبات میں استعمال اشعار سے لطف اندوزی کے ساتھ اس بات سے بھی واقفیت ہوتی ہے کہ وہ اشعار انھوں نے کس موقع پر اور کب کہے۔ انھوں نے خطوط میں اردو اور فارسی کے اشعار کا استعمال کر کے خطوط کی ادبی شان بڑھا دی ہے۔

مرزا غالب کے زمانے میں الفاظ کی تذکیر وتانیث پر کوئی مستقل کتاب موجود نہیں تھی اور اہل لغت میں اس تعلق سے اتفاق رائے نہ تھا۔ غالب نے اپنے خطوط میں الفاظ کی تذکیر وتانیث سے بحث کی ہے۔ ایک خط میں لفظ 'رت' کی اصلیت سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رت لفظ ہندی الاصل 'رتو' ہے۔ ہائے مضمرہ، بعض مذکر بولتے ہیں بعض مونث۔"۷۸

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"گلشن بعض کے نزدیک مؤنث اور بعض کے نزدیک مذکر ہے۔ قلم، دہی اور خلعت ان کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی مونث، کوئی مذکر لکھتا ہے۔ میرے نزدیک 'دہی' اور 'خلعت' مذکر ہیں۔ اور 'قلم' مشترک۔ چاہے مذکر کہو، چاہے مونث۔ 'گلشن' البتہ مذکر مناسب ہے۔" ۵۸

سید قدرت نقوی نے مسئلہ تذکیر و تانیث میں غالبؔ کا موقف اس طرح بیان کیا ہے:

"تذکیر و تانیث کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ غالبؔ یہ جانتے تھے کہ یہ اختلاف دور ہونے والا نہیں ہے۔" ۵۹

مرزا غالبؔ نے متعدد خطوط میں اردو اور فارسی حروف تہجی سے بحث کی ہے۔ انھوں نے عربی حروف تہجی کے ناموں سے بھی بحث کی اور جگہ جگہ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کی مثال قدر بلگرامی کے نام لکھے گئے خط سے پیش کی جاسکتی ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

"مولوی آل نبی سہارنپور اور مولوی امام بخش دہلوی میں اس بات پر جھگڑا ہوا۔ مولوی امام بخش 'باکو' نے کہنا جائز نہیں رکھتے۔ آخر مولوی آل نبی نے اہل فن کلام کے کلام سے اس کا جواز ثابت کر دیا مگر از روئے تلفظ۔" ۶۰

مرزا غالب نے اپنے خطوط میں اردو املا پر بھی بحث کی ہے اور درست املا سے بھی واقف کرایا ہے۔ وہ نہ صرف املا پر توجہ دیتے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد درست املا لکھیں۔ شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے ساتھ لفظوں میں جن املائی شکلوں کو وہ درست سمجھتے تھے، ان کی نشاندہی کرتے اور بار بار ٹوکتے تھے۔ قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"صاحب اتم نے مثنوی خوب لکھی کہیں املا کہیں انشاء میں اغلاط تھے، وہ کیے اور ہر اصلاح کی حقیقت اس کے بحث میں لکھ دی ہے۔" ۶۱

مرزا غالب نے ترکی، ہندی اور عربی و فارسی الفاظ کی املا سے بھی بحث کی ہے۔ ان خطوط سے ایک طرف تو فارسی زبان سے ان کی رغبت ظاہر ہوتی ہے تو دوسرے طرف ماہر زبان کی حیثیت سے بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مرزا غالبؔ کو نہ صرف مشرقی شعریات بلکہ نثر نگاری کے نکات

سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ بعض خطوط میں نثر کی اقسام سے بحث کی ہے۔ چودھری عبدالغفور سرورؔ کے خط میں لکھتے ہیں:

"بندہ کی تعلیقات میں ہے کہ نثر تین قسم پر ہے:
مقفی: قافیہ ہے اور وزن نہیں۔
مرجز: وزن ہے اور قافیہ نہیں۔
عاری: نہ وزن ہے نہ قافیہ۔
مسجع و مقفی ہے دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب و گرا ہوں۔" ۶۲

مرزا غالبؔ نثر کے ساتھ مشرقی شعریات سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ شعر و سخن کے تعلق سے انھوں نے اپنے خطوں میں خیالات کا اظہار کیا ہے اور شعر کے محاسن کا ذکر جابجا کیا ہے۔ ایک خط میں ایک قصیدہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انشاء اللہ خاں کا قصیدہ بھی میں نے دیکھا ہے، تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے۔ اور اچھا سماں باندھا ہے، زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دل نشین۔" ۶۳

دوسرے خط میں شاگرد کے کلام کی اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں:

"آپ کا واسطے اصلاح کلام کے رجوع کرنا میری طرف، موجب میری نازش کا ہے۔ میرا طریقہ اس فن خاص میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے۔ اسے بدستور رہنے دیتا ہوں اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں، اس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں تاکہ آئندہ صاحب کلام اس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔" ۶۴

مرزا غالبؔ کے خطوط میں جابجا شعر، قافیہ و ردیف کے تعلق سے بامعنی باتیں ملتی ہیں تو کسی خط کے ذریعے اشعار کی تشریح سے واقفیت ہوتی ہے۔ کسی خط میں مثنوی کا ذکر موجود ہے تو کسی خط کے تحت قصیدے کے تعلق سے کوئی بات کہی ان کے خطوط نہ صرف ادبی جواہر پاروں سے بھرے ہیں بلکہ وہ تمام تر اوصاف جو اعلا مکاتیب کی خصوصیات ہوتی ہیں ان میں موجود ہیں۔ مرزا غالب

کے اردو مکتوبات اردو زبان کی ادبی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہیں۔

سرسید احمد خاں کے خطوط ادبی چاشنی سے خالی ہیں۔ ان کے خطوط میں ان کی سیرت اور شخصیت مکمل کر یا مکمل طور پر سامنے نہیں آتی بلکہ ان کے خلوص قلب، قومی ہمدردی اور عظمت کا نقش ان کے خطوط کو پڑھ کر دلوں پر اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ سرسید احمد خاں کے خطوط سے ان کی ذاتی اعتقادات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ ادب کی یہی وہ صنف ہے جس میں لکھنے والا اپنا سینہ چیر کر رکھ دیتا ہے اور اپنی سبھی رائیں بلا کم وکاست ظاہر کر دیتا ہے۔ سرسید احمد خاں کے خطوط میں بھی کہیں کہیں ادبی بحثیں اور اصلاحیں ملتی ہیں۔ سرسید احمد خاں نے قدیم انشاء پر ضرب کاری لگائی اور اس زمانے کے پرتکلف انداز کی اکثر مذمت کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "علم ادب وانشا کی خوبی صرف لفظوں کو جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کی تک ملانے اور دور از کار وخیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط وکتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ قصوں میں یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو در اصل دل میں نہیں ہے۔ مندرج نہ ہو۔ پس ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے۔ اور ہم کو جھوٹی اور بناوٹی تحریر کا عادی بنا دیا ہے۔" 65

سرسید احمد خاں کا ایک خط جدید اردو شاعری کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ حالی نے مسدس لکھی اور کتاب جب سرسید احمد خاں کو موصول ہوئی تو اسے پڑھنے کے بعد حالی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعر اور شاعری ہے بالکل مبرا ہے۔ کیوں کر ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں

> جاسکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے، ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی ہوس میں پائی جاتی ہے تو صرف انھیں الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔" 66

سرسید احمد خاں کے جملہ تعلیمی وادبی سرگرمیوں کا اندازہ ان کے خطوط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ نیچری شاعری کی حمایت میں محمد حسین آزاد کے نام ایک خط میں ان کی آواز یوں بلند ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خواب امن" پہنچی دل خوش ہوا حقیقت شاعری اور زور سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا۔ اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعری کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جاویں۔ یہ کام جتنا مشکل ہے کہ کوئی تو کرے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں ہم بیان کیا کرسکتے ہیں۔" 67

حالی کے خطوط میں ادبی نکات بھی ہیں۔ باتھ اور بات کی بحث کی گئی ہے۔ تکان کے لفظ پر غور کیا گیا ہے۔ قوافی کے اصول بتائے گئے ہیں۔ ایک خط میں انھوں نے غالب اور انیس کی ملاقات کو غلط ثابت کیا ہے۔ "واقعات انیس" کے بعض مضامین کے متعلق مرزا غالب اور انیس کی ملاقات پر بحث کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "مرزا کی ملاقات لکھنؤ میں میر انیس مرحوم سے نہ ہوئی اور نہ ہوسکتی تھی۔ مرزا صاحب لکھنؤ اس وقت گئے جب کہ وہ سپریم گورنمنٹ میں اپنی پنشن کی بابت استغاثہ کرنے کے لیے کلکتے جاتے تھے اور اثنائے راہ میں چند روز

ٹھہرے تھے۔ یہ زمانہ جیسا کہ مرزا صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین حیدر کا تھا۔ چنانچہ ایک خط موسومہ منشی حبیب اللہ خاں ذکا میں اردوئے معلیٰ (مطبوعہ ۱۸۹۹ء) کے صفحات ۲۷-۲۹ میں درج ہے۔ اپنا کلکتے جانا ۱۸۳۰ء میں لکھتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر جیسا کہ تاریخ اودھ میں مذکور ہے ۱۸۲۸ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں انھوں نے انتقال کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۳۰ء عہد نصیر الدین حیدر کا آغاز تھا۔ اس وقت نہ میر انیس لکھنؤ میں فیض آباد سے آئے تھے اور نہ لکھنؤ میں ان کی کچھ شہرت تھی۔"۶۸

اردو خطوط میں کثرت سے اہل قلم کی ادبی دل بستگی، مسائل، تخلیقی اسباب و محرکات اور ان کے وسیع تر تنقیدی رویے سے روشناسی ہوتی ہے۔ ان میں شعرا اور تخلیق کاروں کی شاعری اور ادب پاروں پر بے لاگ تبصرے اور مکتوب نگار کی قیمتی آرا سے آگاہی حاصل ہوتی ہیں۔ حالی کے خطوط میں شبلی کی طرح ادبی چاشنی نہیں ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں جو ادب کی جان کہے جا سکتے ہیں۔ عبدالرحمن شاطر کی شاعری پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کے اشعار میں یقیناً وہ چیز پاتا ہوں جو ترقی کر کے کمال شاعری کے درجے تک پہنچ سکتی ہے۔ بلا مبالغہ بلا تصنع آپ کے بعض شعروں کو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ کیوں یہ پیرایہ بیان ہمارے ہاتھ نہ لگا؟ علی الخصوص اس شعر کی تعریف مجھ سے نہیں ہو سکتی:

بے محل التفا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوا رائے ابلق لیل و نہار

یہی ایک شعر اعلیٰ درجے کی قابلیت شاعری پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہے۔"۶۹

لاہور میں نیچرل شاعری کے جو مشاعرے منعقد ہوئے اور جن میں حالی نے اپنی مشہور نظمیں 'حب وطن'، 'برکھا رت'، 'نشاط امید' اور 'مناظرہ رحم و انصاف' پیش کی تھیں، وہ حالی کے ادبی رجحانات کے نشو و نما میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک خط میں نظم اور نئی طرز شاعری پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہماری رائے میں نئی نظم کو ترقی دینے یا اس کی داد لینے کا مقام بجائے قومی جلسوں کے نئی طرز کے مشاعروں کو قرار دینا چاہیے۔ جن کا نمونہ ایک دفعہ پہلے لاہور میں قائم ہو چکا ہے۔ نئی طرز کے مشاعرے سے ہماری مراد یہ ہے کہ قدیم دستور کے موافق اس میں شعرا کو مصرع طرح نہ دیا جائے۔ بلکہ کسی مضمون کا عنوان بنا کر نظمیں کہلوائی جائیں۔ اور اس بات کا اختیار کہ وہ کس بحر یا کس صنف میں ترتیب دی جائیں خود شعرا کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے جا بجا مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے اور مضامین کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے حالانکہ نیچرل مضامین کا ایک وسیع اور ناپیدا کنار میدان موجود ہے جس میں ہمارے شعرا طبیعت کی جولانیاں اور فکری بلند پروازیاں دکھا سکتے ہیں۔"۷۰

حالی کے ذہنی نشو و نما میں لاہور میں انگریزی کی کتابوں کے اردو ترجموں پر نظر ثانی کا بہت اثر ہوا تھا۔ اسی طرح حالی کو مغربی طرز فکر اور ادبی روایات سے آگاہی ہوئی۔ ان کے ذہن رسا نے اس لٹریچر کی اہمیت کو سمجھا اور اپنے بہت سے نظریات میں اصلاح و ترمیم کی۔ حبیب الرحمن خاں شیروانی کی کتاب "علمائے سلف" پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئل نے سلف ہلپ (Samual Smiles' Self Help) کے لکھنے میں کیا تھا، جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں اس طرز کی نہیں لکھی گئی۔"۷۱

شبلی کے خطوط میں بھی متعدد ادبی نکات زیر بحث آئے ہیں شبلی کی کتاب "شعر العجم" اور براؤن کی "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" قریب قریب ایک ہی زمانے میں لکھی گئیں۔ اس لیے شبلی کو اس کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا مگر جب دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بلا تصنع اور مبالغہ کہتا ہوں براؤن کی کتاب دیکھ کر بڑا افسوس ہوا... فردوسی کی نسبت صرف تین صفحے لکھے ہیں جن میں اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مذاق اتنا کج ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ سعد مشفق کے برابر بھی نہیں جانتے اور فرماتے

ہیں کہ کسی حیثیت سے یہ کتاب شعرائے فارسی کے کلام کے برابر نہیں ہے۔“ ۲؎

دوسری جگہ نامور لوگوں کے مختصر حالات سے متعلق خط میں لکھتے ہیں:

”نامورانِ سلف کے مختصر حالات بھی اگر چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں شائع ہوں تو نہایت مفید ہے۔ میں نے ترکی میں اس قسم کا سلسلہ تصنیف دیکھا جس کا نام ”مشاہیر رجال“ ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کا ایک سلسلہ قائم ہونا چاہیے۔“ ۳؎

عطیہ فیضی سے زبان و بیان کے سلسلے میں جو غلطیاں سرزد ہوئی ان کی اصلاح شبلی خطوط کے ذریعے کرتے ہیں۔ کہیں محاورے کے غلط استعمال پر ٹوکتے ہیں تو کہیں زبان سے واقفیت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے عطیہ فیضی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”سب سے پہلا مرحلہ زبان کا ہے۔ یعنی زبان، محاورے اور روزمرہ سے مزا لینا اور لطف اٹھانا۔ اول تو زبان اور محاورے سے واقف ہونا چاہیے۔ پھر یہ کافی نہیں ہے بلکہ اس سے طبیعت کو لطف اٹھانا چاہیے شرط ہے۔“ ۴؎

محاورے کی غلطی پر عطیہ فیضی کو ٹوکتے ہوئے لکھتے ہیں:

”چٹکیوں میں اڑاتی ہیں، رکیک اور اوچھا محاورہ ہے اور جس موقع پر تم نے لکھا ہے اس کے لیے بالکل خلاف تہذیب ہے۔ یہ محاورہ سرے سے کبھی نہ لکھا کرو۔“ ۵؎

عطیہ فیضی کے نام لکھے خطوط میں قابلِ قدر بات یہ ہے کہ وہ ادبی نکات ہیں جو کہیں کہیں شبلی کے قلم سے نکل گئے ہیں۔ ان خطوط میں سب سے دلچسپ وہ تنقید ہے جو اپنے یا اپنے کلام کے متعلق نہایت بے تکلفی اور سچائی سے کر جاتے ہیں۔ اکثر اس بات کی دریافت کی تمنا رہتی ہے فلاں مصنف یا شاعر تصنیف کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے یا وہ اپنی کس کتاب یا نظم کو سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ لیکن شبلی کے یہاں معاملہ دوسرا تھا کیوں کہ خطوط کسی غیر کو نہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں۔ ایک خط میں شبلی عطیہ کو لکھتے ہیں:

”اچھا ہوا میں نے ان سطروں کے معنی تم سے دریافت کیے ورنہ ممکن تھا کہ میں پھر تمہارا نام اس طرح کسی موقع پر لاتا، اور تم کو رنج ہوتا۔ لیکن مجھ کو حیرت ہے کہ تم یہ کیونکر سمجھی ہو کہ وہ تمہارا نام ہے۔ عطیہ کے معنی داد و دہش اور انعام کے ہیں۔ اور اسی معنی میں یہ لفظ استعمال کرتا ہوں۔“ ۶؎

مولوی نذیر احمد کے خطوط کا دائرہ بہت وسیع تر نہیں ہے۔ ان کے خطوط تاریخ ادب میں نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ ان میں ہندی کی چاشنی، انگریزی کی راستی اور عربی کا جوشیلا پن ہے۔ اس طرزِ تحریر کے سہارے مولوی نذیر احمد کے ذوق اور رجحان کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اکلوتے بیٹے کے سامنے انھوں نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ فرزند کے نام لکھے خطوط میں علمی و ادبی بحثیں جا بجا موجود ہیں۔ ایک خط میں مولوی نذیر احمد ادب کی اہمیت سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

علم تو سب طرح کے ہوتے ہیں اور طالبِ علم کو لازم ہے کہ سب کی طرف برابر توجہ کرے۔ لیکن سب پر مقدم ادب ہے جس کو انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں۔ یعنی زبان دانی۔ کمال زبان دانی یہ ہے کہ تم کو اہل زبان کی سی قدرت حاصل ہو۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ زبان دانوں کی عبارتیں یاد ہوں جس طرح کے خیال اور مضمون کو جس پیرائے میں اہل زبان نے ادا کیا ہے، اس کی تقلید اور اس کی نقل کرنی چاہیے۔“ ۷؎

ایک خط میں عربی رسم الخط کی ’ۃ‘ کے قاعدے کو سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لاؤ اس مختصر اور گول ”ۃ“ کے قاعدے کو زیادہ صاف کر ڈالیں۔ واضح ہو کہ سوائے الفاظ عربی کے گول ’ۃ‘ لکھنی روا نہیں کیوں کہ یہ رسم الخط عربی کی ہے اور بس۔ عجمی الفاظ میں ہمیشہ لمبی ’ت‘ لکھنی ہوگی۔ جیسے بت، دست، آتش پرست، مست، دوالیہ، بت، صورت، مورت۔“ ۸؎

مولوی نذیر احمد اکثر خطوط میں قواعد لکھنا سکھاتے، زبان کی اصلاح کرتے اور ہر زبان کی صرف و نحو پڑھنے پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ ”موعظہ حسنہ“ کے ذریعے اپنے فرزند کی اصلاح و تربیت مقصود ہونے کے ساتھ لکھنے والے کی سیرت و خصائل اور شاعری و ادب سے لگاؤ اس پر

بحث و مباحث اور اصلاحات اور ان کے خیالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہم لوگ خیالی مضمونوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور آخر تک سوائے چکنی چپڑی باتیں بنانے اور جھوٹے بے اصل منصوبے باندھنے کے کچھ نہیں سیکھتے۔ جھوٹے القاب، جھوٹے آداب، جھوٹے اشتقاق، جھوٹے تشبیہات، جھوٹے استعارات ہمارا علم انشا ہے۔ شاعری جو کمال انشا ہے اس میں معشوق، وہ فرض کیے گئے ہیں جن کے کمر نہیں، منہ نہیں۔ جن کی زلفیں سلسلہ لا انتہائی سے زیادہ دراز۔ جن کے سر میں پہاڑ۔ اگر ایسے معشوق کہیں نظر پڑ جائیں تو لوگ ان کو ہوا اور جھوٹ سمجھیں گے۔ انگریزی شاعری کو دیکھو بالکل نیچر کے مطابق۔ مبالغے اور جھوٹ کا نام نہیں۔ جس چیز کے حالات سے کسی علم میں بحث کرتے ہیں۔ اس کو موضوع لہ کہتے ہیں۔ جیسے صرف ونحو کا موضوع لہ ہے کلمہ و کلام۔ طب کا بدن انسان، حساب کا عدد۔"۷۹

محمد حسین آزاد کے خطوط سے بڑی حد تک ان کے ادبی ذوق، مطالعہ کی جانب ان کی چابکدستی، محویت اور جھکاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی مشہور و معروف کتابوں کے وجود میں آنے کے محرکات تصنیف و تالیف کے دوران مشکلات و پریشانیوں کا ذکر صداقت کے ساتھ ملتا ہے۔ آب حیات، سخن دان فارس، دربار اکبری وغیرہ و تصانیف کا ذکر ان کے خطوط میں موجود ہے۔ مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی غزلوں اور قصیدوں کی ترتیب سے متعلق فکرمند نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"میں نے سخن دان فارس کو نظر ثانی کرنے کے بعد رکھ دیا ہے۔ چاہا کہ اب دربار اکبری کو سنبھالوں۔ مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی۔ کیوں کہ اشعار استاد مرحوم شیخ محمد ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں اور قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔"۸۰

امیر مینائی نے مرزا غالب کی طرح ادبی نکات مثلاً تذکیر و تانیث، املا جیسے مسائل کا حل

تلاش کیا ہے۔ یوں تو "امیر اللغات" کا تذکرہ مکاتیب میں کثرت سے ملتا ہے۔ لیکن دیگر تصانیف پر اظہار خیال ایک بیش قیمت ادبی سرمایہ ہے۔ ان سے ان کے ادبی مزاج اور علمی معیار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ زاہد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اگر کبھی کوئی شعر مشکوک اس رہ جائے تو اس کو لکھ بھیجا کیجیے۔ لفظ "ساکا" کی اصل ساگھا۔ معنی جنگ وجدل ہے۔ میر تقی مرحوم کے شعر میں بھی یہی معنی ہیں۔ قدما کے سوا متوسطین و متاخرین کے کلام میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔ "بھاکا" اصل میں "بھاشا" ہے اور ہندی میں "کھا" کا بولا جاتا ہے۔ اردو فصحا کی زبان پر بیشتر "بھاکا" اور کمتر "بھاشا" مستعمل ہے۔"۸۱

داغ دہلوی کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ بڑی تعداد میں داغ کے ایسے مکتوبات موجود ہیں جن میں انھوں نے شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں دی ہیں۔ ایک خط میں اصلاح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ مگر اس کا لحاظ رکھیے کہ شعر کے لیے محاورہ آ جائے۔ محاورے کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ مقتضیٔ بحر میں آ جائے تو نظم کر دیجیے ورنہ نہیں۔"۸۲

مہدی افادی کے خطوط کا بیشتر حصہ ان کے اعلیٰ ادبی مذاق، ناقدانہ شعور اور منطقیانہ ذہن کا غماز ہے۔ تنقید و تخلیق کا دلکش امتزاج اور ایک ادبی ذہن کی خوبصورت ترجمانی کا اسلوب ان کے مکتوبات میں محفوظ ہے۔ مہدی افادی کے خطوط پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے آل احمد سرور نے لکھا ہے:

"یہ سب ادبی خطوط ہیں۔ اکثر ادیبوں اور ادب کے جاننے والوں کے نام ہیں۔ ان کے جو دوست ہیں وہ بھی اس شراب کے مست معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں عوام کی دلچسپی کی چیزیں کم ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ نہیں

مگر زرا۔ جس چیز کو ڈرامائی کہا جاتا ہے، وہ ان کے یہاں مفقود ہے۔ یہ خطوط بے ساختہ اور بے تکلف ہیں، مہدی کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔"۸۳

اکبر الہ آبادی کے خطوط سے اس دور کی علمی و ادبی فضا کا اندازہ ہوتا ہے۔ معاصر رسائل و اخبارات اور مصنفین کے بیانات اس دور کے ادبی مباحث اور مذاکرے، محفلیں اور مشاعرے کس نہج کے ہوتے تھے، ان احوال کی تصویر کشی اکبر الہ آبادی کے خطوط میں ملتی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے "استانی" نام کا ایک پرچہ نکالا، اس کی قواعد کو درست کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی نے ایک پرچا اپنی بیوی کی ایڈیٹری میں نکالا ہے۔ "استانی" آج وہ میرے پاس آیا۔ کیا کہوں 'استانی' آئی ہے یا آیا ہے۔ استانی کی تانیث میں کیا شبہ ہے۔ لیکن خیال پرچے کا ہے جس پر دلالت مقصود ہے۔ اور بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک مستند شاعری جو رائے ہو جائے وہ سند ہے۔ ورنہ بقول شمس العلماء ذکاء اللہ مرحوم جس کو خدا ہی نے مذکر و مونث نہیں بنایا اس کو کون مذکر و مونث کر سکتا ہے۔"۸۴

پریم چند کے خطوط کے توسط سے ان کی بعض تصانیف کے پس پردہ ان عوامل و محرکات کو سمجھا جا سکتا ہے جس کے نتیجے میں وہ منظر عام پر آ گئیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے میں "سوز وطن" پر حکومت نے پابندی لگا دی تھی کیونکہ اس میں حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات کا شبہ کیا گیا تھا۔ پریم چند کے خطوط سے ان کے فنی نقطۂ نظر، شاعرانہ ذوق کے ساتھ ادبی و علمی افکار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے بدلتے ہوئے ادبی رجحانات اور طرزِ ادا کی تبدیلیوں کا بھی علم ہے۔ پریم چند کے خطوط میں ادبی خیالات جا بجا ملتے ہیں۔ امتیاز علی تاج کے نام ایک خط میں ان کے ڈرامہ "انار کلی" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے جتنی کشش انار کلی میں ہوئی وہ کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی۔ میں تو اسے انگریزی کے بہترین ڈراموں کے مقابل رکھنے کو تیار ہوں۔ "دورِ جدید" اس کے ایک ایک لفظ میں منقوش ہے۔ "پارسی" طرز کی زنجیروں سے آپ نے ڈرامہ کو یک لخت آزاد کر دیا۔ کہیں کہیں تو آپ نے نزاکت فہمی کا کمال کر دکھایا

ہے۔"۸۵

پریم چند کے خطوط میں ان کے اپنے ڈرامہ 'کربلا' سے متعلق بھی خاصا مواد ملتا ہے۔ ان کے ایک خط سے ان کے قصوں سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔ "نیرنگ خیال" کے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔"۸۶

علامہ اقبال کے خطوط میں ان کی ادبی سرگرمیوں کا بڑا حصہ موجود ہے۔ اقبال نے ہمیشہ اپنے رفقا کے مشوروں سے اور تنقیدوں سے فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ ان کے مداحوں کی فہرست لمبی ہے۔ جو برابر اپنے تاثرات سے ان کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیب الرحمن خاں شیروانی سے اقبال کے گہرے مراسم تھے اور ادبی اصلاح و مشورے کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔

ایک خط میں اپنی کسی نظم پر اعتراضات کو طباعت کی غلطی بتاتے ہوئے سید شوکت حسین کو لکھتے ہیں:

"اس پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں اس کی بنیاد طباعت کی غلطیاں ہیں۔ جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ بہرحال دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت ناقد نظم کی اصل خامیوں کو دیکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ شاعری محض محاورات اور اظہارِ بیان کی صحت سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے۔ میرے معیار تنقید نگاروں کے ادبی معیاروں سے مختلف ہیں۔ میرے کلام میں شاعری محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔"۸۷

سید سلیمان ندوی کو بھی اپنی شاعری کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر سے واقف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر میرا کبھی مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مد نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔''۵۸

سید یامین ہاشمی نے اقبالؒ کی خدمت میں ایک قطعہ بغرض اصلاح روانہ کیا۔ اقبال اس پر اصلاح اس طرح کرتے ہیں:

''زبان کے اعتبار سے آپ کے اشعار میں کسی قسم کے اصلاح کی گنجائش نہیں۔ خیالات بھی اچھے ہیں، ہاں تخیل کی کمی ہے اور اس کمی کو لفظی اصلاح پورا نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ترقی کریں گے۔ اس وقت عرب کے قدیم شعرا کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ میری نسبت جس حسن ظن کا اظہار آپ نے اپنے اشعار میں کیا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔''۵۹

ادبی فن پاروں کی تفہیم، اس کے وجود میں آنے کے اسباب و محرکات، پس منظر، ذوق، طبیعت، اور اس کی شان نزول کی تلاش و جستجو میں مکاتیب کا کارنامہ بے مثل ہے۔ بعض مکاتیب سے شعری مجموعوں کی تحصیلی مراحل طباعت اور اشاعت سے متعلق معلومات بھی فراہم ہوتی ہے۔ خطوط میں نظموں مثلاً ''گورستان شاہی'' جو بانگ درا میں شامل ہے، مثنوی ''اسرار بے خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کی تخلیق کے مختلف مراحل اور مشکلات کا ذکر ملتا ہے۔



حواشی

۱۔ غالب کے خطوط، مرتب خلیق انجم، ص۱۳۲، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

۲۔ رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے، نیر مسعود، ص۳۴۵

۳۔ انشائے سرور، خط نمبر ۱۹

۴۔ نصیر الدین ہاشمی، ماہنامہ آجکل، دہلی، ص۱۳، اپریل ۱۹۵۴ء

۵۔ خط بنام رشیدہ بیگم، بیگمات اودھ کے خطوط، ص۳۶

۶۔ غالب کے خطوط، مرتب خلیق انجم، ص۳۸۴

۷۔ خط بنام ہرگوپال تفتہ، غالب کے خطوط، ص۲۱۷

۸۔ خط بنام عبدالرزاق شاکر

۹۔ بحوالہ غالب کا تنقیدی شعور، ص۴۱

۱۰۔ ۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط، ص۱۷، تحقیق مخطوطات سلیم قریشی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۱۱۔ ایضاً، خط نمبر ۳۳، ص۱۱۵

۱۲۔ بحوالہ علی گڑھ تحریک: ایک سیاسی اور سماجی مطالعہ، مظہر حسن، ص۲۵۳، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء

۱۳۔ مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق احمد، ص۲۰۶-۲۰۵

۱۴۔ خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، ص۲۱۲

۱۵۔ مکاتیب مولانا مظہر الحق، ص۴۲

۱۶۔ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، رفیق ذکریا، ص۳۳-۳۲

۱۷۔ مکاتیب سرسید احمد خاں، ص۵۳

۱۸۔ خطوط سرسید احمد خاں، ص۸۵

۱۹۔ خط بنام عمادالملک

۲۰۔ مکاتیب مولانا مظہر الحق، ص۹۱

۲۱۔ مواعظ حسنہ، ص۱۹۳

۲۲۔ اردو مکتوباتی ادب کا ادبی و تاریخی ارتقا، خواجہ احمد فاروقی، ص۳۷۵، غیر مطبوعہ

۲۳۔ بحوالہ علی گڑھ تحریک سیاسی و سماجی مطالعہ، مظہر حسین، ص ۲۷۸

۲۴۔ مکاتیب، ص ۳۵

۲۵۔ خطوط وقار الملک، مشتاق احمد، سر سید ہاؤس میرٹھ، ص ۱۷۹

۲۶۔ بحوالہ خطوط وقار الملک، مشتاق احمد، ص ۱۷۹

۲۷۔ مکاتیب، ص ۳۹-۳۸

۲۸۔ دیہی پولیٹیکل ایسوسی ایشن ابتدا جو لکھنؤ میں قائم ہوئی تھی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ کو ڈھاکہ میں مسلم لیگ قرار پائی۔

۲۹۔ مکاتیب، ص ۱۲۳

۳۰۔ بحوالہ خطوط وقار الملک، ص ۱۲۹

۳۱-۳۲۔ کارخانوں کے مالک

۳۳۔ خطوط وقار الملک، ص ۱۲۸-۱۲۷

۳۴۔ اقبال اور سیاست ملی، رئیس احمد ندوی، ص ۱۲۷-۱۲۸

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۳۹-۱۳۱

۳۶۔ مکتوبات عبدالحق، جلیل قدوائی، ص ۳۰۹، خط بنام داؤد رہبر

۳۷۔ ایضاً ایضاً، ص ۴۸۰

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۸۳-۲۸۲

۳۹۔ ایضاً، ص ۳۳۵

۴۰۔ خطوط سر سید، مرتب راس مسعود، ص ۹۶

۴۱۔ مکاتیب سر سید احمد خاں، ص ۲۹۸

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۷۱

۴۳۔ پریم چند کے خطوط، مدن گوپال، ص ۳۶

۴۴۔ مکاتیب شبلی

۴۵۔ غبار خاطر، ص ۱۹

۴۶۔ ۲۹ اگست ۱۹۲۰ء، بنام خواجہ حسن نظامی

۴۷۔ قلم کا مزدور، پریم چند، ص ۱۱۷

۴۸۔ پریم چند قمر رئیس، ص ۳۱

۴۹۔ پریم چند کے خطوط، مدن گوپال، ص ۱۸۳

۵۰۔ قلم کا مزدور، پریم چند، ص ۱۱۶

۵۱۔ پریم چند کے خطوط، مرتب مدن گوپال، ص ۳۳۳

۵۲۔ ایضاً، ص ۲۹۹

۵۳۔ مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، ص ۳، غیر مطبوعہ

۵۴۔ نقوش مکاتیب، ص ۳

۵۵۔ مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، خواجہ احمد فاروقی، ص ۴۳، غیر مطبوعہ، دہلی یونیورسٹی

۵۶۔ خط بنام یوسف علی خاں عزیز

۵۷۔ خط بنام منشی میاں داد خاں سیاح

۵۸۔ اسرار غالب، مرتب: سید قدرت نقوی، ص ۱۰۰، اشاعت اول ۱۹۹۶ء

۵۹۔ غالب کے خطوط، جلد چہارم، ص ۳۳۲

۶۰۔ خط بنام قدر بلگرامی

۶۱۔ ادبی خطوط غالب، مرتب: مرزا محمد حسن عسکری، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ص ۶۳، ۱۹۶۷ء

۶۲۔ خط بنام ہرگوپال تفتہ

۶۳۔ خط بنام مولوی عبدالرزاق شاکر، غالب کے خطوط، جلد دوم، ص ۸۳۶-۸۳۵

۶۴۔ مضامین تہذیب الاخلاق، ص ۲۴۷

۶۵۔ خطوط سر سید، ص ۱۲۵

۶۶۔ ایضاً، ص ۴۳

٦٧۔ مکاتیب حالی، ص ٩٥

٦٨۔ ایضاً، ٩٣

٦٩۔ ایضاً، ٥٠

٧٠۔ مکتوبات حالی، جلد ا، ص ٧

٧١۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، ص ٩٢

٧٢۔ مولانا شبلی: ایک مطالعہ، ص ١٠٩

٧٣۔ خطوط شبلی، مرتب: امین زبیری مارہروی، ص ٢٢

٧٤۔ ایضاً، ص ٢٧

٧٥۔ خطوط شبلی، ص ٤٧

٧٦۔ مواعظ حسنہ، ص ١٣

٧٧۔ ایضاً، ص ٥٥

٧٨۔ ایضاً، ص ١٠٢-١٠٣

٧٩۔ مکاتیب آزاد، یکم ستمبر ١٨٨٨ء

٨٠۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ٢٠٨

٨١۔ خط بنام عاشق، ٣٠ رجولائی ١٩٠٣ء، از الہ آباد

٨٢۔ تنقیدی اشارے، ص ١٥٠-١٣٩

٨٣۔ خط بنام عزیز لکھنوی، ٥ ر نومبر ١٩١٩ء، از الہ آباد

٨٤۔ پریم چند کے خطوط، ص ٢٣٦-٢٣٥

٨٥۔ ایضاً، خط بنام ایڈیٹر "نیرنگ خیال"

٨٦۔ خطوط اقبال، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، ص ١٣٣، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ١٩٧٦ء

٨٧۔ مطالعہ مکاتیب اقبال، ص ٢٦٠

٨٨۔ خطوط اقبال، ص ١٦٩

٨٩۔ حرف شیریں، مرتبہ رام لعل، لکھنؤ، ص ٢١، ١٩٩٠ء



ماحصل

خط نگاری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ خط نگاری اردو نثر کی تاریخ میں ایک صنف ادب کی حیثیت سے مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ یہ دوسری اصناف کے مقابلے میں اپنی ایک فنی اور تہذیبی شناخت بھی رکھتی ہے۔ خط عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سطر یا تحریر کے ہیں۔ دو اشخاص کے درمیان باہمی گفتگو ایک سماجی ضرورت ہے اور جب یہ عمل روبرو ممکن نہ ہو تو ہم اپنے خیالات کا اظہار لکھ کر کرتے ہیں۔ یہ تحریر خط کہلاتی ہے۔

اس میں مکتوب نگار اپنے جذبات و خیالات اور حالات و واقعات قلم بند کر کے مکتوب الیہ کو بھیجتا ہے۔ ادب میں ایک صنف کی حیثیت سے مکتوب نگاری کے کچھ حدود و معیار متعین ہیں جو اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں اس کے تحت جب یہ صنف اپنے خاص انداز اور رنگ و روپ میں بدل کر خط کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو ادب کے زمرے میں آ جاتی ہے۔ مکتوب نگاری کے مفہوم کی وضاحت اور امتیازی خصوصیات کی نشاندہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں وہ تمام موضوعات و مسائل سموئے جا سکتے ہیں جن کا تعلق تہذیب کے مختلف مراحل، عصری حسیت اور نجی جذبات و کیفیات اور ذاتی تاثرات سے ہوتا ہے اور انھیں موضوعات کو فکر و فن کے سانچے میں ڈھالنے کا نام ادب ہے۔ داخلیت، بے لاگ تنقید، اصلاح سخن جیسے مضامین کے علاوہ سادگی، لطافت، دلچسپ انداز بیان، ایجاز و اختصار، جزئیات نگاری، بے تکلفی وغیرہ اچھے خطوط کی خصوصیات ہیں۔ خطوط دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں کیونکہ ان میں رازداری ہوتی ہے اور آدمی فطرتاً راز جاننے کا اشتیاق رکھتا ہے۔ خط کی صنف فنی جکڑ بندیوں سے بہت حد تک آزاد ہے لیکن ادبی خطوط اپنی داخلی کیفیات اور خصوصیات کے لحاظ سے دیگر اصناف سے مختلف اور ممتاز ہیں۔

انسان کی تخلیقی صلاحیتوں میں سب سے زیادہ اہم صلاحیت خط کی ایجاد ہے۔ لیکن خط نگاری کا رواج دنیا میں کب سے ہوا اور کس زبان میں ہوا، اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حروف و خطوط کی ایجاد کا مقصد اولین انسان کے خیالات کو دوسرے انسان تک پہنچانا تھا۔ خط نگاری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی فن تحریر۔ کاغذ کی ایجاد سے پہلے انسان درختوں کے پتوں، چھالوں اور دھات کی پلیٹوں پر خط لکھتا تھا۔ اس طرح خط نگاری کا رواج قدیم عہد سے چلا آرہا ہے۔

خطوط کی اہمیت دوسرے تخلیقی کارناموں سے کم نہیں ہے جس طرح ادب کی دوسری اصناف کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جاتا ہے اسی طرح خطوط بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ خط نگاری مہذب سماج کا اہم فن ہے۔ اس فن سے نہ صرف انس و محبت برقرار رہتی ہے بلکہ دور رہ کر بھی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر شخص کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے خطوط نہایت عمدہ اور کارگر وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔ خطوط میں تاریخی مواد بھی موجود ہوتا ہے۔

اردو نثر کے ارتقا کا جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ابتدا سے ہی مکتوبات اپنی مختلف ہیئتوں اور اسالیب کے ساتھ سامنے آتے رہے ہیں۔ خط نگاری میں عصری تقاضوں کے زیر اثر جو اسلوبیاتی تبدیلیاں ہوئیں ان کے بیشتر نمونے انیسویں صدی کے خطوط میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں ایک طرف سیاسی و سماجی حالات کا نتیجہ تھیں تو دوسری طرف اظہار کے سلسلے میں نئے انداز فکر کی ترجمان بھی تھیں۔ اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں مرزا محمد قتیل کے خط ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ غلام غوث بے خبر کے خطوط کو مکتوب نگاری کے ارتقا میں فورٹ ولیم کالج اور مرزا غالب کے درمیان کی کڑی کہا جاسکتا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کے خطوط ایک طرف اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف ان کی تحریروں کا اسلوب خود لکھنوی تہذیب کے مزاج کا مظہر ہے۔ غلام امام شہید اور واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط اردو خطوط نگاری کے ارتقا میں مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ غالب کی مکتوب نگاری کو ایک خاص ادبی رتبہ حاصل ہوا ہے اور اس کے بعد کے زمانے میں خط نگاری عموماً ان کی روش کی تقلید کرتی نظر آتی ہے۔

اردو کے اولین دور کے مکتوبات میں تکلفات اور تصنع و آرائش کی جملہ خوبیاں موجود ہیں۔

بے ساختگی کی جگہ تکلفات اور تخیل پسندی اور سادگی کی جگہ پرکاری اور قدامت پسندانہ طرز ادا کو فوقیت دی جاتی تھی۔ غالب نے اردو خطوط کو ان تکلفات سے آزاد کیا۔

اردو خط نگاری میں ایک زمانے تک غالب کو ہی پہلا مکتوب نگار تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن مختلف مکاتیب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ حسام الملک، طپش دہلوی، راسخ عظیم آبادی، راجہ رام موہن رائے، گارساں دتاسی اور افتخار علی شہرت کے دستیاب شدہ خطوط غالب سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ خطوط کے تحقیقی مطالعے سے یہ بات سند کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو کا قدیم ترین خط ۱۸۰۳ء کا ہے جو "واقعات اظفری" میں موجود ہے۔

سر سید احمد خاں کا عہد اپنا ایک مخصوص اور منفرد مزاج اور طرز رکھتا ہے۔ اس لیے دور سر سید سے اردو کی دیگر اصناف کی طرح اردو مکتوباتی ادب میں بھی نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ سر سید اور ان کے معاصرین و رفقاء کے خطوط میں اپنے عہد کے احوال نیز شخصیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس دور کے مکتوب نگاروں کے خطوط اس خاص طرز کی ترجمانی کرتے ہیں جہاں تاریخ، سوانح نگاری، تحقیق و تنقید، ناول و افسانہ، طنز و مزاح اور انشائیے اور مضامین نے نثر کو نئی جہت اور وسعت عطا کی اور وہ اس لائق ہوئی کہ تمدنی، مذہبی، سائنسی، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ مضامین و موضوعات کو پیش کرسکے۔ اس دور کا اہم رجحان عقلیت پسندی ہے جس نے ذہنوں کو سوچنے کے نئے زاویے عطا کیے۔ اکثر خطوط خاص مقصد کے تحت باہمی خیالات و جذبات کو پیش کرنے کے لیے لکھے گئے۔ اس طرح ایک خاص دور کی تہذیب سماجی صورت حال اور تحریک کے نشیب و فراز کا وافر سرمایہ سامنے آیا، جن سے مختلف افراد کے نقطۂ نظر، تاریخی حالات اور تحریکوں کے اثرات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اس دور کے خطوط سیاسی، سماجی اور معاشرتی احوال اور اسلوب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں لیکن لکھنے والوں کی ذات معاشرتی ماحول اور ذاتی حالات ان میں ایک انفرادیت بھی پیدا کرتے ہیں۔ سر سید کے خطوط کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خود ان کے نزدیک خط نگاری کی کیا امتیازی خصوصیات ہیں اور خط کس انداز سے لکھنا چاہیے۔ محسن الملک اور وقار الملک کے خطوط میں مدرستہ العلوم علی گڑھ اور حیدرآباد کے حالات اور دونوں کے ذاتی تعلقات اور خانگی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے خطوط کے

سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں صرف نصیحت درج ہے۔ لیکن نذیر احمد کے خطوط گوناگوں پہلوؤں کے حامل ہیں۔ اسی طرح محمد حسین آزاد کی نثر بھی بڑی خوبصورت اور شعریت سے بھرپور ہے۔ شبلی نعمانی کے خطوط کے اسلوب کی نمایاں صفت عبارتوں کا اتار چڑھاؤ ہے جس کی اہم وجہ شبلی نعمانی کے مزاج کی رومانیت اور دوسرا انداز جو ایک خطیب کے بجائے ایک شاعر کا نرم نازک لب ولہجہ ہے۔ حالی کے خطوط میں سیدھے سچے انسان کی حیات کا عکس نظر آتا ہے۔ جہاں نہ طبیعت کی نمائش ہے نہ انداز بیان کا جادو جگانے کی خواہش جو بات کہی گئی ہے نہایت سادگی کے ساتھ ہے۔

سرسید اور ان کے رفقاء کے خطوط کے علاوہ دیگر مشاہیر ادب کے خطوط اردو مکتوب نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اردو میں رومانی تحریک سرسید کی مقصدیت اور حقیقت پسندانہ نظر کے خلاف ایک طرح کا ردعمل تھا۔ اس تحریک کے اثرات کم وبیش اس دور کے بہت سے ادیبوں نے قبول کیے۔ اس دور کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ بیسویں صدی بڑی تبدیلیوں کی صدی رہی ہے۔ اس دور کے مکتوب نگاروں نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اثرات کو محسوس کیا اور انھیں اپنے فکر وخیال کے اظہار کا وسیلہ بنا کر اپنے خطوط میں بڑی حد تک بے لاگ انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال، مولوی عبدالحق، ابوالکلام آزاد، اکبر الہ آبادی، امیر مینائی، داغ دہلوی، مہدی افادی، پریم چند، نیاز فتح پوری وغیرہ کے خطوط میں زبان وادب کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نامور ہستیوں کے مکاتیب ان کے مذاق، مزاج، رجحان، ادبی کارناموں اور عملی سرگرمیوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل کرنے کا سب سے مستند اور کارآمد ذریعہ ہوتے ہیں۔

خطوط کی تاریخی وادبی اہمیت سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ خطوں کے ادبی مباحث اور اصلاحات سے عہد بہ عہد زبان وادب میں ہوئی تبدیلیوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ خطوط میں ادبی مسائل کا ذکر، فنکاروں کے شخصی نظریات وافکار کی جھلک نظر آتی ہے۔ خطوط کے وسیلے سے ہی فنکار کی تخلیقات وتصنیفات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے خطوط کو ادبی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ خطوط کے ذریعہ اس دور کے سیاسی سماجی، معاشی مذہبی اور دیگر تمام حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے مکاتیب کو تاریخ کا ایک اہم جز قرار دیا جاتا ہے۔

زمانہ قدیم سے ہی مشاہیر واکابر کے ملفوظات ومکتوبات جمع کرنے کا رواج رہا ہے۔ اسی ذیل میں بادشاہوں کے فرامین بھی آتے ہیں۔ ان سے اکثر اہم تاریخی واقعات اور خط نگار کے نجی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ دور حاضر میں بھی اردو خطوط نگاری کا کام بہت تیزی سے انجام پا رہا ہے۔ لہٰذا آئے دن مختلف خطوط کے مجموعے منظر عام پر آ کر اپنی قدر وقیمت کا اعتراف کرا رہے ہیں۔ لیکن دور حاضر کی ٹکنالوجی نے خطا نویسی کو بہت حد تک متاثر کیا ہے۔ ٹیلی فون، موبائل اور انٹرنیٹ کے عام ہو جانے کی وجہ سے خط لکھنے خاص طور سے ذاتی نوعیت کے خط لکھنے کا رواج کم ہو گیا ہے بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں ای میل، ایس ایم ایس، وغیرہ چھوٹے اور مختصر مگر ترقی یافتہ خطوط ہیں۔ لیکن جہاں تک اردو خطوط کی بات ہے، اردو مکتوباتی ادب کی تاریخ میں ان کی اہمیت کسی طرح کم نہیں بلکہ خطوط دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے خطا نویسی مستقل فن بن گیا ہے۔

چھٹی عالمی ڈاک ٹکٹ کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل نے کہا کہ باہمی رابطے کے جدید ترین وسائل کے فروغ کے سبب لوگوں کو آپس میں رابطہ کرنے میں آسانی ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود لوگوں کو خط لکھنے کی عادت نہیں چھوڑنی چاہیے۔



کتابیات

۱۔ عودِ ہندی، ممتاز علی خاں، مطبع مجتبائی میرٹھ، ۱۸۶۸ء
۲۔ زیرِ لب، صفیہ اختر، صفیہ اکیڈمی، حیدرآباد، ۱۹۵۴ء
۳۔ حرفِ آشنا، صفیہ اختر، علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ، بمبئی، ۱۹۵۸ء
۴۔ بیگماتِ اودھ کے خطوط، انتظام اللہ شہابی، فاروقی پریس لکھنؤ، ۱۹۶۴ء
۵۔ مکاتیبِ سرسید احمد خاں، مشتاق حسین، یونین پرنٹنگ پریس دہلی (اول) ۱۹۶۰ء
۶۔ انشائے سرور، مرزا احمد علی، پانچواں ایڈیشن لکھنؤ، جون ۱۹۱۶ء
۷۔ غبارِ خاطر، ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۶۷ء
۸۔ اردوئے معلیٰ، سید مرتضیٰ حسین فاضل، مجلس ترقی ادب لاہور، پاکستان، ۱۹۶۸ء
۹۔ مکاتیبِ مہدی، مہدی بیگم، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۲ء
۱۰۔ خاموش آواز، جاں نثار اختر، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۶۰ء
۱۱۔ انشائے داغ، مرتبہ احسن مارہروی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۴۱ء
۱۲۔ زبانِ داغ، مرتبہ رفیق مارہروی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۵۶ء
۱۳۔ مکتوباتِ شاد عظیم آبادی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء
۱۴۔ مکتوباتِ سرسید، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور، ۱۹۵۹ء
۱۵۔ خطوطِ سرسید، سید راس مسعود، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۳ء
۱۶۔ پریم چند کے خطوط، مدن گوپال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جون ۱۹۶۸ء
۱۷۔ مکتوباتِ حالی، حصہ اول، مرتبہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء
۱۸۔ مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، مرتبہ سجاد حسین، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء
۱۹۔ مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، مرتبہ سجاد حسین، ادبی پریس، کراچی، ۱۹۵۰ء
۲۰۔ سرسید کے خطوط، مرتبہ وحید الدین سلیم پانی پتی، پانی پت، حالی پریس، ب۔ت

۲۱۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۸ء
۲۲۔ خطوطِ ابوالکلام آزاد، مالک رام، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۱۹۹۱ء
۲۳۔ مکتوباتِ اقبال، ثاقب تبسم، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۳ء
۲۴۔ مکاتیبِ مرزا مظہر جانِ جاناں، ڈاکٹر محمد عمر رضا، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
۲۵۔ رشید احمد صدیقی کے خطوط، آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۶ء
۲۶۔ سردار جعفری کے خطوط، خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
۲۷۔ وقارِ حیات، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۲۵ء
۲۸۔ تذکرۂ وقار الملک، بھوپال، ۱۹۲۵ء
۲۹۔ تذکرۂ وقار، ۱۹۳۶ء
۳۰۔ جگر کے خطوط، محمد اسلام، نقائی پریس لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۵ء
۳۱۔ مکاتیبِ امیر مینائی، احسن اللہ خاں ثاقب، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، جون ۱۹۶۴ء
۳۲۔ خطوطِ وقار الملک، مشتاق احمد، سرسید ہاؤس میرٹھ، جنوری ۱۹۶۷ء
۳۳۔ انشائے بے خبر، غلام غوث بے خبر، ادبی دنیا، مارگی روڈ علی گڑھ، ۱۹۶۰ء
۳۴۔ فغانِ بے خبر، مطبع ناصری پریس الٰہ آباد، ۱۸۹۱ء
۳۵۔ موعظہ حسنہ، مرتبہ سید عبدالغفور، جی اینڈ سنز برقی پریس دہلی، ۱۹۱۹ء
۳۶۔ خطوطِ شبلی، مرتبہ محمد امین زبیری، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، ۱۹۲۹ء
۳۷۔ مکاتیبِ محسن الملک و وقار الملک، مرتب: محمد امین زبیری، ۱۹۱۸ء
۳۸۔ مکتوباتِ آزاد، آغا محمد طاہر، گیلانی پریس لاہور، ۱۹۴۳ء
۳۹۔ تذکرۂ نواب محسن الملک مرحوم، مرتبہ محمد امین زبیری، شمسی پریس، آگرہ، ۱۹۳۰ء
۴۰۔ پریم چند کے خطوط (بار اول)، مرتبہ مدن گوپال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
۴۱۔ تنقیدیں، خورشید الاسلام، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۵۷ء
۴۲۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، ڈاکٹر صدیقی، ایاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد، اپریل ۱۹۷۶ء
۴۳۔ شبلی، ظفر احمد صدیقی، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۱۹۸۸ء
۴۴۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان، نور الحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۸ء
۴۵۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات، خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء
۴۶۔ مکتوباتِ عبدالحق، جلیل قدوائی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۳ء
۴۷۔ اردو نثر، پروفیسر ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۱ء

۴۸۔ محمد حسین آزاد، جہاں بانو بیگم، مکتبہ ابراہیمیہ پریس، حیدرآباد، ۱۹۴۰ء
۴۹۔ اردو نثر کا ارتقا، عابدہ بیگم، ثمر آفسیٹ پریس، دریا گنج نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
۵۰۔ نذیر احمد: شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، اشاعت اول، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
۵۱۔ پریم چند فن اور تعمیر فن، جعفر رضا، تاج آفسیٹ پریس، الٰہ آباد، طبع دوم، ۱۹۸۰ء
۵۲۔ تحریک علی گڑھ اور حیدرآباد دکن، محمد حسام الدین خاں غوری، ادارہ ادب، پاکستان، ۱۰ر جنوری ۱۹۷۹ء
۵۳۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۱ء
۵۴۔ خطوط مشاہیر، مرتب نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵ء
۵۵۔ اطراف غالب، ڈاکٹر سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
۵۶۔ مطالعہ داغ، سید محمد علی زیدی، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۴ء
۵۷۔ داغ دہلوی: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر کامل قریشی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۶ء
۵۸۔ مسلمانوں کے سیاسی افکار، پروفیسر رشید احمد، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۲ کلب روڈ، لاہور، مئی ۱۹۳۲ء
۵۹۔ پریم چند، پرکاش چندر گپت، مترجم بل احمد اکبرآبادی، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، س۔ن
۶۰۔ سرسید کی تعلیمی تحریک، اختر الواسع، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۲۰۰۳ء
۶۱۔ سرسید اور جدت پسندی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، احمد برادرس، پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی، ۲۰۰۲ء
۶۲۔ سرسید معاشی افکار اور ترقیاتی منصوبے، پروفیسر شاہ محمد وسیم، ۳۔بی، ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۲ء
۶۳۔ سرسید کا اصلاحی مشن، ڈاکٹر توقیر فلاحی، اردو پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۹۸ء
۶۴۔ رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے، نیر مسعود، اسرار کریمی پریس، جالسین گنج الٰہ آباد، ۱۹۶۷ء
۶۵۔ علی گڑھ تحریک سیاسی اور سماجی مطالعہ، منظر حسین، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۳ء
۶۶۔ حالی کا سیاسی شعور، جذبی، احباب پبلشرز لکھنؤ، ستمبر ۱۹۵۹ء
۶۷۔ غالب کے خطوط، مرتب خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء
۶۸۔ مہدی افادی، ڈاکٹر فیروز احمد، آفسیٹ پریس گورکھپور، ۱۹۸۵ء
۶۹۔ ۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط، سید عاشور کاظمی، سلیم قریشی، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
۷۰۔ خطوط اقبال، بنام عطیہ فیضی، مترجم: ڈاکٹر مظفر عباس نقوی، سلسلہ مطبوعہ شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
۷۱۔ وقار حیات۔ محمد حبیب الرحمن شروانی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۲۵ء

رسائل و جرائد

۱۔ نیا دور، عبدالماجد دریابادی نمبر، ۱۹۷۸ء
۲۔ اردو ادب، ماہ ستمبر ۱۹۵۶ء
۳۔ نگار، داغ نمبر، ۱۹۵۳ء
۴۔ نقوش لاہور، مکاتیب نمبر، ۱۹۵۷ء
۵۔ سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ، جنوری تا ستمبر ۱۹۸۵ء
۶۔ سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ، ۲۔۳ سوانح علی گڑھ، ۱۹۸۶ء
۷۔ فکر و نظر، شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء
۸۔ ادبی دنیا، ۱۹۵۵ء
۹۔ آجکل، اپریل ۱۹۵۳ء
۱۰۔ العلم کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء
۱۱۔ جمیلہ دہلی، سرسید نمبر، ۱۹۶۸ء
۱۲۔ رسالہ جامعہ، جون ۱۹۶۸ء
۱۳۔ ماہ نو لاہور، ۱۹۵۵ء
۱۴۔ ماہ نو لاہور، ۱۹۵۶ء
۱۵۔ زبان و ادب، جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء
۱۶۔ تہذیب الاخلاق ۱۹۸۴ء
۱۷۔ ماہ نو کراچی، ۵۸۔۱۹۵۷ء
۱۸۔ ہندوستانی زبان، ۱۹۸۰ء
۱۹۔ تہذیب الاخلاق، جنوری ۱۹۹۰ء
۲۰۔ رسالہ جامعہ، جولائی تا ستمبر، سرسید نمبر ۱۹۹۸ء
۲۱۔ ماہنامہ انشاء، نیاز فتح پوری نمبر، دسمبر ۱۹۹۶ء
۲۲۔ ماہنامہ فروغ اردو، حالی نمبر لکھنؤ، جون ۱۹۵۹ء
۲۳۔ رسالہ نقوش، مکاتیب نمبر، ۱۹۵۷ء
۲۳۔ رسالہ نقوش، خطوط نمبر، لاہور
۲۴۔ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ۱۹۵۰ء
۲۵۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جون ۱۹۶۷ء

☆☆☆

رسائل و جرائد

۱۔ نیا دور، عبدالماجد دریابادی نمبر، ۱۹۷۸ء
۲۔ اردو ادب، ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء
۳۔ نگار، تاریخ نمبر ۱۹۵۳ء
۴۔ نقوش لاہور، مکاتیب نمبر ۱۹۵۲ء
۵۔ سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ، جنوری تا ستمبر ۱۹۸۵ء
۶۔ سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ، ناموران علی گڑھ، ۱۹۸۶ء
۷۔ فکر و نظر، شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء
۸۔ ادبی دنیا، ۱۹۵۵ء
۹۔ آجکل، اپریل ۱۹۵۴ء
۱۰۔ العلم کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء
۱۱۔ جمیلہ دہلی، سرسید نمبر، ۱۹۶۸ء
۱۲۔ رسالہ جامعہ، جون ۱۹۶۸ء
۱۳۔ ماہِ نو، لاہور، ۱۹۵۵ء
۱۴۔ ماہِ نو، لاہور، ۱۹۵۶ء
۱۵۔ زبان و ادب، جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء
۱۶۔ تہذیب الاخلاق ۱۹۸۴ء
۱۷۔ ماہِ نو، کراچی، ۵۸-۱۹۵۷ء
۱۸۔ ہندوستانی زبان، ۱۹۸۰ء
۱۹۔ تہذیب الاخلاق، جنوری ۱۹۹۰ء
۲۰۔ رسالہ جامعہ، جولائی تا ستمبر، سرسید نمبر، ۱۹۹۸ء
۲۱۔ ماہنامہ انشاء، نیاز فتح پوری نمبر، دسمبر ۱۹۹۶ء
۲۲۔ ماہنامہ فروغ اردو، حالی نمبر، لکھنؤ، جون ۱۹۵۹ء
۲۳۔ رسالہ نقوش، مکاتیب نمبر، ۱۹۵۷ء
۲۴۔ رسالہ نقوش، خطوط نمبر، لاہور
۲۴۔ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ۱۹۵۰ء
۲۵۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جون ۱۹۶۷ء

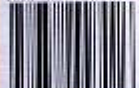
☆☆☆

میں نے یہ مقالہ بہت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہر چند کہ اس کے عنوان "عہد سرسید میں اردو مکتوب نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" سے گمان گزرا کہ تحقیق کا دائرہ محدود ہوگا لیکن مقالہ مکمل پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا اردو میں مکتوب نگاری کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک کے مکتوب نگاروں کے ادبی خطوط کے بارے میں مقالہ نگار نے خاطر خواہ تحقیق کی ہے اور نہ صرف تقریباً تمام اہم مکتوب نگاروں کے مکاتیب کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ان کے اسلوب اور امتیازات کا تجزیہ کیا ہے بلکہ سلیقے کے ساتھ مدلل تنقیدی انداز میں قلم بند کیا ہے۔ اردو کے پہلے مکتوب نگار اور خط کے بارے میں خاص دقت نظری سے کام لیا گیا ہے۔ میں اس تحقیقی کام کے معیار سے مطمئن ہوں۔

بے شک امیدوار نے تحقیقی اصولوں کے مطابق اور تنقیدی بصیرت سے کام لے کر اپنے مقالے میں نہ صرف کچھ نئے حقائق کا انکشاف کیا ہے بلکہ بعض مکتوب نویسوں کے بارے میں نئی جہات اور تازہ گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

(رپورٹ سے اقتباس)

پروفیسر مظفر حنفی


ISBN 93-82997-01-6